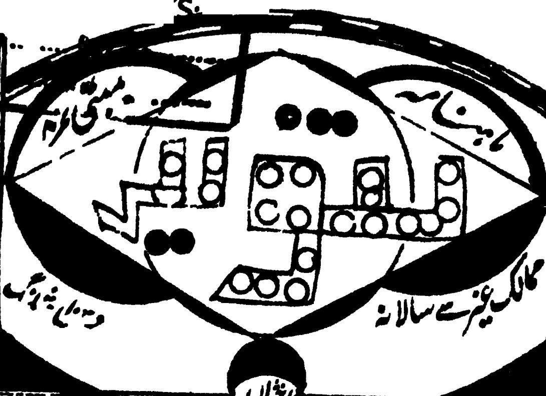

تنویر
"TANVIR"
MONTHLY

NASEEM.



Second Nepolean who takes much interest in Horse and Gun



تنویر ہر انگریزی مہینے کی ۷ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
نائب مدیرہ: انورنی خانم

سالانہ ۳ روپے
ششماہی ۱/۸
فی پرچہ ۴ آنے
مقامی قیمت ۳ آنے
مدیرہ: سحر

جلد ۲	فہرست مضامین ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ عیسوی	شمارہ ۱۰

سحر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی سے چھپوا کر دفتر تنویر کھتر دھانگلی اسٹریٹ بمبئی ۸ سے شائع کیا





تنویر کی پالیسی:۔ "تنویر" ہندوستان کا پہلا زنانہ رسالہ ہے جو آزادیٔ فکر اور انقلاب کا زبردست حامی ہے۔ جس کا منشا صرف یہ ہے حصول طاقت اور اس کا صحیح استعمال ـ یعنی اپنی قوتوں کو انسانوں کی فلاح و بہبود اور انسانیت کی تعمیر میں صرف کرو۔ اور وہ خرابیاں جو انسانیت کو کھوکھلا کئے دیتی ہیں۔ انھیں بیخ و بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دو۔ ایسی زندگی حاصل کرو کہ جس کے سامنے موت کے بھی چھکے چھوٹ جائیں اور وہ تمہاری زندگی پر حسد طاری کر سکے۔ اسی کا نام ایمان۔ اسلام دیا۔ دھرم ـ نیکی اور اخلاق ہے۔ صحافت کو بیاک چشم و ابرو کے اشارے پر ہوا کا رُخ دیکھ کر نہیں چلنا چاہئے بلکہ اپنے اصولوں اور عقیدہ میں مستقل اور اٹل رہنا چاہئے ـــ صحافت میں وہ قوت ہونا چاہئے کہ ہوا کے رُخ کو موڑ دے زمانہ کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھ میں رکھے۔ اگر کوئی رسالہ یا اخبار اپنے فرض کی ادائیگی میں فنا بھی ہو جاتا ہے تو اُس کی کامیابی ہے۔ یہ موت نہیں بلکہ زندگی ہے۔ ــــ "تنویر" اپنی رائے اور پالیسی پر مضبوطی سے قائم ہے۔ جس کی آواز سے اُن ظالموں کے خودساختہ مذاہب بدل گئے۔ انسانیت کو رسم و رواج کے قوانین میں جکڑ گئے ہیں۔ ان پر بنیاد شرافت پر ضرب پڑی۔ یا غلامی کی نعمت چھڑانے لگا اور ـــ کی بنیادوں کی نمائش ہے اور اس سے کسی کو برا ماننے کی ضرورت نہیں لیکن ـــ ان چند انسانی بھائیوں کو اس سے بہت تکلیف پہنچی جو ـــ ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کی زندگی حرکت اور رتبہ کا انحصار ہے ہمیں اُن سے دلی ہمدردی ہے۔ کیونکہ وہ اس وقت بیمار ہیں۔

ہمارا فرض ہے اور انسانی ہمدردی کا تقاضا کہ ہم ان کا علاج کریں اور عارضی تکلیف دیکر انھیں موت کے منہ سے بچالیں جب یہ طبقہ اس خطرناک اور مسموم حالت سے باہر ہو جائیگا تب یہی لوگ ہماری سچی ہمدردی اور خدمات کے قائل ہو جائیں گے۔ ابھی تو غنودگی کے عالم میں ہیں اور وہی چیز مانگ رہے ہیں جو ان کے لئے مضر و ہلاکت ہے سمجھانے اور نہ دینے سے ہمیں برا بھلا کہتے ہیں۔

ہمارے چند خیر خواہوں نے ہم سے یہ بھی دریافت کیا ہے کہ تنویر کا رجحان کانگریس کی طرف زیادہ کیوں ہے اور کانگریس اور مسلم لیگ کے جھگڑوں سے اسے بالکل علیحدہ کیوں نہ رکھا جائے جواباً عرض ہے کہ ہمیں کانگریس نے کچھ دیا ہے نہ مسلم لیگ نے ہمارا کچھ بگاڑا ہے۔ ہم آزادیٔ وطن کے طلبگار ہیں۔ غلامی کی ایک ایک سانس لینا ہمیں حرام معلوم ہوتا ہے اور غلامی کی ایک ایک سانس کو ہم لاکھ لاکھ گناہوں سے زیادہ برا سمجھتے ہیں۔ کانگریس کا نصب العین بھی آزادی ہے اور اس طرح ہمارا اُس کا نصب العین بنیادی طور پر ایک ہو جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم سو فیصدی کانگریس سے متفق ہیں۔ رہی مسلم لیگ تو اس کی اس پستی کا ساتھ ہم دینا گوارا ہی کبھی نہیں کر سکتے۔ کہ اُس نے اپنا وجود غیر ملکی حکومت کے مقابلے میں قائم نہیں کیا۔ بلکہ اپنے ہی جیسے غلام ہموطنوں کے مقابلے میں سد آرا ہو کر غلامی کی مدت میں اضافہ کرتی ہے اور آزادی سے ہمیں ہمیشہ دور رکھنا چاہتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ تنویر کو خالص ادبی پرچہ ہونا چاہئے۔ تو اسکا جواب یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بہت سے پرچے ایسے ہیں جو اس ضرورت کو پورا کر رہے ہیں۔ عورتوں کے لئے خانہ داری۔ بچوں کا پالنا مردوں کی خدمت کرنا سب کچھ کام چلانے کے لائق آ گیا ہے۔ اس میں بھی زمانہ کا ہے تو اس کا بنیادی سبب بھی ذہنی غلامی ہے۔ جو کہ ذہن کی چار دیواری میں بند کی تعمیر نہیں ہو سکتی ـــ اس لئے ہمیں سب سے پہلے کام "حصول آزادی" پر سب کی توجہ دلانا ہے۔ دوسروں کی بنائی ہوئی پگڈنڈیوں پر خود کی بے عالم میں آنکھیں بند کر کے ہم چلنا نہیں چاہتے۔ تنویر کہتا ہے۔ غور و فکر کے اپنی منزل مقصود کو متعین کرو اور خاردار جھاڑیوں میں سے گذرنا سیکھو ـــ تنویر کے انقلابی افسانے خیالی نہیں ہیں بلکہ ہمارے یہاں کی معاشرت کا سچا آئینہ ہیں ـــ افسانوں میں حقیقت کو بیان نہ کرنے سے سوسائٹی کی بگڑی ہوئی صورت اور سڑی ہوئی اندرونی تہ میں اصلاح نہیں ہو جائیگی ـــ یہ تو چہرے کے دھبے چھوڑ کر آئینہ کو دھونے کے مصداق بات ہوئی ـــ ہمیں تو سوسائٹی کے جُدائی بدن کے وہ تمام زخم کھول

کھوال کر دکھانا ہیں جن کے چھپے رہنے سے زہر اندر ہی اندر پھیلتا ہے۔ ظاہر کر دینے کے بعد اُن کا علاج ممکن ہو۔ اب ہا تنویر کی پالیسی کی وجہ سے اس کی زندگی و موت کا سوال، ہمیں کامل یقین ہے کہ ہم سچائی پر ہیں اس لئے ہم اپنا راستہ نہیں بدل سکتے ہم "خود اختیاری موت" کو اُس زندگی سے لاکھ درجے اچھا سمجھتے ہیں جو آج ہندوستانی صحافت اور صحافیوں کے علاوہ سب ہندوستانیوں کے سر پر مسلط ہے اور جس کی زندگی اور بقا کی بھیک مسٹر جناح غلام اہل وطن اور غیر ملکی ناجائز تصرف کرنیوالی حکومت سے مانگ رہے ہیں۔ اور نہیں ملتی ——— ایسی "مردہ زندگی" سے ہم اپنے اصول پر مرمٹنے کو بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں ——— جو ہندوستان کے غلامانہ ذہنیت رکھنے والے نامرد مُرتے ہمیں عطا کریں۔

زیکوسلوویکیا۔ بالآخر Utilitarianism

کی تھیوری پر قربان کر دیا گیا۔ اسے قربان کر کے دنیا کے امن و امان کو قائم رکھنے والوں کو بہت داد مل رہی ہے ——— مگر اس "امن" کی حقیقت کوئی زیکوسلوویکیا والوں کے دل سے پوچھے! ہم ہندوستانی ان کی اس مصیبت کا احساس بخوبی کر سکتے ہیں اور اُن کے دُکھ میں دل سے شریک ہیں ——— جس طرح یورپین مدبرین نے جرمن زیک "جیقلش" کا اس نظریہ کے تحت فیصلہ کیا ہے کہ تھوڑے سے انسانوں کے حقوق بہت سے انسانوں کے لئے قربان کر دیے جائیں" ——— یا ایک چھوٹی سی آزاد ریاست کی خاطر دنیا کے امن و امان کو خطرے میں نہیں ڈالا جا سکتا" اسی طرح ہندوستان کی ۲۸ کروڑ کی اکثریت کے جائز مفاد کی خاطر کیوں نہ کسی غیر ملکی برسر اقتدار اقلیت کو یہی نظریہ سمجھایا جائے اور اس پر عمل کرنے کو مجبور کر دیا جائے!

مہاتما گاندھی جی

کو اپنی سترویں سالگرہ مبارک ہو۔ ہماری دعا ہے کہ اس برگزیدہ ہستی کا سایہ ہندوستانیوں کے سر پر ہمیشہ قائم رہے اور وہ ہندوستان آزاد دیکھیں۔ اُنھوں نے گھٹا ٹوپ غلامی کی فضا میں ہمیں آزادی کا پیغام سنایا۔ اس مبارک دن پر ہم مہاتما جی کی خدمت میں اپنی طرف سے ایک مشورہ ہدیتاً پیش کرتے ہیں ——— وہ یہ کہ اب جنگجو قوموں مثلاً اٹلی۔ جرمن۔ جاپان میں جا کر اپنے "عدم تشدد" کے عقیدے کی نشر و اشاعت کرنا چاہئے۔ ہماری خواہش ہے کہ مہاتما جی ایک "امن کانفرنس" منعقد کریں جسمیں ہٹلر اور مسولینی کو خاص طور پر مدعو کیا جائے۔ ممکن ہے "عدم تشدد" کا مسئلہ اُن کی سمجھ میں آ جائے۔ یہ عقیدہ ایسے لوگوں کے لئے ہی زیادہ مناسب ہے۔ ہندوستانی بے چارے تو پہلے ہی ضرورت سے زیادہ امن پسند ہیں جنھوں نے اپنے بچاؤ کی خاطر بھی کبھی تشدد کو استعمال نہیں کیا۔

لندن

کی ایک خبر ہے کہ وہاں پر افلاس و تنگدستی کی وجہ سے ماں باپ نے اپنے سات سال لڑکے کو ایک پونڈ میں فروخت کر دیا۔ انگلستان تقریباً ڈیڑھ سو سال سے ہندوستان پر قابض ہے اور یہاں کی دولت سمیٹ سمیٹ کر ولایت کو بھیجا رہا ہے کوئی ہفتہ خالی نہیں جاتا کہ منوں ٹنوں انگلستان کو نہ جائے ہر طرح کی خام اشیا اور کھانے پینے کی چیزیں بھی یہاں کے باشندوں کے منہ سے چھین کر وہاں بافراط بھیجی جاتی ہیں۔ حیرت ہے کہ پھر بھی وہاں کی یہ حالت! صرف ۴ کروڑ کی آبادی کا بھی انتظام گورنمنٹ سے نہیں ہو سکتا ہم ماہرین اقتصادیات اور برطانوی مدبرین سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ تمھارے نظام سلطنت میں کہاں پر ایسا سقم Defect ہے کہ اس قدر دولت ہونے کے باوجود انسانوں کی یہ بُری حالت ہے۔ کیا برطانیہ کی ضروریات پورا کرنے کیلئے کئی ایک اور ہندوستان کی ضرورت ہے؟ یا اس غلط نظام حکومت کو بدلنا چاہئے!

یورپ میں جنگ کا خطرہ

کون کہہ سکتا ہے کہ زیکوسلوویکیا کی قربانی سے ٹل گیا۔ نازی حکومتوں کی ہوس ملک گیری کا جبتک منہ توڑ جواب دیا جائیگا۔ اور انکے حملوں کو پست نہ کیا جائیگا! اسوقت تک خطرہ بدستور باقی ہے۔ ہٹلر و مسولینی نت نئے بہانے کر کر کے اپنی سلطنت کا رقبہ بڑھاتے جائینگے۔ آزاد لوگوں کے گلوں میں حلقۂ غلامی پہنائے جائینگے۔ ہندوستان خود آزادی کی شاہراہ پر گامزن ہو اسکی خواہش ہے کہ دوسرے بھی آزاد رہیں اور جو غلام ہیں وہ آزاد ہو جائیں۔ مگر اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ یورپ میں جنگ چھڑے اور برطانیہ کو اپنے بچاؤ کی خاطر جنگ میں شامل ہونا پڑے تو جنگ عظیم کی طرح ۸۰ فیصدی تو ہندوستانی اُسکی بھینٹ چڑھ جائیں اور صرف ۲۰ فیصدی انگریز جنگ میں ہوں۔ ہندوستانی خود جنگ آزادی میں مصروف ہیں انکا پہلا کام اپنے وطن کا حق ادا کرنا ہے۔ اس وقت برطانیہ صرف ہندوستان کے معاملے میں ہندوستانیوں سے مدد کی توقع کر سکتا ہے۔ اور اسکے لئے اُسے پہلے اپنے قلب ماہیت کا ثبوت دینا چاہئے۔ فوجی بھرتی کا بل پاس کر کے نہیں۔ بلکہ فوجی تعلیم کو عام اور لازمی قرار دیکر ہی گورنمنٹ ہم سے بحیثیت دوست فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ ورنہ نہتے ہندوستانیوں سے عین وقت پر کس طرح

"تیج" ویکلی دہلی

یہ ہفتہ وار اردو اخبار دہلی سے نکلتا ہے۔ مسٹر دھرمپال گپتا وفا اس کے ایڈیٹر ہیں۔ جو اردو ادب اور شاعری کا بہت اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ خاص کر آپ کی غزلیں انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

اردو جرنلزم کے لئے مایۂ ناز اخبار روزانہ تیج دہلی جسے اپنی خوبیوں اور تازہ بتازہ ملکی و غیر ملکی خبریں دینے کے لحاظ سے اردو کا ٹائمز آف انڈیا کہنا چاہئے گزشتہ ۱۶ سال سے پبلک کی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اور جسے ہر اردو جاننے والا بلا تفریق مذہب و ملت شوق سے پڑھتا ہے۔

اسی کے "ویکلی" نے بھی بہترین "ریڈنگ میٹر" دینے کے لحاظ سے ہندوستان بھر کے ہفتہ وار اخبارات میں اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔

اب "تیج ویکلی" نے ترقی کی طرف ایک نیا قدم بڑھایا ہے جس کے لئے ہم معاصر موصوف کو مبارکباد دیتے ہیں۔

اس میں مضامین کے ساتھ ہی ساتھ رنگین تصاویر بھی شائع ہوتی ہیں اور اس طرح اس کے یہ صفحات دو رنگ کی چھپائی اور تصاویر سے بہت دیدہ زیب و دلفریب معلوم ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ حالات حاضرہ پر باقاعدہ ایک مستقل عنوان کے زیر تحت اعلیٰ پایہ کے سیاست دانوں سے مضامین حاصل کر کے دیئے جایا کریں گے۔

اس کے افسانے جادو اثر اور مفید ہوتے ہیں۔ نظمیں اور غزلیں اعلیٰ ادبی معیار رکھتی ہیں علمی مضامین اور شذرات معلومات کا ذخیرہ ہوتے ہیں۔

اخلاقی اور اصلاحی مضامین قابل تعریف ہوتے ہیں۔ بچوں کا صفحہ بچوں کے لئے بہت دلچسپی رکھتا ہے۔ ۶ صفحے آرٹ پیپر پر ممبران قوم کی تصاویر کے علاوہ اور تصویریں بھی ہوتی ہیں۔ غرضیکہ ۲ر آنے میں اس سے بہتر پرازمعلومات ہفتہ وار اخبار نہیں مل سکتا۔

ملنے کا پتہ:۔ "تیج ویکلی" دہلی

دسہرہ:۔ ہندوستانیوں کا مشہور مذہبی تہوار ہے اسی دن شورما کشتری اپنے اپنے ہتھیاروں کو نکال کر صاف کیا کرتے تھے اور جلا دیتے تھے۔ ہندوستانی ریاستوں میں ابھی تک ایسا ہی کرتے ہیں۔ ریاستی فوج کی اور ہتھیاروں کی نمائش کی جاتی ہے مگر مفکر انسان آج کے دن سوچتا ہے کہ ہتھیار تو چھن چکے۔ اب دسہرہ کیسے منایا جائے!

خریداران تنویر سے

بحمدللہ "تنویر" اب دوسرے سال میں قدم رکھ چکا ہے۔ اور پہلے سال کے خریداروں کا چندہ اکتوبر ۱۹۳۶ء تک ختم ہو چکا۔

لہٰذا تنویر کے مہربان خریداروں سے استدعا ہے کہ ازراہ کرم اپنا اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر مرحمت فرما کر شکر گزار فرمائیں۔ ورنہ نومبر کا پرچہ اُن کی خدمت میں بذریعہ وی پی ارسال ہوگا۔ جسے وصول کرنا اُن کا اخلاقی فرض ہوگا۔ اگر کسی وجہ سے مزید خریداری منظور نہ ہو۔ تو ایک کارڈ کے ذریعے دفتر کو مطلع فرمائیے۔

منیجر "تنویر" ٹھکر ڈسا کی اسٹریٹ بمبئی ۳

عطیۂ خاص



برائے تنویر

از حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی

لو آگئیں وہ دعوتِ ایماں لئے ہوئے
شانوں پہ زلفِ کفر پریشاں لئے ہوئے

رفتار شاخِ گل کا مٹاتی ہوئی غرور
گفتار نغمہ ہائے بہاراں لئے ہوئے

آنکھیں فروغِ جلوۂ رنگیں سے گل فروش
باہیں جمالِ خنجرِ عریاں لئے ہوئے

تارِ نظر میں روشنئ صبحِ زندگی
موجِ نفس میں چشمۂ حیواں لئے ہوئے

بکھرائے مصحفِ رخِ رنگیں پہ کاکلیں
کافر گھٹا کی چھاؤں میں قرآں لئے ہوئے

ہر اک قدم پہ گوئے دو عالم سے کھیلتی
گردن کے لوچ میں خمِ چوگاں لئے ہوئے

بادِ شمال و ابرِ خراماں و موجِ گل
ہر آب و رنگِ عالمِ امکاں لئے ہوئے

رک جائے جس کو دیکھ کے طغیانیوں کی سانس
آنکھوں میں وہ شباب کا طوفاں لئے ہوئے

دستِ حنا نواز میں باوصفِ نازکی
عشقِ زمانہ سوز کا داماں لئے ہوئے

رُخسار میں جلائے ہوئے شمعِ اختلاط
آنکھوں میں التفاتِ فراواں لئے ہوئے

شیریں لبوں میں حرف و حکایت کے ولولے
چشمِ سیہ میں دید کا ارماں لئے ہوئے

چہرے پہ صبحِ عشق و جوانی کی سُرخیاں
آنکھوں میں شامِ خوابِ پریشاں لئے ہوئے

جادُو بھری نگاہ میں اک داستانِ غم
غم کی جِلو میں شکوۂ دَوراں لئے ہوئے

آنکھوں میں عزمِ جامہ دری دل میں خوفِ خلق
پلکوں میں پارہ پارہ گریباں لئے ہوئے

ژولیدگی کاکلِ عنبر سرشت میں
شرحِ درازیٔ شبِ ہجراں لئے ہوئے

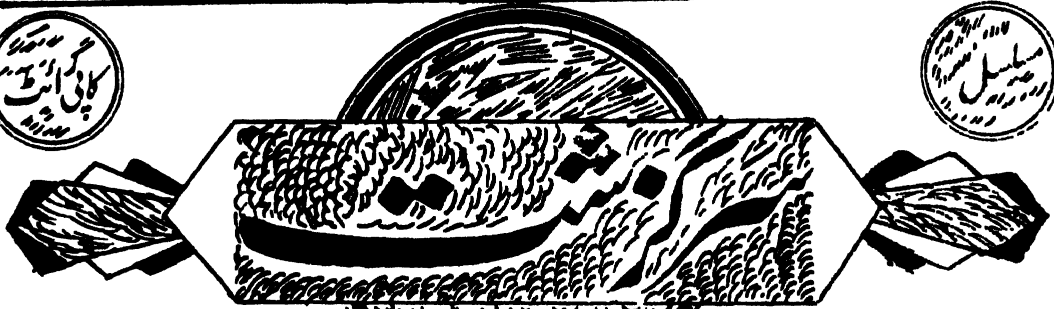
لہجے میں چوٹ کھائے ہوئے دل کی کروٹیں
آواز میں خراشِ رگِ جاں لئے ہوئے

خود دوش پر اُٹھائے ہوئے کائنات درد
ہر درد کائنات کا درماں لئے ہوئے

نازِ جمالِ یار سے صرفِ غمِ نیاز
اُٹھ جوشؔ! اُٹھ! متاعِ دل و جاں لئے ہوئے

تحریر منوّر رخشاں







وطن جانے کا مژدہ ہمارے لئے زندگی کا پیغام تھا - دو تین ہی دن میں ہماری تمام بیماریاں جاتی رہیں - خوشی اور تازگی ہمارے چہروں پر دمکنے لگی - مگر بھورے جل جل کر خاک ہوا جاتا تھا - ہم سب ریل میں سوار ہو گئے - بھورے مردانے میں بیٹھا ——— یعنی مشیر یں درماہ عالم زنانے ڈبے میں بیٹھے اب مجھے ہوش آیا کہ لاؤ کنگھی تو کر لوں - چونکہ بھورے کے یہاں جب سے میں آئی تھی بے دلی کے مارے کنگھی نہیں کی تھی - صرف سرد ہو کر بالوں کو یوں ہی لپیٹ لیا کرتی تھی - ہسپتال میں جب نرس کنگھی کرنے لگتی ——— تو چونکہ بال بہت اُلجھے ہوئے اور بہت بڑے تھے - اس لئے بہت دُکھتے اور میں اُس سے کہتی لاؤ میں خود کر لوں گی - - - چنانچہ میں سامنے سامنے سے کنگھی کر کے جوڑا باندھ لیا کرتی - - - یہ بیدلی اور بے پروائی مردہ دلی اور جان سے بیزاری کا زندہ ثبوت تھا ——— ورنہ یہی میں تھی کہ کنوار پنے میں دن میں چار چار مرتبہ کنگھی کیا کرتی تھی - میرے سر کی صفائی اور سجاوٹ لوگوں کے لئے قابل رشک نشان تھی - مگر اب تو اگر میرا بس چلتا تو سر پر اُسترا ہی پھروانے کو طیار تھی کہ کسی طرح بھورے مجھ سے نفرت کرنے لگے" ——— علاوہ ازیں اب مجھے اپنے جسم سے اس قدر نفرت تھی کہ میرا بس چلتا تو چکی میں پیس کر آگ میں جلا کر اُس کے آخری ذروں کو بھی تہس نہس کر ڈالتی - میں اس وجود کو معدوم کر دینا چاہتی تھی جسے بھورے کے ہاتھ لگ چکے ہوں "

لیکن آخر کمسنی کا زمانہ تھا - ذرا سی خوشی اور حالات کی تبدیلی تھوڑی دیر کے لئے اُن قیامتوں کی یاد کو ذہن سے محو کر دیتی جو مجھ پر بیت چکی تھیں ——— میں کنگھی کرنے لگی - بال اس قدر اُلجھے ہوئے تھے کہ آج تک میں اس درد و تکلیف کو نہ بھلا سکی اور اسی وجہ سے اس معمولی سے واقعے کو قلمبند کرنا پڑا - دل بہت خوش تھا مگر درد کی وجہ سے آنسو نکلے جاتے تھے - اور میں کنگھی کرتی جاتی تھی - ہمسفر عورتیں بہت متعجب تھیں اُس دن دو تہائی بال سر سے اُتر گئے ——— اور صرف ایک تہائی بال باقی بچے ———



ہم وطن پہنچے - جاتے ہی سب سے دل کھول کر ملی - قمر اُدھر کو گلے لگایا - مگر اپنی جان سے زیادہ عزیز بہن زریں سے دانستہ مُنہ پھلائے رہی - اُس سے میں سخت ناراض تھی اس بات پر کہ "وہ شادی کرنے پر رضامند کیوں ہو گئی ؟" جب کہ وہ میری شادی کا نتیجہ دیکھ رہی تھی -

سب سے ملنے جلنے کے بعد جب رات کے ا بجے اور میں پلنگ پر جا کر لیٹ رہی تو زریں ہچکیاں لیتی ہوئی آئی اور میرے پائنتی بیٹھ گئی ———

میرا دل بھی تڑپنے لگا - دل چاہتا تھا کہ اُسے گود میں لے کر خوب چوموں اور گلے سے لگا لوں مگر میں ضبط کئے بے نیازی

دکھلانے کے لیے چُپ چاپ پڑی رہی۔ زرّیں نے میرے پاؤں کو اپنی گود میں لے لیا۔ مگر میں نے اپنا پاؤں کھینچ لیا۔ اس پر زرّیں نے روتے ہوئے کہا آپا! میرا اس میں کیا قصور ہے۔ تم نے جو شادی کی اتنی شدید مخالفت کی اُس کا کیا نتیجہ نکلا؟ لڑکیوں کی بات کوئی سُنتا بھی ہے؟ تمھیں کیا معلوم کہ سال بھر سے میں کس طرح شادی کے خلاف والد اور سب کو مختلف طریقوں سے آگاہ کرتی رہی ہوں۔ مگر کوئی مانے بھی! جب اُنھوں نے تم جیسی زبردست طبیعت رکھنے والی لڑکی کا ہی یہ حشر کر ڈالا تو بھلا میں کس شمار قطار میں ہوں — مگر آپا! میں مایوس اور نا اُمید نہیں ہوں۔"

میں جھٹ اُٹھ بیٹھی — اور حیرت سے پوچھا "اس کا مطلب؟"

"تم نا اُمید نہیں ہو اس کے معنی" میں نے اُسے جھنجھوڑ کر بے صبری سے پوچھا۔

زرّیں میری طرف کھسک آئی اور آہستہ آہستہ کہنے لگی۔

"پیاری آپا! تمھیں کیا خبر — جب تم روتی ہوئی اور ہم سب پر ایک بے بسی کی نظر ڈالتی ہوئی .. آباد سے سدھاریں تم جیسی بہادر ہستی کو ہم اس بے کسی اور بے چارگی کی حالت میں دیکھ کر تلملا اُٹھے۔ ہمارے دل پر چھُریاں سی چل گئیں۔ رات بھر میں اور قمر اس پر سوچتے رہے کہ کیوں کر تمھیں اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ ہم نے سوچا کہ پیاری امّاں تو مر ہی گئیں — نانا نانی کا کچھ [illegible] اباجان ابا بھورے کے طرفدار ہیں۔ اور اب تو انھوں نے [illegible] کر کے ہم سے اپنے آپ کو نصف چھین لیا ہے۔ ایک [illegible] سوتیلی ماں کو حصہ دار بنا دیا ہے۔ اب ہمارا کون [illegible] رہا؟ بس ہم پانچ بہن بھائی ہی ہیں۔ جو ایک دوسرے کے [illegible] ہیں۔ تم سب سے بڑی ہو اور سب کا سہارا ہو مگر ایسے عذاب میں مبتلا ہو کہ خدا کی پناہ

اُسی دن ہم نے یہ طے کر لیا کہ اس خاندان، گھر، اور عزیزوں پر لعنت بھیجیں۔ اور گھر سے نکل بھاگیں — ہم نے سوچا کہ ہم سب مل کر ٹرکی چلے جائیں۔ یاد ہے نا؟ تم "انقلاب ٹرکی" انور پاشا کمال پاشا خالدہ ادیب خانم کے حالات ہمیں سنایا کرتی تھیں۔ لہٰذا ہمارے خیالات کی مطابقت کچھ اسی زندہ قوم سے پائی جاتی تھی۔ اور وہی ایک ایسی جگہ اور ایسی سوسائٹی ہے جہاں ہم کھپ سکتے ہیں۔ اس لئے اب ہمیں کسی نہ کسی طرح ٹرکی پہنچنا چاہئے۔ وہاں ہم فوج میں بھرتی ہو جائیں گے۔ اور اپنی زندگی کو ٹرکی کی خدمت کے لئے وقف کر دیں گے۔ اور بہادری و مردانگی ایثار و قربانی کے کارناموں سے اپنی تاریک زندگی کو جگمگا دیں گے۔ چونکہ ہم اپنی ہستی کے مقصد کو اتنا پست و محدود نہیں بنا سکتے کہ شادیاں کر کے مرد کی خدمت میں اور غلام نسل کی افزائش کر کے مادر وطن کی مقدس سرزمین کے لئے ... بار بنیں۔

اس کے لئے میں نے اور قمر نے یہ سوچا کہ گھر سے بھاگنے کے لئے یہ کرنا چاہئے کہ یہ جو ہمارے مکان کے پچھواڑے تانگے والوں کے گھوڑوں کا اصطبل ہے۔ اس میں سے دو عمدہ گھوڑوں کا انتخاب کر لینا چاہئے۔ چنانچہ ہم نے اپنی دانست میں دو گھوڑے جو سب سے زیادہ اور بڑے طاقتور اور خوبصورت دکھائی دیتے تھے منتخب کر لئے اور آٹھ دن پہلے سے ہی اپنے حصہ کا ناشتہ پراٹھے وغیرہ قمر چھپا کر لے جاتا اور ان گھوڑوں کو کھلا آتا اور جو جیب خرچ ملتا اُسے بھی ہم اُن گھوڑوں پر صرف کرتے بازار سے جلیبیاں منگوا کر انھیں کھلاتے تاکہ وہ ہم سے مانوس ہو جائیں اور ہمارے ساتھ سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کو تیار ہو جائیں نہ معلوم ان بے زبانوں پر کیا اُفتاد پڑے!

اب ہم اس انتظار میں تھے کہ والد صاحب — شکار یا دورے پر جائیں تو ہم آدھی رات کو ان ہی گھوڑوں پر بیٹھ کر

فرار ہو جائیں - پھر کو بھی ہم ساتھ لے جانا چاہتے تھے - مگر حیران تھے کہ اسے گھوڑے پر کیسے سنبھال سکیں گے - قمر چونکہ سواری بخوبی جانتا تھا کہنے لگا کہ اسے میں اپنے پاس بٹھالوں گا - مگر میں اس سے مطمئن نہ تھی - میں نے کہا کہ نا بھیا! میں تبت کی عورتوں کی طرح اسے اپنی پیٹھ سے باندھ لوں گی ـــ روپے ہمارے پاس تھوڑے سے ہی تھے - ہم بہت حیران تھے کہ قسطنطنیہ کا سفر کیسے ہو سکے گا اس کے لئے ہم نے والد کے دواخانے میں سے عمدہ عمدہ اور وہ دوائیں جن کے متعلق کسی سنائی طور پر ہمیں یقین تھا کہ بہت قیمتی ہیں تھا کر ایک بیگ میں بند کرلیں کہ روپیہ کی ضرورت پڑنے پر ان کو فروخت کر کر کے کام چلائیں گے - آخر وہ دن آ ہی گیا والد... شکار پر چلے گئے ـــ اسی دن رات کے بارہ بجے جب سب گھر والے سو گئے - ہم نے سفری کپڑے پہنے میری گود میں پھر تھا - جو بے خبر سو رہا تھا - قمر کے ہاتھ میں دواؤں کا بیگ تھا ہم دونوں اوپر کی منزل سے اتر کر نیچے آئے - دروازہ کھول کر نکلنا ہی چاہتے تھے کہ والد کی آواز گویا بجلی بن کر ہم پر گری ـــ

دروازے کو کھٹکھٹاتے ہوئے انھوں نے کہا "فقیر! دروازہ کھولو" ہمارے اوسان خطا ہو گئے - خلاف توقع آج والد جلد ہی لوٹ آئے تھے - بیگ دواخانے میں رکھ کر ہم اوپر بھاگے اور آتے ہی رضائیاں اوڑھ کر اپنے اپنے بستروں میں دبک گئے اتنے میں فقیر جاگ اٹھا تھا اس نے دروازہ کھول دیا تھا والد صاحب آئے اور اپنے سونے کے کمرے میں چلے گئے -

گھنٹے بھر بعد ہماری نبض کی رفتار اعتدال پر آئی - ہم آہستہ سے اٹھے، کپڑے بدلے اور چپ چاپ سو گئے -

صبح جو والد صاحب نے اپنی دواؤں کی شیشیاں گڑبڑ دیکھیں اور بیگ میں بھری ہوئی پائیں تو بہت حیرت زدہ ہوئے ـــ نوکروں پر ڈانٹ پڑنے لگی کہ یہ کس نے کیا اور کون لئے جاتا تھا - ہم سے نہ رہا گیا ہم نے کہا کہ کل ہم کھیل رہے تھے - قمر ڈاکٹر بنا تھا اور میں مریض - اس پر ہمیں خوب ڈانٹ پڑی کہ اب کھیل اس حد تک بڑھا کہ دوائیوں اور دواخانے کی ضروری چیزوں سے کھیلا جانے لگا ہے - قمر کو اس پر خوب مار پڑی - اور مجھے بھی سزا دی گئی مگر والد متعجب بہت تھے کہ اس سے پہلے تو ہم نے کبھی ایسی ناسمجھی کی حرکت نہیں کی تھی - جبکہ در اصل بچے تھے - اب جبکہ میری عمر ۱۳ سال اور قمر کی ۱۱ سال ہو چکی تھی ایسی بے وقوفی کی حرکت کیسے کی؟

غرضکہ آزادی کا یہ کھیل یوں ناکام رہ گیا ـــ پھر ہماری ہمت نہ ہوئی - اب تم آ گئی ہو... ہم سب ملکر اسی قسم کی کوئی تدبیر سوچنا چاہئے - تاکہ تم بھی بھورے سے نجات پا جاؤ اور میری بھی شادی ہونے کی نوبت ہی نہ آنے پائے"

میں زرّیں کی یہ تمام باتیں سن کر حیران رہ گئی - میں نے اس سے کہا اچھا اب سو رہو - پھر اس پر غور کریں گے ـــ



قصبہ کے نامور اور متموّل زمیندار اور علم دوست رئیس کے لڑکے کے ساتھ زرّیں کی منگنی ہو چکی تھی - لڑکا ان دنوں علیگڈھ یونیورسٹی میں سکنڈ ایر میں پڑھ رہا تھا - برادری میں ان لوگوں کی بہت بڑی پوزیشن تھی - اس سے ہماری سوتیلی ماں کو بہت پرخاش تھی - وہ نہیں چاہتی تھیں کہ لڑکی اچھے گھر بیاہ کر جائے - انھوں نے دادی کو بلایا - اور طے یہ کیا کہ ان بچوں کے والد تو پردیس میں ہیں - زرّیں کی شادی بھورے کے چھوٹے بھائی ننھے سے کر دی جائے آخر بڑے گھرانے میں لڑکی کو بیاہنے میں کتنا زیادہ خرچ ہوگا ـــ

اور جو بڑی بہن کی طرح اِس نے بھی پرائے گھر جاکر یہی حرکتیں کیں تو بدنامی الگ ہوگی ۔ اور پھر ننھے جیسے لڑکے کو ایسی خوبصورت لڑکی بھی نہیں مل سکے گی ۔ لاؤ ایک روز قاضی کو بلاکر چُپ چُپاتے دو بول نکاح پڑھادیں ۔ پھر کیا ہوسکتا ہے ۔ اِن کا باپ ناراض ہوگا ۔ بلا سے ۔ ہمارا مطلب تو پورا ہوجائیگا برادری میں ہم یہ مشہور کردیں گے کہ پردیس کی لڑکیاں ہیں مُنہ پھٹ ــــ لڑکی نے خود کہا تھا کہ میں تو ننھے کے ساتھ ہی شادی کروں گی ــ اس لئے ہم نے کردی ـ مثل مشہور ہے کہ جس کی زبان چلے اُس کے دو ہل چلیں" ہم زبان کے زور سے سب نبٹ لیں گے ــــ بس اب دیر نہ کرنا چاہئے

یہ لوگ اپنی اس سازش میں مصروف تھے ۔ مگر یہ بھنک ہمارے کان میں بھی پڑگئی ۔ اسی اثناء میں ننھے کو بھی خط لکھ کر کانپور سے بلالیا گیا ۔ اب تو ہمیں پختہ یقین ہوگیا ــــــــ کہ یہ زرّیں کی شادی ضرور اس ننھے سے ہی کردیں گی ــ ہم لوگ شادی کے پہلے ہی سے مخالف تھے ۔ مگر اس خیال سے ذرا تسلّی تھی کہ لڑکا تعلیم یافتہ ہے ۔ شاید زرّیں کی قسمت اچھی ہی نکل آئے ــــ مگر جب سوتیلی والدہ کی اس سازش کا علم ہوا تو ہمارا پیمانہ صبر چھلک ہی پڑا ــــ ہم بہت حیران و پریشان تھے ۔

انہی دنوں میں ہماری پھوپھی جان جو مجھ سے مشکل آٹھ دس سال بڑی ہوں گی ہم اُنھیں اپنا سچّا دوست سمجھتے تھے ۔ وہ اپنی عدّت کے دن کاٹ کر سسرال سے ہمارے یہاں آگئیں ہم نے اُنہیں بیوہ ہوجانے پر مبارک باد دی ... چونکہ ان کی شادی بھی ایک طرح سے اُن کی بربادی ہی تھی ۔ اُن کے آجانے سے ہماری ڈھارس بندھ گئی ۔ ہم نے اپنی تمام مصیبتیں اُن کے سامنے رکھیں ۔ اور کہا کہ اب ہم سے برداشت نہیں ہوسکتا ۔ ہم چاہتے ہیں کہ گھر چھوڑ کر ہندوستان سے ہی ہجرت کرجائیں ۔ ہم ٹرکی جانا چاہتے ہیں" ــــ پہلے تو وہ ہچکچائیں مگر جب میں نے آزادی کی تعریف اور زندگی کے مقاصد پر ایک بسیط تقریر کرڈالی تو وہ متاثر ہوگئیں ۔ کہنے لگیں اچھا میں جو کچھ تمھاری مدد کرسکتی ہوں اُس سے دریغ نہ کرونگی مگر تم سب مجھ سے جو چھُٹ جاؤگی ۔ ہم نے کہا تم بھی چلو ۔ مگر وہ خود چلنے پر طیار نہ ہوئیں ۔ اور کہہ کہ میں یہاں کے حالات سے تمھیں مطلع کرتی رہوں گی ۔ مگر تم مجھے بھول نہ جانا ــــ ہم نے کہا ــــ کہیں ایسا بھی ہوسکتا ہے ۔ ہم جب ٹرکی پہنچ جائیں گے تو ایک ہوائی جہاز لے کر یہاں آئیں گے اور تمھیں اور والد صاحب کو تو ضرور لے جائیں گے اگر تم خوشی سے نہ چلیں تب بھی زبردستی لے جائیں گے ــــ تمھیں تو آزاد رکھیں گے مگر والد صاحب کو قید کئے بنا نہ مانیں گے ۔ باپ کے ادب و احترام میں ذرّہ برابر فرق نہ آنے دیں گے مگر اُنھیں قید کا مزہ ضرور چکھائیں گے تاکہ اُنھیں معلوم تو ہو کہ قید میں کتنی تکلیف ہوتی ہے ۔ اور جب تک وہ اپنے دقیانوسی خیالات بدل کر ہمارے جیسے روشن خیال ابا نہ بن جائیں گے ہم اُنہیں ہرگز آزاد نہ کریں گے ۔

پھوپھی جان ہنس پڑیں ۔ کہنے لگیں کہ اگر "آ کا بھائی" ابھی آجائیں ۔ تب تمھاری بہادری کی حقیقت معلوم ہو شرارت اور حوصلے کی بھی کوئی حد ہے یہ لڑکیاں باپ کو قید کرنے چلی ہیں ۔ بادشاہوں میں تو سُنا تھا کہ لڑکے بادشاہت کے لئے باپ کو قید کردیا کرتے تھے ۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری بھتیجیاں خیالات میں ہیر پھیر کی خاطر باپ کو قید کردینے کو

طیار ہیں ــــ



اب ہم نے گھر چھوڑنے کا تہیّہ کر لیا۔ پھوپھی جان کی زیر نگرانی ورزش کرنا شروع کردی۔ چونکہ پھوپھی جان کی ہدایت تھی کہ گھر چھوڑنے سے پہلے تمہیں اپنی حفاظت کے لئے سام ورستم کی طرح فولادی انسان بننا چاہیئے چونکہ ہمیں باہر کے متعلق لوگ بہت ڈرایا کرتے تھے کہ "بڑی بہادر ہو۔ ارے وہاں گھر سے باہر نکل کر ایک میل تک چلی جاؤ تو جانیں"!

پھوپھی جان کہتی تھیں کہ آکا بھائی کے مگدر جس دن گھماؤ گی اُس دن گھر چھوڑنا۔ مگر یہ ہمارے بس کی بات نہ تھی ایک مگدر تو ہم اُٹھا سکتے تھے اور ذرا ہلا بھی لیتے تھے مگر دونوں مگدر ہم نہ گھما سکتے تھے۔ ہماری پھوپھی ہم سے ڈنٹر پیلواتیں، بیٹھکیں کراتیں کشتی لڑنا سکھایا کرتیں، خوب دوڑایا کرتیں۔ درخت پر چڑھنا سکھاتیں چونکہ ہمارے یہاں کے مکان بھی اسی قسم کے ہوتے ہیں کہ یہ سب کچھ بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ سوتیلی والدہ، دادی نتھے وغیرہ بڑے مکان میں رہا کرتے تھے اور ہم پانچوں بہن بھائی معہ پھوپھی جان وماہ عالم کے چھوٹے دالان میں، مگر پھر بھی جب ہم آنگن میں دوڑتے۔ املی کے درخت پر چڑھتے تو دادی اور سوتیلی والدہ سخت ناراض ہوتیں کہ یہ لڑکوں کی طرح اُچھل کود کیا چار ہی ہے



سخت کسرت اور محنت کی وجہ سے میں شدید بیمار ہو گئی اور مجھے پھوپھی جان کے بتانے سے یہ معلوم ہوا کہ میں پھر ماں بننے والی ہوں۔ اب یہ ایک نئی مصیبت کا انکشاف ہوا ــ ہم جلد از جلد گھر چھوڑ کر بھاگنا چاہتے تھے اور اس مصیبت سے چھٹکارا پانے میں پورے چند ماہ باقی تھے۔ ہم سب بہت متفکر ہو گئے اُمیدوں پر اوس سی پڑ گئی ــ دو تین دن تک ہم نے رنج کے مارے کھانا نہیں کھایا۔ کہاں سام ورستم بننے چلے تھے اور لڑکی کے لئے سر فروش سپاہی بننا چاہتے تھے غرض تین دن تک ہم اور زریں روتے رہے۔ پھوپھی جان بہت سمجھاتیں۔ مگر ہمیں شدید رنج تھا سوچتے تھے کہ اگر ۶ ماہ ٹھیرے تو زریں بھی شادی کی زنجیروں میں بندھ جائے گی۔ بلکہ ۶ ماہ کجا ایک ہفتہ کے اندر [illegible] اُس کا نکاح کر دینے کے منصوبے ہو رہے تھے۔ معاملہ طے ہو چکا تھا۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے ہم نے سوچا کہ چلو والد صاحب کے مطلب کی چھان بین کریں اور کتابوں میں سے کوئی ایسا نسخہ تلاش کریں کہ جلد از جلد اس مصیبت سے چھٹکارا ہو جائے۔

ہمیں نسخہ مل گیا جلدی سے لکھ کر ملازمہ اور چنگو کو بھیج کر پنسری سے دوا منگوا کر میں نے کھالی۔ اس سے میری حالت اور بھی خطرناک ہو گئی۔ اور یہ راز افشا ہو گیا۔ سوتیلی ماں اور دوسری مخالف پارٹی کو اچھا موقع ہاتھ آیا۔ اِنھوں نے اِسے دوسرا رنگ دے دیا ــ اور ہمیں خوب بدنام کیا۔ بعض اوقات معصوم و بھولے انسان خود اپنی ہی حرکتوں سے کس طرح بدنام ہو جاتے ہیں ــ یہ سوچنے کی بات ہے

ہم ایسی مصیبت میں مبتلا تھے۔ جس کو کہ آپ سرگزشت کی گزشتہ قسطوں میں پڑھتے آئے ہیں۔ ہم ایسے غلیظ اور بُرے ماحول میں گھرے ہوئے تھے۔ جس سے ہماری طبائع کو کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ اور یقیناً ہر غیور انسان کے لئے ایسا ماحول جہنم سے بدتر مانا جا سکتا ہے۔ بھورے کے ساتھ رہنے کو جبراً "بدکاری" سے زیادہ ہم نے کبھی وقعت نہ دی اسی لئے ایک ایک لمحہ ہم پر شاق گزرتا تھا۔ اور اسی سے بچنے کے لئے

کوئی چارۂ کار نہ دیکھ کر ہم گھر سے بھاگ رہے تھے۔ اور جو رکاوٹیں حائل تھیں اُنھیں دور کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ مگر کم فہم لوگ ان باتوں کو کیا سمجھ سکتے تھے۔ اُنھوں نے تو یہی سمجھا کہ "اسقاط حمل کرنا اور گھر سے بھاگنا" صرف بدمعاشی اور چال چلن کی خرابی کے زیر تحت ہی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔

خیر میری نازک حالت دیکھ کر پھوپھی جان بہت گھبرائیں اور اُنھوں نے مشن ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر کو بلایا۔ وہ بہت ملنسار تھی۔ رفتہ رفتہ ہماری اُس کی دوستی ہوگئی۔ اُس سے ہم نے کہا کہ ہمیں عیسائی کر لو۔ ہم عیسائی ہونا چاہتے ہیں۔ وہ ذرا گھبرائی اور اُس نے پوچھا کہ تمھیں مسیحی مذہب کی کونسی بات پسند آئی جس کی وجہ سے تم اپنے آبائی مذہب کو چھوڑنے کے لیے طیار ہو" میں نے کہا کہ ہم حضرت عیسیٰ کی اس بات کے سچے دل سے عاشق ہیں کہ اُنھوں نے شادی نہیں کی۔ شادی سے ہمیں سخت نفرت ہے اور اتنی دنیا میں اس سے بُری کوئی چیز نہیں تم ہمیں عیسائی کر لو تو ہم "نن" NUN راہبہ بن جائیں گے۔ بس یہی اس وقت ہماری لگن ہے کہ ہم مرد کی شکل تو درکنار اُس کا نام تک نہ لیں۔ اُس کے وجود کا خیال وہم و گمان میں بھی نہ لائیں۔ ہمارے لئے دنیا میں یہی چیز نجات یا جنت جو کچھ سمجھو ہے۔ شادی اور اُس کے لوازمات سے ہمیں شدید نفرت اور کراہت آتی ہے۔ اور اسے ہم جہنم سے زیادہ بُرا سمجھتے ہیں۔

وہ کہنے لگی "نن" بننا تو بہت مشکل ہے۔ ہم نے کہا کیا کہتی ہو؟ دنیا کی آسان ترین چیز اور قابل رشک راحت ہے؟ — وہ مسکرائی۔ اور کہا کہ میں تمھیں بعد میں بائبل دوں گی اُس کا مطالعہ کرو"

لیڈی ڈاکٹر کی آمد و رفت اور گھنٹوں سر جوڑ کر بات چیت سے ہماری دادی اور سوتیلی ماں کو شک شبہ ہونے لگا۔ ایک دن ہم نے اُسکی دعوت کی اور ہم سب نے مل کر اکٹھا کھانا کھایا۔ اس کو ہمارے گھر والے برداشت نہ کر سکے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کسی غیر مسلم کے ساتھ کھانا کھا لینے سے اپنا مذہب جاتا رہتا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ لڑکیاں کرشان ہوگئیں۔ دادی کہنے لگیں یہ فرنگنیں دراصل بھنگن چمارنیں ہوتی ہیں جو ہندوستان میں آکر میم صاحبہ کہلاتی ہیں۔ اِن مُرداروں کے حوصلے تو دیکھو کہ پٹھانیوں کے برابر بیٹھ جاتی ہیں۔ اِن لڑکیوں نے انہیں دلیر کر دیا۔ خیر برابر سے بیٹھنے کو بھی ہم نے درگزر کیا۔ مگر اب تو حد ہوگئی کہ ساتھ کھانا کھانے لگیں ــــ لڑکیاں تو خیر ناسمجھ ہیں مگر ان کو تو اپنی اوقات سے رہنا چاہئے تھا۔ ہم سے اجازت لینا چاہئے تھی۔ غضب خدا کا پٹھانیوں کی برابری کرنے لگیں! ــــ بس اب آئندہ یہ لڑکیوں سے نہ ملنے پائیں۔ اب آئیں تو انھیں ڈیوڑھی سے لوٹا دو!

ایک دن ہم سب اپنی سہیلی کے یہاں مہمان گئے ہوئے تھے کہ وہ لیڈی ڈاکٹر ہم سے ملنے کو آئیں ــــ دربان نے اُنھیں روکا۔ مگر وہ زبردستی اندر آگئیں۔ اس پر ہماری دادی اُن پر لاٹھی لے کر دوڑیں اور کہنے لگیں "نکلو یہاں سے ــــ اپنی حیثیت کو مت بھولو ــــ ہماری لڑکیوں کو بگاڑ دیا۔ تمہیں اُن کے برابر بیٹھنے کی کیسے ہمت ہوگئی؟ ــــ خبردار جو کبھی اب تم یہاں آئیں"

ہماری سوتیلی ماں نے بھی اُنھیں خوب صلوٰتیں سنائیں لیڈی ڈاکٹر بے چاری ششدر ہو کر کہنے لگی "بی بی! تم ہم پر کیوں ناراض ہو۔ تمھاری لڑکیاں پیار محبت سے بُلاتی ہیں۔ خوش خلاقی سے پیش آتی ہیں تو ہم آتے ہیں۔ ورنہ ہم کیوں آتے۔ ناراض مت ہو ہم جاتے ہیں اور اب کبھی نہیں آئیں گے ــــ یہ کہہ کر وہ واپس چلی گئی۔

جب ہم گھر آئے تو ملازمہ سے سب حال معلوم ہوا۔ ہم

دادی اور سوتیلی ماں سے خوب لڑے۔ اور معذرت کا پرچہ لکھ کر اُن لیڈی ڈاکٹر کو بھیجا اور انھیں بُلا بھیجا ۔۔ مگر انھوں نے آنے سے انکار کر دیا۔ پھر ہم نے لکھ کر بھیجا کسی طرح ہمیں یہاں سے نکالو۔ مگر انھوں نے کہلا بھیجا کہ تم ابھی قانونی طور پر نابالغ ہو تین سال اور ٹھہر جاؤ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی مذہب بدلا جا سکتا ہے۔ جب تک تم مسیحیت کا مطالعہ کرو۔ خداوند مسیح تمھاری مدد کرے۔"

ہم بہت رنجیدہ ہوئے۔ اور ہمارے غصہ کا ٹھکانا نہ تھا ہم نے سوچا کہ اپنی مدد آپ ہی کرنا چاہئے۔ ہم نے قمر کو اس بات پر متعین کیا کہ وہ اسٹیشن کا راستہ خوب یاد کرے۔ چونکہ ہمارے یہاں سے اسٹیشن ساڑھے تین میل پر تھا۔ راستہ بہت خطرناک تھا۔ دن دہاڑے لوگ لُٹا کرتے تھے۔ آم اور بیریوں کے گھنے باغ اور کھیتوں میں سے ہو کر راستہ اسٹیشن کو جاتا تھا۔ اور دن کو بھی ۱۲ بجے سے لے کر ۲ بجے تک راستہ بند رہتا تھا۔ مگر ہم ہر مصیبت اور آفت کے لئے طیار رہے۔ قمر کو روزانہ تین بجے برف اور سوڈے لیمنیڈ کی بوتلیں لینے کے بہانے نوکر کے ساتھ اسٹیشن پر ہم بھیجا کرتے۔ بالآخر قمر نے راستہ یاد کر لیا۔

جس روز زرّیں کا نکاح ننھے کے ساتھ ہونے والا تھا۔ اُس سے ایک دن پہلے ہم جانے کو طیار ہو گئے۔ اُن طیاریوں پر مجھے اب بھی ہنسی آجاتی ہے ساتھ لے چلنے کو جو سامان کیا تھا۔ اُس میں گڑیاں، کھلونے تک لے لئے تھے۔ طرّہ یہ کہ ہمارے یہاں جو نیا... مکان بن رہا تھا اُس کے لئے پیتل کی نہایت خوبصورت چٹخنیاں آئی ہوئی تھیں وہ ہمیں بہت پسند تھیں ہم نے وہ بھی لے لیں کہ ٹرکی میں جو بالشتی مکان بنوائیں گے اُس میں یہی چٹخنیاں لگوائیں گے۔

غرضکہ ہم نے چار بڑے بڑے ٹرنک ٹھیک کئے اور دوپہر میں جبکہ سب لوگ سو رہے تھے چپکے چپکے لے جا کر چاروں ٹرنک ڈیوڑھی میں گھاس کے گٹھوں میں چھپا کر رکھ آئے۔

ایک غلام لڑکا جس کا نام چنگوا تھا۔ اُسے ہم نے خدمت کے لئے ساتھ لے لیا۔ اُس کی عمر بمشکل قمر جتنی ہوگی مگر تھا وہ بہت بہادر۔ اُس کے ماں باپ دونوں مر چکے تھے اِس لئے وہ ہمارے ساتھ ہو لیا۔



رات کے ۹ بجے تھے۔ گلابی جاڑے تھے مگر اس روز ذرا بارش ہو جانے کے سبب جاڑا بڑھ گیا تھا۔ سب لوگ بڑے دالان میں پردے گرا کر سوئے تھے۔ ہم نے لباس بدل لئے میں نے اور زرّیں و شیریں نے مردانہ لباس پہنا۔ اور قمر و مہرو؟ کو لڑکیوں کا لباس پہنایا۔ اور ڈیوڑھی میں جا کر دربان کو اٹھا کر کہا کہ جا تین یکے لا ۔۔۔ وہ ہکا بکا ہو کر ہمیں تکنے لگا ۔۔ شروع شروع میں وہ ہمیں پہچانا ہی نہیں۔ مگر جب ہماری پھوپھی نے ڈانٹ کر کہا گنوار! دیکھتا کیا ہے جا تین یکے لے آ" ۔۔

تب اُس نے اپنے حواس درست کر کے کہا کہ حضور! کہاں کے لئے اور اس وقت کون جا رہا ہے۔ شام تک تو اس کی [illegible] ابھی یکے کہاں ملیں گے؟ ۱۰ بج رہے ہیں۔

"ہاں ہمیں رات کے ۱۱ بجے کی گاڑی سے جانا ہے۔ ہم اسٹیشن جا رہے ہیں۔" ہم نے کہا۔

"لیکن کس مُلک کو" دربان نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"تجھے اس سے کیا" پھوپھی جان نے ڈانٹ بتائی۔

"لیکن حضور کون کون جا رہا ہے۔ بڑی بی بی کہاں پر ہیں۔ ننھے میاں کہاں ہیں؟" دربان نے پوچھا ۔۔

(باقی ....)

تاثرات

"سرگزشت" پڑھنے کے بعد

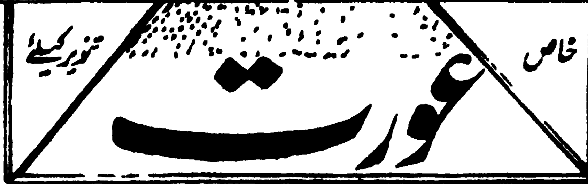
از حضرت ارشد تھانوی مدظلہٗ

اُٹھ کہ تجھ کو مرد سے لینا ہے اپنا انتقام / ظالم و بیدرد سے لینا ہے اپنا انتقام
جو تری دوشیزگی برباد کر دینے کے بعد / قدرتی پاکیزگی برباد کر دینے کے بعد
یہ سمجھتا ہے کہ اِک تقویم پارینہ ہی تو / اب نظریہ آہ کی اِک دھندلا سا آئینہ ہی تو
کر کے غارت بدنگاہی سے نکوروئی تری / وجہ کج خلقی بنا لیتا ہے خوشخوئی تری
سر کو ٹھکراتا ہے تیرے پائے استحقار سے / ذبح کرتا ہے تجھے بے باڑھ کی تلوار سے
بن کے بھونرا اے کلی پہلے تو رس لیتا ہی وہ / سانپ کی مانند آخر تجھ کو ڈس لیتا ہی وہ

کس لئے تو کر رہی حاصل حسنِ حریت نہیں / مرد کا پہلو ہی تیرا گنجِ عافیت نہیں
نصفِ بہتر تو سہی، وہ نصف بدتر ہے مگر / تو مجسّم خیر ہے وہ پیکرِ شر ہے مگر
مرد کو تو نے غلط سمجھا رفیقِ زندگی / چھوڑ اُس کو خود بنا اپنا طریقِ زندگی
ہر جفا پر ہر ستم پر صبر کیوں کرتی ہی تو / آپ ہی ہستی پر اپنی جبر کیوں کرتی ہی تو
اپنے پاؤں پر کھڑی ہو، بازوؤں سے کام لے / دل کو رکھ مضبوط، ہاتھوں سے کلیجہ تھام لے
اب سنبھلنے میں نہ تجھ کو دیر کرنا چاہیئے / ظالمانہ طاقتوں کو زیر کرنا چاہیئے

پھر یہی دنیا جو دوزخ ہی جنان بن جائیگی
اور تو اُس کی بہارِ جاوداں بن جائیگی







عورت

از محترمہ سلمیٰ صاحبہ بیگم جناب شیخ عبدالحمید صاحب نثار امرتسری

کہا جاتا ہے کہ عورت کاشانۂ راحت کی زینت ہے۔ اور اس کا میدان عمل صرف گھر کی چاردیواری ہے۔ لیکن اگر تحقیق کی روشنی میں انصاف کی دوربین کے ذریعہ بغور صفحات تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جائیگی کہ زمانہ کہن میں یہی فردوسی حوریں اگر ایک طرف مردوں کی دلبستگی کا باعث تھیں تو دوسری رزمگاہ حق و باطل کی بہترین خطیب اور دارالجراحت کی مایۂ ناز خادمہ تھیں۔

حضرت ام سلمہ بنت خالدؓ وہ مایۂ ناز ہستی ہیں جن کے پُرجوش کارنامے آج تک زبان زد خلائق ہیں۔ جس سال حضرت خالدؓ نے اسلام قبول کیا۔ اسی سال روم کے حاکم بلقا نے چالیس ہزار نوجوانوں کے ساتھ مسلمانوں پر چڑھائی کی۔ راحق العقرہ میں لشکر جمع ہوا۔ مجاہدین اسلام صرف چار ہزار تھے۔ خونریز جنگ ہوئی۔ دشمن کی طاقت زیادہ تھی مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ام سلیم جوش میں آئیں۔ بکھرے ہوئے مسلمانوں کو اکٹھا کیا۔ اور اپنی روح پرور تقریروں سے وہ افسوں پھونکا کہ چند گھنٹوں میں ہی باطل پرستوں کے قدم اکھڑ گئے۔ اور رومیوں کی ساری طاقت درہم برہم ہو گئی۔

حضرت صفیہ بنت ابو عبیدہؓ کے ہنگامہ خیز کارناموں سے کون انکار کر سکتا ہے۔ جب حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ نے دمشق پر حملہ کیا تو حضرت صفیہؓ کی تلوار ہی تھی جس نے رومیوں کی تندہ دل فوج پر فتح پائی۔ اور اس کامیابی کے ساتھ کہ مجاہدین میں سے صرف تیس اشخاص شہید ہوئے۔

حضرت امام بنت زبیرؓ کی سرفروشی اور حق پرستی سے کون واقف نہیں؟ آپکے عزم و استقلال آپ کی ذہانت۔ آپکی انکسار پسندی اور جانبازی کا تمام قبیلہ قریش میں سے کوئی خاتون بھی مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔

یہ تو صدیوں پہلے کے واقعات ہیں۔ ابھی کل کے حالات پر غور کر لو۔ انقلاب روس میں عورتوں نے جس جانبازی اور سرفروشی کا ثبوت دیا۔ اس کا مقابلہ شاید ہی دنیا کی کوئی تاریخ کر سکے گی۔ روس کے انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے مسز "بوشکریو" نے تمام روسی خواتین کو جمع کر کے ایک نہایت حسین و جمیل فوج تیار کی تھی۔ اس فوج کو فنون سپہ گری میں طاق کر کے سامان حرب سے آراستہ کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ عورتوں کی اس فوج کے سامنے مردوں کے کئی دستے بے حقیقت تھے۔ ایک موقع پر جب مردانہ فوج کے نصف سے زائد آدمی ہلاک اور مجروح ہو چکے تھے اور قریب تھا کہ انقلاب پسند شکست کھا جائیں کہ یہ خوبصورت فوج آگے بڑھی۔ اور دشمنوں کے ساتھ اس دلیری اور بہادری سے جنگ کی کہ بارہ گھنٹوں کے اندر ہی مخالفوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ انقلاب پسند جن کو شکست ہو رہی تھی ان "کاشانۂ راحت" کی زینت بننے والی عورتوں کی بدولت دشمنوں پر غالب آ گئے۔

مس چھدرا۔ میڈم ٹوملا اور میری زرنی خواتین نے انقلاب

روسی عورتوں نے بے مثال مردانہ شجاعتوں کا ثبوت دیا۔ اس کی ادائیگی سے خامہ قاصر ہے۔ جنگ عظیم اور انقلاب روس کی تاریخ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اگر روسی عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام نہ کرتیں۔ تو دشمن روس کو پیس چکے ہوتے۔ جون آف آرک کا ایثار کیا کم تھا؟ اور اسپین کی گذشتہ جنگ میں اسپین کی عورتوں نے کیا کم قربانیاں دی ہیں؟ خالدہ خانم نے اپنے ملک کے لئے کیا کچھ نہیں کیا؟ موت نے اگرچہ ان جانباز عورتوں کی شمع حیات کو گل کر دیا ہے۔ لیکن انھوں نے مر کر عورت کا نام دنیا میں روشن کر دیا۔ دراصل وہ مری نہیں بلکہ زندہ ہیں ——

رتبے شہید ناز کے گر جان جائیے

قربان جانے والے کے قربان جائیے

تاریخ کے صفحات عورت کی ذات سے متعلق بے شمار داستانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ عورت کا تمدن، عورت کا جمال دلفریب۔ عورت کی محبت، عورت کی جانبازی و سرفروشی اور عورت کی شریعت دنیا کے ہر دور میں مشکوٰۃ انقلاب بنی ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں داستانیں جو تمھاری نظر سے گزری ہیں یا گزریں گی۔ ان میں جان افسانہ تم ہمیشہ عورت کو پاؤ گے۔ عورت باوجود اپنی بے انتہا نزاکت کے ایک تیغ کار اور شیر آزما کا کام دیتی رہی ہے۔ اور دیتی رہے گی۔ کبھی بھی تو عورت کی ایک جنبش چشم پر قوموں کی قسمت بنی اور بگڑی ہے اس نے ہر معرکہ میں مردوں پر فتح پائی ہے۔ لیکن طاقت یا شجاعت سے نہیں بلکہ اپنی وفا انجام اور پُر خلوص خدمت سے۔ اس نے ہر رزم گاہ میں دشمنوں کو نیچا دکھایا ہے لیکن دھوکے اور فریب کاری سے نہیں بلکہ مردوں کے دوش بدوش اپنی جانبازی و سرفروشی کے جوہر دکھا کر۔

اور آج کہا جاتا ہے کہ عورت کاشانۂ راحت کی زینت ہے اور بس۔ کہتے ہیں کہ شاعر قوم کی کایا پلٹ دیا کرتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی شاعر نے عورت کو ناکارہ بنا کر قوم کی تباہی ڈھا دی ہے آپ ایک ہندوستانی شاعر سے پوچھیں کہ عورت کیا کر سکتی ہے تو وہ جواب دے گا کہ عورت زلفوں میں لوں کو الجھا سکتی ہے۔ چشم میگوں سے مست بنا سکتی ہے۔ تیر مژگاں سے جگر کو چھلنی کر سکتی ہے۔ تبسم سے بجلیاں گرا سکتی ہے۔ غرض ہندوستانی شاعر کے نزدیک عورت کے نام ہیں۔ مخمور چشم۔ غنچہ دہن۔ نازک بدن۔ ماہ لقا۔ پیکر جمال وغیرہ! میں ان رہنماؤں۔ شاعروں اور ادیبوں سے پوچھتی ہوں کہ آخر تمھاری وہ مردانہ ہمت کیا ہوئی؟ —— کبھی تو تم نے اس طرح بھی ترقی کی ہو؟ کبھی تم نے عورتوں کے بہادرانہ کارنامے بھی صفحۂ قرطاس پر لکھے ہیں؟ اے عورتوں کے میدان عمل کو گھر کی چار دیواری سے تشبیہ دینے والو آخر عورتوں میں اور تم میں فرق کیا ہے۔ اگر خدا نے تمھیں دماغ دیا ہے تو عورت بھی دماغ رکھتی ہے۔ اگر تم میں ہمت کا جذبہ ہے تو عورت بھی اس جذبہ سے خالی نہیں۔ اگر قوت ارادی سے تم دنیا کا تختہ الٹ سکتے ہو تو عورت بھی اپنی صنفی قابلیت سے دنیا میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر سکتی ہے۔ پھر عورت کو بے کام میں ہیٹا تصور کرنا چہ معنی دارد؟

بہادری اور دلیری ہاتھ پاؤں کی مضبوطی اور جنگ کرنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی بہادری پریشانیوں اور مصیبتوں کا مقابلہ ہے۔ جس میں کہ مرد عموماً کمزور ثابت ہوتا ہے۔ ذرا سی پریشانی اور مصیبت ان کے دماغ کے توازن کو کھو دیتی ہے...... مرد کتنے بہادر ہیں؟..... اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ خودکشی کے واقعات عموماً مردوں میں ہی ہوتے ہیں۔ ذرا سی پریشانی اور ناکامی پر یہ جان دے دیتے ہیں کیا اس سے بڑھ کر بزدلی کی مثال اور بھی کوئی ہو سکتی ہے۔ برعکس عورتوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مصائب کا پورے استقلال کے ساتھ مقابلہ کرتی ہیں۔

اظہار نہ کرتی تھی۔ اور بڑی سے بڑی تکلیف کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اٹھا لیتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ عورت ہزاروں مایوس مُردہ دلوں میں ہمت، جرأت اور زندگی کی رُوح پھونک دیتی ہے۔

عورت چونکہ اعلیٰ ظرفی کی مالک ہے اس لئے وہ اپنے محاسن اور خوبیوں کو چھپاتی رہتی ہے۔ میری ناقص رائے میں انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ اپنی خوبیوں کو چھپانا کوئی دانشمندی نہیں عورتوں کو چاہئے کہ اپنی خوبیاں نہ صرف ظاہر کریں بلکہ ان کو چلا دیں۔ اور مردوں کو اپنے اعمال اور کارناموں سے یہ بتا دیں کہ اگر مرد جسمانی اعتبار سے قوی ہیں تو عورت کو دماغی لحاظ سے برتری حاصل ہے۔ اُمید ہے کہ میری دوسری بہنیں بھی میری ہمنوا ہونگی۔

"خطاب بہ شمع ہدایت"

"ایک انگریزی نظم کا ترجمہ"

از جناب سید شرافت علی صاحب تنہا لکھنوی

اے شمع رہنما! میری رہبری کر — اس تیرہ و تار عالم
میں، تو — مجھے آگے بڑھنے کا راستہ بتا!
تاریک رات بڑی بھیانک ہے — —
میں اپنی منزل سے دور — بہت دور ہوں!
تو مجھے آگے بڑھا!

میرے پیروں میں زور اور ہمت عطا کر!
— میری التجا اور تمنا یہ نہیں ہے کہ میں مستقبل
بعید کے — منظر کو دیکھ لوں!!
— صرف ایک قدم میرے لئے کافی!!!
میں کبھی ایسا مجبور نہ تھا — نہ کبھی ایسی مناجات
کی تھی کہ — تو مجھے آگے بڑھا!!!

— میں ہمیشہ اپنے طریق عمل کا انتخاب
کرنا اور اس کے نشیب و فراز کا سمجھنا پسند کیا کرتا تھا
— — لیکن — اے ہادیٔ برحق!
— تو میری اب مدد کر!! میں نادار اور دلوں سے کو بہت
مجبور رہ گیا تھا — اور موت کے منہ میں ہوتے ہوئے
بھی — میرے ارادوں اور طریقوں میں — کبر و نخوت کی
گھٹائیں چھائی رہتی تھیں — !!
— اب تو میرے ماضی کو دھیان میں نہ لا — !!
ابتک تیری قدرت نے مجھ پر رحمت و عنایت کی نظر رکھی ہے!! اور — اب بھی
میرا گمان ہے کہ — تو میری رہنمائی کرے گی!!! —
دھواں دھار اور نقطہ آغاز — کوہستانوں میں — ندیوں اور سمندروں
میں — یہاں تک کہ یہ اندھیری رات بیت جائے!! اور — صبح — !
نور کے تڑکے! — وہ فرشتوں کے مسکراتے ہوئے چہرے — !
نظر آنے لگیں گے —

جن سے مجھ کو بہت پیار تھا — پر ہم بچھڑ گئے — !!!
اور جو — مجھ سے ایک زمانہ سے — —
بچھڑ گئے تھے!!!

پیغامِ مصوّر

شاعرِ اسلام حضرت مولانا ابوبکر میاں مصوّر مدظلہٗ رئیس اعظم ۔ صدر انجمن معیار الادب بمبئی

ذیل کی نظم ۲ر جنوری ۱۹۳۸ء کی شب کو آل انڈیا براڈکاسٹ کی گئی جو مولانا موصوف نے بحیثیت صدر پڑھی تھی

بمبئی کی تاریخ میں اردو شاعری کا یہ پہلا مشاعرہ تھا۔ جو تمام ہندوستان میں سُنا گیا ـــــ

ملا ہے بخت سے وہ اقتدارِ لامکاں مجھکو
نظر آتے ہیں ہفت افلاک ہی سیارگاں مجھکو

کوئی محفوظ اُس کی زد سے رہ سکتا نہیں ہرگز
عطا کی ہے وہ قدرت نے کمانِ کہکشاں مجھکو

تسلط ہے مرے ذہن و نظر کا ذرّے ذرّے پر
نہ سمجھیں بے خبر منزل سے اہلِ کارواں مجھکو

ڈبو سکتا ہوں جس سے حبابِ رانِ دہر کی ہستی
مرے خالق نے بخشا ہے وہ بحرِ بیکراں مجھکو

وہ استقلال ہے میرا وہ میرا عزم صادق ہے
کیا ہے جس نے مرہونِ حیاتِ جاوداں مجھکو

نہیں میں ان سجودِ ظاہری پر مطمئن ہرگز
جبیں کو اور کرنا ہے رہینِ آستاں مجھکو

سرور و غم سے ہے اے چرخ بالاتر مری ہستی
دکھا کر کیا کرے گا منظرِ سود و زیاں مجھکو

مری گم گشتگی پر ہنس نہ تو اے رہبرِ مغرب
کہ ہے شمعِ ہدایت نقشِ پائے رفتگاں مجھکو

مرے انفاس کیف آگیں و آثارِ حیات آئیں
گلستانِ وطن میں ہیں بہارِ بے خزاں مجھکو

درخشاں ہی درخشاں گلشنِ ہستی کے منظر پر
نظر آتا ہے اب مستقبلِ ہندوستاں مجھکو

کوئی دیکھے علوئے نظم مشرق میری آنکھوں سے
نظر آتا ہے وہ لیتے ہوئے انگڑائیاں مجھکو

میں اک آزاد فطرت مردِ میدانِ مشیت ہوں
یہاں ہونے لگا کیوں خدشۂ قیدِ مکاں مجھکو

گرایا جس نے آخر سطوتِ ایوانِ مغرب کو
میسر اس قدر ہے طاقتِ شرح و بیاں مجھکو

میں ہر سرمایۂ مغرور رکھ دوں اُن کے ہاتھوں پر
بہت بےچین کرتی ہے صدائے بیکساں مجھکو

فضائے قدس کی سب طاقتیں بیدار ہیں مجھ میں
کہ اب مدِ نظر ہے ارتقائے آشیاں مجھکو

مرا ہی تذکرہ رہتا ہے اب گردوں نشینوں میں
مسولینی و ہٹلر ہیں مرے ہی خوشہ چینوں میں

اپنا حج پورے آرام سے کیجئے

ISLAMI

بزاروں نیک، خدا ترس مسلمان اس سال مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوں گے
آپ بھی یہ سعادت کیوں نہ حاصل کریں؟ اس طویل سفر کے اخراجات اب پہلے سے کم ہو گئے ہیں۔

رمضان المبارک سے قبل جانیوالوں کیلئے کرایہ کی خاص سستی شرح

رمضان المبارک تک جانیوالے تمام جہازوں کے لئے خاص کم کئے ہوئے نرخ ذیل میں درج ہیں:۔
ہمارے جہازات ہر مذاق کے لوگوں کے لئے سازوسامان سے آراستہ ہیں اور ہماری لائن سے آپ یقینی طور پر آرام سے سفر کر سکتے ہیں۔
ہمارے جہاز کی روانگی کی پہلی تاریخ درج ذیل ہے اور ہمیں آپ سے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ آپ جس قدر جلد اپنا ٹکٹ خرید لیں گے اتنا ہی آپ کو بعد میں اطمینان اور آرام رہے گا۔
ایس۔ ایس علوی ۳۵۶۶ ٹن بمبئی سے ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو اور کراچی سے ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو روانہ ہوگا
اس کے بعد موسم حج کے آخر تک تھوڑے تھوڑے وقفہ سے حاجیوں کے جہازات روانہ ہوتے رہیں گے

کرایہ واپسی مع خوراک (جسمیں قرنطینہ اور حفظان صحت کا محصول مبلغ ۲۰ روپیہ شامل ہے)

	بمبئی سے جدہ	کراچی سے جدہ
فرسٹ کلاس	۵۲۱ روپیہ	۴۹۰ روپیہ
سیکنڈ کلاس	۳۴۴ "	۳۲۲ "
ڈیک	۱۴۸ "	۱۴۲ "

حاجیوں کے جہازات کے متعلق تفصیلات کے لئے مندرجہ ذیل پتوں پر لکھئے۔
میسرز ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹیڈ۔ بمبئی
میسرز گراہمس ٹریڈنگ کمپنی (انڈیا) لمیٹیڈ۔ کراچی
میسرز ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹیڈ۔ کلکتہ

مغل لائن سے سفر کیجئے

حاجیوں کو لانے لیجانیوالی اعلیٰ اور پہلی لائن جو گذشتہ ۸۵ سال سے یہ کام کر رہی ہے

تنویر پر ایک طائرانہ نظر

از جناب عطاء اللہ صاحب پالوی

اُردو زبان کے مستند شاعر جناب سیماب اکبرآبادی کا جب شہرہ معروف دیوان "کلیم عجم" میری نظر سے گزرا تھا۔ تو مجھے یہ دیکھ کر کہ سارے فضائے دیوان میں "تنویر" صرف ایک ہی ہے "تنویر" کی یکتائی پر کسی حد تک حیرت ہوئی تھی۔ لیکن جب محترمہ اصغری بیگم صاحبہ متخلص بہ "سحر" مدیرہ رسالۂ "تنویر" (بمبئی) نے ملک کے مشہور باکمال شاعر و ادیب پروفیسر احمد صدیق مجنوں گورکھپوری کے ایما سے تنویر کے یک وقت دو صحیفے (مئی و جون نمبر ۱۹۳۹ء) مجھ پر نازل فرمائے اور میں نے اُن کا بغور مطالعہ کیا۔ تو "تنویر" کی انفرادیت و یکتائیت کا اعتراف کرنا پڑا۔ اور تسلیم کر لینا پڑا کہ اُردو زبان کے سب سے بڑے انقلابی شاعر (جوش) کے سب سے بڑے انقلابی رسالہ (کلیم) میں "تنویر" کے متعلق جناب اسرائیل احمد خان صاحب کا یہ فرمانا کہ:۔

"تنویر" اس معاملے میں خوش قسمت ہے کہ اسکو ادبی ہندوستان کی ممتاز شخصیتوں کے مبارکباد نامے نصیب ہوئے ہیں۔ پھر شاعر انقلاب کا منظوم پیام تہنیت جو زیر نظر اشاعت کے صفحۂ اول کی زینت ہے۔ بلاشبہ اک مایۂ نازش فخر ہے، صنف لطیف کا عنصر اجتماعی تحریکات کے اسلحہ خانہ میں جو حیثیت و اہمیت رکھتا ہے اور جو دوگونہ رزم و بزم بہم پہنچاتا ہے اُسکا "سحر بیان" دو ایک شعروں میں ملاحظہ فرمائیے:۔

ہاں یہ عورت ہی میں قوت ہے کہ وہ چاہے اگر
بطن شبنم سے شرر پیدا ہوں، آہن سے گہر
رقص کرتا ہے زمانہ عورتوں کے ساز پر
کارواں چلتے ہیں اُن کے شعلۂ آواز پر

تنویر کے صفحات میں اک خاص جان و جولانی کروٹیں لیتی محسوس ہوتی ہے۔ جوش صاحب کے اس شعر میں شاید جابجز شاعرانہ جوش بیان سے برائے نام ہی کچھ زیادہ مبالغہ ہوگا کہ:۔

اس کے ہر اک حرف میں غلطاں ہے ذہنی انقلاب
دوش پر اُس کے ہے روشن عصر نو کا آفتاب"

بالکل درست تھا۔ نسوانی سپہر صحافت میں اس وقت قوس قزح کی طرح ایک نہیں متعدد رنگ کے رسائل جگمگا رہے ہیں اور بلاشبہ یہ درست ہے کہ تقریباً سب کے سب ایک طرف تو اُردو زبان کے لئے آغوشِ مادر کا کام دے رہے ہیں۔ اور دوسری جانب طبقۂ صنفِ لطیف میں ادب و انشا کا مذاق پیدا کر رہے ہیں۔ اور اس لحاظ سے اُن میں سے ہر ایک کو سراہا جا سکتا ہے۔ لیکن لاریب یہ بھی حقیقت ہے کہ جسقدر سنگلاخ زمین سے "تنویر" کی جلوہ گری ظہور میں آئی ہے اُسی قدر وہ اپنے سنگین و متین مقاصد و مطالب میں تمام زنانہ رسائل سے ارفع اور بلند بھی نظر آتا ہے۔ اور اس لئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُردو زبان کے تمام نسوانی بلند پایہ جرائد میں

"تنویر" اور صرف "تنویر" ہی وہ رسالہ ہے جو اپنی تمام محبوبیت
کو بالائے طاق رکھ کر تمام و کمال بیتابانہ درد و کسک کے ساتھ
ہندوستان کے دروازہ سے عورتوں کی ذہنی و دماغی
اصلاح و درستی کے لئے "انقلاب" کی آواز بلند کرتا ہوا نکل پڑا
ہے اور اس صورت میں فہمید صاحب کی یہ شہادت کہ:-

دوش پہ ہیں جس کے لاکھوں کاروانِ نور و نار
صبح کا وہ جلوۂ عریاں ہے "تنویر سحر"
روح کو دیتی ہیں جس کی وسعتیں پیامِ رقص
شعر و نغمہ کا وہ کیفستاں ہے "تنویر سحر"

قابلِ تسلیم اور لائق پذیرائی ہے۔

کسی رسالہ کی کامیابی* کا مدار صرف دو چیزوں پر ہے
ایک یہ کہ اس کی عنانِ ادارت ایسے ہاتھوں میں ہو جس کی
صلاحیتیں مسلم ہوں۔ دوسری یہ کہ اُسے ملک کے بلند پایہ شعرا
اور ادبا کی قلمی اعانت حاصل ہو۔ سو ان دو نمبروں کے مطالعہ
نے مجھے ان دونوں چیزوں کی طرف سے اطمینان دلا دیا ہے۔

"تنویر" کی سیادت جن لطیف ہاتھوں میں ہے، وہ
بلاشبہ ایک مسلم پایۂ ادبی رکھتے ہیں۔ سحر صاحبہ کی سحر نگاری
کے متعلق جناب اسرائیل احمد خان صاحب لکھتے ہیں کہ:-
"سحر صاحبہ کی خوشنما نگارشیں ایک ادبی سرجری کی برق
دم نشتر کاریاں ہوتی ہیں"
یہ ایک مختصر لیکن لاجواب اور اٹل تنقید و تبصرہ ہے جو سحر صاحبہ
کی تحریروں کے متعلق کیا گیا ہے۔ موصوفہ نے "سرگذشت"
بیان کرتے ہوئے جا بجا اور موقع بہ موقع جو تیر و نشتر رکھدئے
ہیں تو قارئین اُن سے گھائل ہوئے اور اُن کی کسک محسوس
کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کاش موصوفہ کی یہ کاوش کامیاب ہو
اور مادۂ فاسد نکل جائے۔

نائب مدیرہ محترمہ "الوری خانم" کے متعلق صاحب
موصوف نے فرمایا ہے کہ "نائب مدیرہ کے ترجمے اور شذرے
رنگ و روشنی کے دلچسپ مرکب واقع ہوئے ہیں۔

"تنویر" کے قلمی معاونین میں تقریباً ہر صنف سخن کے مایۂ ناز
افراد شامل نظر آتے ہیں۔ بقول منظر رضوی صاحب جبکہ
"تنویر" کو جوش کے سے باغی، احسان کے سے درد آشنا،
جگر کے سے مست، فراق کے سے شوخ، اور مجنوں کے سے
مفکر، مصلح شاعروں اور سید سعید جعفری، حضرت لطیف الدین احمد
اور منظر رضوی وغیرہ کے سے ایک خاص نوک پلک والے
ادبا کی معاونت حاصل ہو تو اس کی کامیابی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

"تنویر" پر اپنی جانب سے خصوصاً اس حالت میں جبکہ
خود سحر صاحبہ نے "تنویر" کا مطالعہ قول و فعل کی آزادی کا جذبہ
پیدا کرتا ہے، بلکہ کر اس پر بہترین تنقید سپرد قلم فرما دی ہے
کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ پھر بھی اتنا کہے بغیر رہا نہیں جاتا
کہ "تنویر" "شعلہ و شبنم" کا ایک دلچسپ مجموعہ اور جہد و عمل
کی تعلیم کا ایک قابل قدر ماہانہ صحیفہ ہے۔ اور فی زمانہ ہندوستان
جس دور سے گزر رہا ہے اُس کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے
رسائل کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے۔ اور صرف پڑھا
نہیں جائے۔ بلکہ اسے سمجھا اور اس پر غور بھی کیا جائے۔

اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے
کہ میرے نزدیک "مئی نمبر" "جون نمبر" سے بہتر ہے کیونکہ
مئی نمبر میں ذہنی و دماغی آزادی کا وہ جذبہ جس کے تحت

---

* کامیابی سے مراد رسالہ کی زیادہ اشاعت نہیں بلکہ اس کی بلند معیاری ہے۔ عطا اللہ

"تنویر" بمبئی یا ناک ہندوستان سے نکالا گیا ہے۔ زیادہ کار فرما ہے اور یہی چیز "تنویر" کو دوسرے رسائل سے علیحدہ کرتی ہے۔ لہٰذا میرا ذاتی خیال تھا کہ اگر سحر صاحبہ حقیقتاً یہ چاہتی ہیں کہ "تنویر" سارے عالم پر چھا جائے تو موصوفہ کو چاہیئے کہ اس کے مقاصد کو کچھ اور وسعت دیں۔ کیونکہ اس وقت ہندوستانیوں کے لئے (چاہے مرد ہوں یا عورتیں) اس کا موقع نہیں کہ صرف شبنم کی ہلکی ہلکی پھوار سے لطف اور نرم نرم نسیم سحری سے کیف سرور حاصل کریں بلکہ ضرورت اس کی بھی ہے کہ شعلوں کی ہیبتناک لپک کا نظارہ اور گرم گرم طوفانی ہوا کا مقابلہ کرنے کا مذاق پیدا کریں۔ اور ہندوستان کی عورتیں اس میدان میں ابھی بہت پیچھے ہیں۔ جن کا آگے لانا صرف "تنویر" کا کام ہے۔

"تنویر" پر اظہار خیال کرتے ہوئے "مئی نمبر" میں منظر صاحب خلاق مدیرہ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ "تنویر" کو خالص زنانہ پرچہ بنائیں میری دانست میں "تنویر" کے لئے یہ مشورہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ شاید مضر بھی ہوگا۔ کیونکہ ہندوستانی خواتین اگرچہ بام ترقی کا کئی زینہ طے کر چکی ہیں اور لاریب اُن میں سے اکثر بے نظیر صلاحیتوں کی حامل بھی نظر آتی ہیں۔ لیکن ہنوز اُن کی دُنیا محدود ہے نیز "تنویر" جیسے بلند مقاصد کا علمبردار ہے۔ اُس کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جنس قوی سے احتراز نہ کرکے ملک کے مشاہیر شعرا اور ادبا کے افکار عالیہ سے ضرور استفادہ کیا جائے۔ ورنہ اس کی ساری کوششیں ماند پڑ جائیں گی اور اس کی یہ انفرادیت جس کا اس وقت یہ حامل نظر آتا ہے، جاتی رہے گی۔

تصاویر کے سلسلے میں "تنویر" نے ایک خاص طرز ایجاد کی ہے۔ اس کے سرورق کے پچھلے دونوں حصوں میں مشاہیر کی تصاویر شائع کی جاتی ہیں۔ جن میں ایک فلمی دنیا کے لئے مخصوص ہے۔ اور دوسرا فلمی دنیا کے لئے۔ چنانچہ "تنویر" کے مئی نمبر میں ایک طرف قلمی دنیا کے باکمال انشا پرداز حضرت مجنوں گورکھپوری کی تصویر ہے۔ اور دوسری جانب فلمی دنیا کی مشہور ادا کار مس ماد ہوری کی ....

ندا زد ندکہ حافظ خموش باش خموش

تمہید

[illegible] ہو لیتا ہوں
[illegible] سے ہو لیتا ہوں
[illegible] غم و آلام [illegible] ہو لیتا ہوں
[illegible] ہوں کے بہت
[illegible] ہو لیتا ہوں
[illegible] سے [illegible] ہو لیتا ہوں
[illegible]

[illegible] ہے تیری
[illegible] ہے تیری
[illegible] ہستی ہے تیری
[illegible]
[illegible]

ساحر [illegible]

رفعت [illegible]



از جناب لالہ دیش بندھو جی گپتا ایم۔ ایل۔ اے

(یہ تقریر ۲۴؍ماہ اگست آل انڈیا ریڈیو کے دہلی سٹیشن سے لالہ دیش بندھو جی گپتا ایم۔ ایل۔ اے مینیجنگ ڈائرکٹر "تیج" نے کی تھی جسے ریڈیو سٹیشن کی اجازت سے نقل کر کے ہم اپنے ناظرین کے مطالعہ کے لئے درج کرتے ہیں) ایڈیٹر

آل انڈیا ریڈیو نے بات چیت کا جو سلسلہ What is wrong with the world عنوان سے شروع کیا ہے اس کی پہلی قسط Party Faction یعنی جماعتی اختلافات ہمارے آپ کے درمیان بات چیت کا موضوع بن چکی تھی۔ آج اسی سلسلہ کی دوسری کڑی Armaments یعنی "اسلحہ بندی" پر میں آپ سے بات چیت کروں گا اور یہ دکھلانے کی کوشش کروں گا کہ "اسلحہ بندی" کے باعث موجودہ دنیا میں کیا کیا خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ "اسلحہ بندی" کا لفظ بہت جامع ہے اور اس کے معنی میں وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں جو کسی ملک پر حملہ کرنے یا کسی ملک کے حملہ سے بچنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً سپاہیوں کی فوجیں سواروں اور پیدلوں کے دستے اور ان کے تمام ہتھیار اور سامان جنگ مثلاً سنگینیں بندوقیں توپ خانے، بارود، کارتوس، بم اور گولے، پھر بحری فوجوں اور بیڑوں کے متعلق جنگی جہاز کروزر آبدوز کشتیاں تار پیڈو اور مائن وغیرہ اس کے بعد ہوائی بیڑوں میں بم اور گیس برسانے والے ہوائی جہاز اور ان کو چلانے والے پائلاٹ وغیرہ یہ تمام کی تمام چیزیں "آرمامنٹ" یعنی اسلحہ بندی کے ضمن میں آ جاتی ہیں۔

یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ اسلحہ بندی صرف جدید دنیا کی ایجاد ہے کیونکہ جب زندگی کے قدیم ابتدائی دور میں انسان نے جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے کے باعث وحشی درندوں سے اپنی حفاظت کی ضرورت محسوس کی اور درخت کی ٹہنیوں سے تیر و کمان بنا کر اپنے ہاتھوں میں لیا اسی وقت گویا انسان اسلحہ بند ہو گیا۔ لیکن پہلے زمانہ کی اسلحہ بندی اور اب کی اسلحہ بندی کے طریقہ اور مقصد دونوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ پرانی لڑائیاں جس طرح ہوا کرتی تھیں ان سے آپ ناواقف نہیں ہیں۔ میدان جنگ میں فوجیں صف آرا ہو کر کھڑی ہوتی تھیں تو ایک فریق کی طرف سے ایک سپاہی اور دوسرے فریق کی طرف سے دوسرا سپاہی فوج سے نکلتا تھا۔ اور آپس میں جنگ کرتا تھا کبھی ایسا ہوتا تھا کہ انہیں کی فتح یا شکست کو پوری فوج کی فتح یا شکست تسلیم کر لیا جاتا تھا اس کے بعد دوسرے دور میں تیروں اور تلواروں سے حملے کئے جانے لگے اور فوجیں دست بدست لڑنے لگیں۔ ایسی لڑائیوں میں بھی زیادہ جانیں ضائع نہیں ہوتی تھیں اس کا سبب یہ ہے کہ تیر کا نشانہ ایک مرتبہ ایک ہی آدمی کو اپنی زد میں لا سکتا ہے۔ اور تلوار

بھی ایک وقت میں ایک ہی شخص پر حملہ کر سکتی ہے اس میں شک نہیں کہ مہابھارت کے زمانہ میں ہم "شکتی بان" وغیرہ جیسے اسلحہ کا تذکرہ سنتے ہی جو ایک حملہ میں یک سے زیادہ آدمیوں کی ہلاکت کا باعث ہو سکتے تھے مگر یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جب تک گندھک شورہ اور کاربن کے مرکب سے بارود نہیں ایجاد کیا گیا تھا اس وقت تک دنیا میں کوئی جنگ ایسی تباہی اور ہلاکت کا باعث نہیں ہوتی تھی جیسی کہ اب ہونے لگی ہے۔

"اسلحہ بندی" پر بات چیت کے سلسلہ میں اگر ہم کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ جس شخص نے بارود ایجاد کیا وہ انسانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ بارود کی ایجاد کی تاریخ مشتبہ ہے کسی مؤرخ کا خیال ہے کہ بارود اور بندوق دونوں قدیم چینیوں کی ایجاد ہے اور مشہور حکمت چین کی پیداوار ہے جیسا کہ ایک پرانے مصرع میں کہا گیا ہے۔

حکمت چین کے صندوق سے نکلی بندوق

لیکن مغربی مورخین کہتے ہیں کہ بارود پہلے پہل یورپ ہی میں ایجاد کیا گیا اور کام میں لایا گیا یہ لوگ برطانیہ کے ایک ماہر حکمت راجر بیکن Roger Bacon کو بارود کا موجد بتلاتے ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ اس ملک میں پہلا توپ خانہ بابر کے ساتھ آیا تھا مگر جس چیز کو اسی زمانے میں توپ خانہ کہا جاتا تھا۔ وہ آجکے توپخانوں کے مقابلہ میں ایسا ہی تھا جیسے کسی جرمن کی بندوق کے سامنے ایک معمولی سا چینی پٹاخہ۔ بہرحال اس وقت کے لئے یہ معمولی قسم کی توپ بھی بہت بڑی چیز تھی اور لاکھوں تلواروں تیروں اور برچھیوں کے مقابلہ میں اگر کوئی فوج صرف ایک دو توپوں ہی سے مسلح ہوتی تھی تو ان کے گولوں کی آتشبازی اور گھن گرج صداؤں کے باعث دشمن کی فوج پر فتح حاصل کر لیتی تھی۔

دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلحہ بندی کے سامان میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ چنانچہ ایک وقت ایسا آیا جب پرانے زمانہ کی بندوقیں اور توپیں بھی جدید توپوں کے مقابلہ میں بیکار اور بے اثر ثابت ہونے لگیں اور یورپ کی مختلف قوموں نے اسلحہ بندی کے نئے نئے ساز و سامان پیدا کرنے شروع کر دئے۔ اس کے بعد انیسویں صدی نے صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کے لئے ایک انقلاب عظیم اپنے دامن میں لائی اور سائنس کی نئی نئی دریافتوں اور ایجادوں نے لوگوں کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا اور دنیا کی زندگی اور معاشرت اور طریقۂ جنگ کا نقشہ بالکل بدل ڈالا۔

انیسویں صدی کے آخری حصہ میں سائنٹفک تحقیقاتوں نے بڑی ترقی کی لیکن اس ترقی نے اگر ایک طرف دنیا کو بہت فائدہ پہنچایا تو دوسری طرف انسانی ہلاکت کے نئے نئے سامان وجود میں آنے لگے۔ اور یورپ کی قوموں نے اپنے آپ کو جنگ کے لیے ایسے حربوں سے مسلح کرنا شروع کیا کہ عالمگیر امن خطرہ میں پڑ گیا۔ اور لوگوں میں اندرونی بے چینی اور خوف و ہراس پھیلنے لگا کسی ملک کو کسی دوسرے ملک پر اعتماد باقی نہ رہا۔ اور ہر ایک زیادہ سے زیادہ مسلح ہونے میں مصروف ہو گیا۔ اسلحہ بندی کی اس کوشش اور سرگرمی کے دوران میں نئی نئی قسم کی توپیں مشین گنیں آبدوز کشتیاں جہازوں کو تباہ کرنے والے مائن (mines) اور تارپیڈو وغیرہ وجود میں آ گئے۔ اور پھر ہوائی جہاز کی ایجاد ان تمام ایجادوں

پر بالا ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس کے ذریعہ نہ صرف دشمن کی فوجوں
پر بلکہ [illegible] اور صنعتی کارخانوں پر بھی بم اور گولے برسا کر دشمن
کے ملک میں خوف و ہراس پھیلانا اور لوگوں کو طرح طرح کی تباہی
و بربادی میں مبتلا کرنا آسان ہوگیا۔

اس بات چیت کے دوران میں اگر ہم یہ بحث چھیڑ دیں کہ
آیا اسلحہ بندی سے جنگ پیدا ہوتی ہے یا جنگ کا امکان اسلحہ بندی
کا باعث ہوتا ہے تو سلسلہ گفتگو بہت طویل ہو جائے گا لیکن اتنا تو ظاہر
ہے کہ جب مختلف ممالک میں جنگ کا بہت سا سامان اکٹھا
ہو جاتا ہے تو آپس میں بداعتمادی پھیلتی ہے اور خوف و ہراس کے
باعث جنگ کے شعلے جلد نمودار ہو جاتے ہیں۔ بیسویں صدی
کی ابتدا اسی سے ہوئی کہ یورپ کا ہر ملک دوسرے ملک کو شک و
شبہ کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور تمام قومیں ایک دوسرے سے
چھپ چھپ کر سائنس کی جدید دریافتوں کو اسلحہ سازی کے کارخانوں
تک پہنچانے میں مصروف تھیں چنانچہ اسی صدی کے چودہ برس
بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ جنگ عظیم کا شعلہ دنیا میں بھڑک اٹھا۔
اس جنگ کے تمام شریکوں نے جہاں تک ان کے امکان میں تھا
نئے نئے آلات حرب و جنگ سے کام لیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے
کہ اسی جنگ نے دنیا پر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ مستقبل کی زیادہ تر
لڑائیاں زمین اور سطح سمندر پر نہیں بلکہ ہوا میں لڑی جائیں گی
اور ہوائی جہاز کی ایجاد نے جنگجو قوموں کے ہاتھ میں تباہی و
ہلاکت کا سب سے زیادہ خطرناک آلہ دیدیا ہے گزشتہ جنگ عظیم
میں ہوائی جہازوں کے ذریعہ نہ صرف بم اور گولے برسائے گئے
بلکہ سائنٹیفک تجربوں سے حاصل کی ہوئی زہریلی اور مہلک گیسیں
[illegible] جنگ عظیم ان جدید آلات حرب
کی پہلی تجربہ گاہ تھی اس لئے ان کو بہت زیادہ کام میں نہیں لایا گیا تھا

پھر بھی ان سے پیدا ہونے والے خطرات کا مزا انسانوں نے اچھی طرح
چکھ لیا تھا۔ جنگ عظیم میں لندن والوں پر جو پہلا ہوائی حملہ ہوا تھا اس
کی یاد تازہ کراتے ہوئے پچھلے دنوں لندن کے اخبار
Evening Standard نے غم آلودہ
سالگرہ کے نام سے ایک مضمون لکھا تھا اس کے چند فقرے
آپ کو سناتا ہوں۔ سنئے اخبار مذکور لکھتا ہے:۔

"اب سے ۲۲ برس پہلے آج ہی کے دن دشمن کے بمبار
ہوائی جہاز نیلے آسمان میں ٹھیک لندن کے اوپر نمودار ہوئے
تھے لندن میں لوگ اس وقت طرح طرح کی مصروفیتوں میں تھے
بچے اسکولوں میں گئے تھے مائیں سودا سلف خریدنے گھروں سے
نکلی ہوئی تھیں۔ موٹریں، بسیں، اور ریل گاڑیاں مسافروں کو
لئے ادھر سے ادھر جا رہی تھیں۔ تھیٹروں کے باہر نئے تماشوں
کے اشتہارات چسپاں کئے جا رہے تھے کہ اتنے میں آسمانی فضا سے
بم برسنے لگے اس ہوائی حملہ سے ۱۶۲ انسان موت کا شکار ہوئے
تھے اور ۴۳۲ زخمی ہوئے تھے اٹھارہ بچے جن کی عمریں بارہ برس
سے زیادہ نہ تھیں ماں باپ کو داغ مفارقت دے گئے تھے:

یہ ہوائی حملہ کی تباہ کاری کا ایک مختصر خاکہ ہے آج ہوائی جہازوں
کی پرواز اور بمباری کی طاقت پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے
اور زہریلی گیسوں کی بارش ان کا سب سے زیادہ ہلاکت آفریں
عمل ہے ۱۹۱۵ء میں جرمنی میدان جنگ میں ایک نئی
گیس لایا تھا اس کا نام طور دیکہ [illegible] Chloro Picrine
ہے اس کے ناک میں پہنچتے ہی انسان کو قے بہت زور سے
آتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنا گیس ماسک یعنی گیس سے بچنے والی
نقاب کو اتار پھینکتا ہے پھر اسی طرح کی بہت سی [illegible]
گیسیں جن میں دم گھٹنے والی اور بے ہوش کرنے والی [illegible] گئیں۔

اب آپ ہی غور کیجئے کہ "اسلحہ بندی" کس حد تک پہنچ گئی ہے اور دنیا میں اسی سے کیا کیا خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں - ان خرابیوں کے دو بہت ہی نمایاں پہلو یہ ہیں کہ ایک تو "اسلحہ بندی" کا مقابلہ دنیا کی قوموں میں خود بخود جنگ کا جذبہ پیدا کرتا ہے کیونکہ یہ ہر حال میں اسلحہ جات بنتے ہی اس لئے ہیں کہ جنگ میں کام آئیں اور دوسرے یہ کہ جس قدر روپیہ اسلحہ بندی پر خرچ کیا جاتا ہے اسلحہ کی تخفیف سے یہ روپیہ بچا کر زیادہ تر تعمیری کاموں پر اور دنیا کی حالت کو بہتر بنانے پر صرف کیا جا سکتا ہے اس بات چیت میں اتنی گنجائش تو ہے نہیں کہ تمام ممالک کے فوجی بجٹ اور تعمیری کاموں کے بجٹ کی پوری تفصیل بیان کی جا سکے لیکن یہاں پر میں ایک بہت ہی دلچسپ مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں پروفیسر نکولس بٹلر - برطانیہ کے ایک ماہر اعداد و شمار ہے انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ گزشتہ جنگ عظیم میں چار لاکھ میلین ڈالر یعنی ایک ارب پچیس کروڑ روپیہ سے کچھ زیادہ ماہوار خرچ ہوا تھا اس روپیہ سے کوئی مفید کام برآمد نہیں ہوا - لیکن اگر یہ رقم جنگ آزما ممالک کے تعمیری کاموں پر صرف کی جاتی تو جرمنی فرانس بلجیم، روس، انگلستان، کناڈا، آسٹریلیا اور ولایات متحدہ امریکہ کے ہر خاندان کے لئے حسب ذیل چیزیں مہیا کی جا سکتی تھیں - آپ ہر خاندان کے لفظ کو یاد رکھیں اور پھر چیزوں کی فہرست کو سنیں - وہ چیزیں کیا ہوتیں -

۱ ۵ - ایکڑ زمین ۲ چھ ہزار پانچسو روپیہ کی لاگت کا ایک مکان ۳ دو ہزار چھ سو روپیہ کی لاگت کا فرنیچر - اس کے علاوہ ہر بڑے شہر میں حسب ذیل انسٹی ٹیوشنوں کا قیام - ایک کروڑ تینتیس لاکھ روپیہ کی لاگت کا ایک کتب خانہ - دو کروڑ ساٹھ لاکھ کی ایک یونیورسٹی - اسکولوں اور کالجوں میں ۲۵ پچیس ہزار نئے استادوں اور ہسپتالوں کے لئے پچیس ہزار نئی نرسوں کی تنخواہیں اور پھر جو کچھ بچ جاتا اس رقم سے تمام باشندوں کو آسانی سے کھانا اور کپڑا مہیا کیا جا سکتا تھا آپ خود غور فرمائیے کہ یہ اعداد و شمار کس قدر سبق آموز ہیں -

اس جنگ عظیم کے بعد یہ نہیں ہوا کہ آئندہ جنگ کا دروازہ بند ہو جاتا بلکہ بعض ایسے معاہدوں کے باعث جن سے دوسری قومیں اور خصوصاً جرمنی مطمئن نہ تھا اسلحہ بندی کا ایک دور جاری تھی - اور اس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ وہ معاہدے بھی ردی کاغذ بن کر رہ گئے چونکہ قوموں میں بے اعتمادی پھیلی ہوئی تھی اس لئے اسلحہ بندی کی ایک ایسی دوڑ جاری ہو گئی جو پہلے سے بہت زیادہ خطرناک تھی - "مسلح حفاظت" کا جسے Armed Security کہتے ہیں - ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس سے متضاد نتیجہ پیدا ہوتا ہے - یعنی اپنی حفاظت کے لئے ہم مسلح ہوتے ہیں - لیکن یہی عمل ہمیں خود غیر محفوظ بنا دیتا ہے اور جنگ کا امکان پیدا کر دیتا ہے اس خطرناک صورت حال کو دیکھ کر کہ ہر ملک میں اسلحہ سازی کے تمام کارخانے اور سائنس کی تمام لیبوریٹریز صرف نئے نئے سامان جنگ ہی کو تیار کرنے اور ایجاد کرنے میں مصروف ہو گئی ہیں - بعض ممالک نے "تخفیف اسلحہ" کی کانفرنسوں کی تجویز پیش کی - چنانچہ اس سلسلہ میں "واشنگٹن کانفرنس" اور "لندن کانفرنس" بہت اہم سمجھی جاتی ہیں - لیکن تخفیف اسلحہ کی جتنی کانفرنسیں ہوئیں وہ گھوڑ دوڑ کا ایسا میدان ثابت ہوئیں - جس میں ہر نمائندے نے اپنی قوم کے لئے زیادہ ملٹری اور جنگی فائدہ حاصل کرنے اور دوسروں کو تخفیف اسلحہ کا وعظ سنانے کی کوشش کی - اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا یعنی - ۶ سمندر تازیانہ اک اور تازیانہ ہوا -

اور کسی ملک نے اپنی اسلحہ سازی کے پروگرام میں کمی نہ کی بلکہ کچھ اور اضافہ ہی کر دیا۔

اب یہ حال ہے کہ دنیا میں ہر طرف سامان جنگ اور آلات حرب کے انبار لگائے جا رہے ہیں اور تباہی و ہلاکت کی نئی نئی اسکیمیں زیر غور ہیں۔ شبہات، تعصبات اور بد اعتمادی نے ایک نیا زور پکڑ لیا ہے۔ اٹلی کے منصوبے اور اسپین کی خانہ جنگی جاپان کا چین پر دھاوا اور روسی جھگڑے کا امکان، اور جرمنی کا آسٹریا پر قبضہ اور زیکوسلواکیا پر دانت یہ تمام چیزیں اسی اسلحہ بندی کی نئی دوڑ کا نتیجہ ہیں اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس وقت اٹلی جرمنی اور جاپان کی زیادتیوں اور روم برلن ٹوکیو ایکسس ([illegible]) نے دنیا کو زیادہ خطرے میں ڈال دیا ہے۔ بہرحال سردست یہ بحث ہمارے موضوع سے باہر ہے۔

اسلحہ بندی کی یہ دوڑ کس انتہا تک پہنچ گئی اس کا جواب دنیا ممکن نہیں ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یورپین ممالک میں اسلحہ سازی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے ۱۹۳۶ء کے دوران میں تمام قومیں زیادہ سے زیادہ مسلح ہوتی رہی ہیں اور یہ اسلحہ سازی ایسے وسیع پیمانہ پر جاری رکھی گئی ہے کہ اس سے پہلے انسان کو کبھی اس کا تخیل و تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ جنگ عظیم کی تمام تیاریاں اس کے مقابلے میں ہیچ اور معمولی تھیں۔ صرف یہی نہیں کہ ملٹری سروس کے اخراجات بہت زیادہ ہیں اور جدید اسلحہ جات بجید خطرناک اور ہلاکت آمیز ہیں۔ بلکہ ان تمام ممالک میں جو اسلحہ سازی میں زیادہ پیش پیش ہیں۔ یہ انتظام کیا جا رہا ہے کہ سارے ملک میں ایک شدید ترین جنگی اسپرٹ پیدا کی جائے اس کے باعث دونوں جنسوں کو یعنی مردوں اور عورتوں کو، تمام طبقوں کو تمام بوڑھوں، نوجوانوں، بچوں، کمزوروں اور بیماروں کو مصیبت اور ہلاکت کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ چونکہ اسلحہ بندی کا پروگرام خاص طور پر تیز کر دیا گیا ہے اس لئے اسلحہ ساز کمپنیوں اور کارخانوں کی پیداوار اور کاروبار میں بھی اضافہ ہو گیا ہے اور غالباً اس وقت دنیا کی یہی ایک تجارت ہے جس کا منافع سب سے زیادہ یقینی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ فروری ۱۹۳۷ء میں برطانیہ نے جوں ہی سامان جنگ کی فراہمی کے لئے چالیس کروڑ پونڈ قومی قرضہ کا اعلان کیا اسلحہ ساز کمپنیوں کے حصوں کی قیمت تیزی سے بڑھ گئی۔

اپنی اسلحہ بندی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے تمام اسلحہ ساز ممالک کے پاس ایک ہی بہانہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ "ہماری پڑوسی قومیں مسلح ہو رہی ہیں" صرف جرمنی میں جس قدر لوگ ۱۹۱۴ء میں مسلح تھے۔ ان سے دس لاکھ زیادہ اس وقت ہتھیار بند موجود ہیں۔ اور آسٹریا پر قبضہ کرنے کے بعد جرمنی کا تازہ ترین شاہکار یہ ہے کہ زیکوسلواکیہ کو خوف زدہ کرنے کے لئے ایک بہت بڑا فوجی مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ جس میں بڑی بڑی بری فوجیں اور مسلح ہوائی دستے حصہ لیں گے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ جرمنی نے اپنی بحری اسلحہ بندی کے پروگرام کا اعلان کیا ہے۔ جس میں دو بڑے جنگی جہاز وزنی ۳۵ ہزار ٹن دو جنگی جہاز وزنی ۲۶ ہزار ٹن، تین مسلح کروزر وزنی ۱۰ ہزار ٹن۔ تین چھوٹے کروزر وزنی ۶ ہزار ٹن ۶ تباہ کن کشتیاں ۲۶ مائن رکھنے والی کشتیاں ۱۱ تارپیڈو بوٹ اور ۶۶ آبدوز کشتیاں شامل ہیں۔

روس کو دیکھئے تو اس کی تازہ ترین اسلحہ بندی دنیا کے لئے حیرت کا باعث بنی ہوئی ہے اس وقت اس کے پاس ساڑھے سترہ لاکھ مسلح سپاہیوں کی فوج موجود ہے اس کے علاوہ ایک کروڑ پچاس لاکھ روسی ہیں جو "ریزرو" فوجوں کی حیثیت سے وقت پر فوراً مسلح کر کے میدان جنگ میں لائے جا سکتے ہیں۔

روس کا ہوائی بیڑہ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ مضبوط اور مکمل مانا جاتا ہے اس میں چار ہزار اپ ٹو ڈیٹ مسلح ہوائی جہاز موجود ہیں روس میں ہوائی پائلٹوں کی تعداد ڈھائی لاکھ اور زنانہ پائلٹوں کی تعداد ایک لاکھ ہے۔ پچھلے دنوں مانچوکو کی سرحد پر روس سے جو لڑائی ہوگئی تھی۔ اس کے لئے روس نے چار لاکھ سپاہی چار ہزار ٹینک نو سو ہوائی جہاز اور بموں اور زہریلی گیسوں کا مکمل سامان آن کی آن میں بھیج دیا تھا۔ اسی سے روسی اسلحہ بندی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

برطانیہ میں جدید پروگرام کے ماتحت پانچ بڑے جنگی جہاز تعمیر کئے جارہے ہیں۔ مسٹر ہیور بیلیٹ وزیر جنگ نے ایک تقریر میں اعلان کیا ہے کہ یہ ملک آج کل اسلحہ سازی پر دس لاکھ پونڈ روزانہ خرچ کر رہا ہے۔ صرف ہوائی حملوں کے مقابلے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے گئے ہیں ان میں چالیس ہزار آدمی کام کررہے ہیں۔ جاپان کا جدید ترین ملٹری بجٹ ۸۰ کروڑ تینتیس لاکھ پونڈ پر مشتمل ہے۔ اور ولایات متحدہ امریکہ کے محکمہ جنگ نے بھی چار بڑے جنگی جہازوں کے بنانے کا اور اپنی ہوائی طاقت میں تین سو ہوائی جہازوں کے اضافہ کا اعلان کیا ہے۔

ہزاروں میں سے ان چند اعداد و شمار کو اس بات چیت کے سلسلہ میں پیش کرنے سے میرا مقصد یہ بتلانا ہے کہ جس چیز کو ہم "حفاظت" کہتے ہیں۔ وہ دنیا کو آج کس قدر مہنگی پڑ رہی ہے اور عوام پر اس کا بار کتنا زیادہ ہوگیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جرمن ہو یا اٹلی، روس ہو یا جاپان، برطانیہ ہو یا امریکہ، ہر ایک ملک میں فوج و اسلحہ کے تمام اخراجات پبلک ٹیکس ہی سے پورے کئے جاتے ہیں اور بجٹ کا ایک بڑا حصہ سامان جنگ کی تیاری اور بری بحری اور ہوائی طاقتوں کے قیام پر خرچ کیا جاتا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس اسلحہ بندی کی انتہا کیا ہوگی۔ لیکن اتنا تو ظاہر ہے کہ اسلحہ بندی اس دنیا کی بدترین لعنتوں میں سے ایک ہے۔ کیا اس سے کبھی ہمیں چھٹکارا حاصل ہوسکے گا؟ اس کا جواب غالباً ایک صدی بعد کا مورخ دے گا۔

تاثرات

(از جناب خان بہادر مرزا جعفر علی خانصاحب اثر لکھنوی ۔ کلکٹر بلیا)

اشکِ گلرنگ، چمن سازِ گریباں نہ ہوا
تجھ سے اتنا بھی تو اے دیدۂ گریاں نہ ہوا

پھر جنوں عشق کی تکمیل نہیں، سودا ہے
صورتِ صبح اگر چاک گریباں نہ ہوا

جو بھی لکھا انھیں، بے ربط و پریشاں لکھا
نامۂ شوق کا قائم کوئی عنواں نہ ہوا

پھر ادھر دیکھ لے، برگشتہ مژہ کا صدقہ
ایک ناوک بھی تو پیوستِ رگِ جاں نہ ہوا

ہاں ذرا میں بھی سنوں، کون وہ خوش قسمت ہے
جس نے دل تم کو دیا اور پشیماں نہ ہوا

گمرہی میں بھی وہ لذت ہے کہ اللہ اللہ
طے جو مجھ سے نہ ہوا جادۂ عرفاں نہ ہوا

محرمِ شوخیٔ جلوہ نہیں آنکھیں، ورنہ
کبھی پنہاں وہ ہوا تھا کہ نمایاں نہ ہوا!

ہے یہی کفر محبت کے پرستاروں میں
عشق اگر عشق کی عصمت کا نگہباں نہ ہوا

مار ڈالے گی وہ مژگاں سرشک آلودہ
دل اگر کشتۂ "انداز پشیماں" نہ ہوا

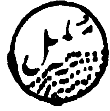
شیشہ و ساغر و مینا کے طلبگار بہت
ایک ٹوٹے ہوئے دل کا کوئی خواہاں نہ ہوا

تجکو ساحل کی تمنا رہی، نادان اثر
بحر میں ڈوب کے منجملۂ طوفاں نہ ہوا

(علیہ کرم مجنوں گورکھپوری)

خاص تنویر کے لئے

یادِ ایّام





۵ردسمبر

اُف! یہ تین ماہ کی قیدِ بستر بھی کیسی بھیانک اور دم گھٹانے والی تھی! ــــ کیا قیدِ فرنگ اس سے زیادہ جانکاہ ہوتی ہوگی!۔ میں کسی طرح نہیں مان سکتا۔ چکی کی مشقت کم سے کم انسان کے جسم میں خون کا دوران تو قائم رکھتی ہے۔ لیکن بستر پر پڑے پڑے تو آدمی پتھر ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مریض اپنے مرض سے کبھی اتنا نہیں گھستا جتنا پابندِ بستر ہو کر گھٹتا اور ضائع ہوتا ہے۔

اپنی اس طویل اور لاطائل بیماری پر غور کرتا ہوں تو بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ کچھ کرتے نہیں بنتا اس لئے کہ دوسروں کے ہاتھ میں ہوں اور یہ دوسرے ایسے ہیں۔ جن کو میں آزردہ یا مایوس کرنا نہیں چاہتا۔

پچھلی نشست میں بتا چکا ہوں کہ میں نے ایک کل بیٹھے بیٹھے صبح کر دی تھی اور میری پیٹھ میں درد ہونے لگا تھا۔ اسی درد نے یہاں تک طول کھینچا۔ دو چار روز تک تو میں یونہی ٹالتا رہا لیکن ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ درد کے ساتھ ساتھ تیز بخار بھی ہے اور میں مجبور ہوں کہ پلنگ پر لیٹا رہوں۔ شام کو چودھری نبی احمد مع بیگم اور مروارید کے آئے۔ اور مجھے پڑا ہوا دیکھ کر گھبرا گئے۔ مروارید میری بیماری سے ہمیشہ ڈرتی ہے اس لئے کہ اس کا خیال ہے مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں ہے اور جب تک بیماری پیمانۂ ضبط سے اِک دم باہر نہ ہو جائے میں اس کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

غرضکہ چودھری نبی احمد فوراً جا کر ڈاکٹر بُلا لائے۔ ڈاکٹر نے بڑے غور اور بڑے اہتمام کے ساتھ دیر تک میرا معائنہ کیا اور بڑی سنجیدہ اور اندیشہ ناک صورت بنا کر کہا "آپ کو تو پلیورسی یعنی ذات الجنب ہے اور کافی پُرانی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ جھلی دُور تک متاثر ہے۔ آپ کو نہ صرف جم کر علاج کرنا چاہئے بلکہ بڑی احتیاط اور پرہیز کی ضرورت ہے کم سے کم دو ڈھائی مہینے آپ کو پلنگ پر آرام کرنا چاہئے اور اس کے بعد بھی محنت کے کام سے پرہیز کرنا چاہئے۔"

ڈاکٹر کی زبان سے یہ فیصلہ سُن کر سب کے سب پریشان ہو گئے۔ مروارید کی صورت دیکھنے کی قابل تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ بس اب رو دے گی۔ اس نے کسی قدر جھلاہٹ کے ساتھ کہا "ان کو تو شکنجہ میں کس دیا جائے میں جانتی تھی کہ یہ ایک نہ ایک دن اسی طرح اپنی جان کا خطرہ مول لے کر رہیں گے......"

میں نے کہا "تم لوگ ناحق پریشان ہوتی ہو۔ ڈاکٹر کا کام یہ ہے کہ وہ مرض کی اہمیت پر اسی طرح زور دے تاکہ مریض اس کی ہدایتوں کو اس کان سے سُن کر اس کان اڑا نہ دے۔ ورنہ میرا خیال ہے مجھے کوئی ایسا خطرناک مرض لاحق نہیں ہے......"

"بس اب آج سے آپ اپنے خیال کو خدا کے لئے زیادہ دخل در معقولات نہ کرنے دیجئے" مروارید نے تیور کے ساتھ کے ساتھ میری بات کاٹ دی۔ اب میں ڈاکٹر صاحب کی طرف مخاطب ہوا اور ان سے کہا "ڈاکٹر صاحب! سنئے تم کی بیماری...

ہیں تو کچھ نزاکت اور امارت کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔" مجھے اس سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو بیکار اور فراغت نصیب طبقہ کی بیماری ہے۔" ڈاکٹر صاحب بھی طنز سے ناواقف نہیں تھے۔ فوراً جواب دیا "مجھے اس بحث سے زیادہ سروکار نہیں ہے کہ یہ بیماری کس طبقہ کے ساتھ مخصوص ہے اور آپ کو اس سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ میں نے تو صرف اپنے معائنہ کے نتیجہ سے آپ کو آگاہ کر دیا اور وہ یہ کہ آپ کو پلیوسی ہے اور اگر آپ نے شدید احتیاط نہ برتی تو آپ کے پھیپھڑوں پر بہت جلد اثر ہو جائے گا!"

مجھے ان کے تلخ لہجہ پر لطف آ گیا میں مسکرا دیا۔ اور سب میرے ساتھ مسکرانے لگے۔ لیکن مرواریدکے ہونٹوں پر کوسوں تک مسکراہٹ کا پتہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر نسخہ لکھ کر اور ہدائتیں دے کر چلے گئے تو مروارید نے چودھری نبی احمد سے مخاطب ہو کر کہا "میری رائے میں تو یہ ہوگا کہ ان کو ہم اپنے گھر لے چلیں اور میں یا آپ ان کے سر مسلط رہیں اور پھر ان کو کبھی تنہا نہ رہنے دیں ورنہ یہ نہ جانے کیا کر ڈالیں گے...... !"

اور آخر کار یہی ہوا۔ آج تین ماہ سے میں چودھری نبی احمد کے گھر ہوں جہاں تمام آرام و سکون کے باوجود میرا جی اسی طرح گھبرا رہا ہے جس طرح آدم اور حوا کا جی جنت میں گھبراتا رہا ہوگا۔ سارا گھر میرے لئے ایک محکمۂ احتساب بنا ہوا ہے۔ مروارید میری ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھتی ہے اور ہر بات کا جائزہ لیتی رہتی ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ یہ سب انتہائی محبت سے مجبور ہو کر کر رہی ہے لیکن محبت کبھی کبھی قید ہو کر رہ جاتی ہے اور ایسی حالت میں سوہانِ روح ہونے لگتی ہے۔ میں کبھی کبھی مروارید سے الجھ جاتا ہوں اور تند مزاجی کے ساتھ کہہ دیتا ہوں کہ کسی کی خبر گیری بھی اسی حد تک کرنا چاہئے جہاں تک گوارا ہو سکے۔ تم نے میری ہی سہی زندگی کو وبال بنا کر رکھ دیا ہے۔"

لیکن مروارید کو نہ میرے طنز کی پروا ہے نہ میری خوشامد کی۔ وہ ہر وقت اسی طرح مجھ پر مسلط رہتی ہے۔ خود دن رات میرے پیچھے ستی رہتی ہے اور میرا بھی دم ناک میں کئے رہتی ہے۔ مجھے ابھی دھیمی دھیمی حرارت رہتی ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ خطرے سے گزر گیا ہوں لیکن ابھی علاج اور پرہیز کی سخت ضرورت ہے۔ مروارید ڈاکٹر کی ہدایتوں پر حرف بہ حرف ایمان رکھتی ہے۔ آج بڑی بڑی مشکل سے اس کو اس پر راضی کر سکا ہوں کہ پندرہ بیس منٹ تکیہ کے سہارے بیٹھ کر تھوڑا سا اپنا روزنامچہ لکھ لوں۔

عذرا کے ساتھ میری زندگی کے بہترین دن گزرے۔ اس سے نہ میں انکار کر سکتا ہوں نہ عذرا۔ البتہ یہ دن کچھ خارجی کچھ داخلی اسباب کی وجہ سے بہت تھوڑے رہے۔ مجھے پہلے ہی روز سے یہ احساس تھا جو روز بروز بڑھتا گیا کہ میں نے غلط جگہ سودا کیا۔ ایک طرف تو مجھ یقین تھا کہ اب عذرا سے بے تعلق ہونا میرے لئے بے انتہا مشکل بات ہوگی۔ عذرا ایسی چیز نہیں تھی جس کو دیکھ کر انسان اس کی تمنا سے مجبور نہ ہو جائے۔ اس کے اندر جو خامیاں تھیں بھی وہ مزاج اور طبیعت کی نہیں بلکہ ماحول اور تربیت کی تھی۔ مثلاً اس کے اندر امارت کی وہی خو بو تھی جو ہمارے طبقۂ اعلیٰ اور طبقۂ اوسط کے ہر شخص میں پیدا ہوتی ہے۔ اور جس کے لئے اس کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ غریب کسانوں اور فاقہ مست مزدوروں کے ساتھ میرے بڑھے ہوئے انہماک کو دوسروں کی طرح وہ بھی ایک قسم کا شاعرانہ خبط سمجھتی تھی یہ اور بات تھی کہ چونکہ اس کو میری ہر ادا لطیف اور دلکش معلوم ہوتی تھی اور وہ میرے دماغ کی قائل تھی اس لئے وہ دوسروں کی طرح میری کسی بات کی ہنسی نہیں اڑاتی تھی۔ لیکن جب کبھی مجھے کسی سے "رموز مملکت" یعنی

معاملات زمینداری پر شدید اختلاف ہو جاتا تھا اور میں اسامیوں کی
طرفداری میں اڑ جاتا تھا تو وہ اکثر دبی زبان اور دبے لہجہ میں مجھے
علیحدہ سمجھایا کرتی تھی۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس کو غریبوں اور
محتاجوں پر ترس لاکھ آئے مگر وہ ان کے ساتھ سچی ہمدردی کرنے کی
صلاحیت نہیں رکھتی۔ یہ میرے لئے بڑے دکھ کی بات تھی۔ کبھی کبھی میں اس سے
جھلا بھی جاتا تھا۔ لیکن پھر اس خیال سے چپ ہو جاتا تھا کہ یہ تربیت کا
قصور ہے۔ اگر عذرا کی تعلیم میری طرح ہوئی ہوتی اور وہ یہ دیکھنے اور سمجھنے
کی صلاحیت رکھتی کہ دنیائے انسانیت کی رفتار کیا رہی ہے اور اب اس کے
میلانات کیا ہیں تو وہ یقیناً مجھ سے زیادہ قریب ہوتی یا اگر اس کو میرا
ایسا کوئی رفیق مل جاتا جو اس کا زندگی بھر کا ساتھی ہوتا۔ تو اس کی تربیت
کر کے اس کے رجحانات کو بدل سکتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے اندر جوہر
قابل موجود تھا۔ عذرا کی فطرت میں جتنے لطیف عناصر تھے ان کی اگر
تہذیب و تحسین خاطر خواہ ہوئی ہوتی تو وہ نہ جانے کیا ہوتی۔ پھر بھی اپنی شخصیت
اور اپنے مزاج و مذاق کے اعتبار سے وہ دوسروں سے بہت بلند چیز
تھی۔ کم از کم اپنے خاندان میں تو میں اس سے بہتر عورت کا تصور نہیں
کر سکتا تھا۔ بہرحال میں اپنے کو بُری طرح عذرا کا مبتلا پا رہا تھا۔

لیکن دوسری طرف جانتا تھا کہ یہ "کوئے جاناں" کی زمین ایک نہ
ایک دن آسمان بن کر مجھے رنج پہنچائے گی۔ جس گھر میں عذرا آئی تھی اس
سے میرے خون اور میرے مزاج دونوں کو بغاوت تھی۔ عذرا کے خیال
سے میں لاکھ دوسروں سے مصالحت کئے رہنا چاہوں۔ لیکن آخر
بنائی ہوئی بات کب تک نبھے گی۔ یہ خیال نہ صرف مجھ کو ستا رہا تھا
بلکہ عذرا کے دل میں بھی یہی چور تھا۔ جس کا کبھی کبھی وہ دکھے ہوئے
لہجہ میں اظہار بھی کر دیتی تھی۔ اس تمام خلش کے باوجود میں عذرا کی
محبت کو اپنی زندگی کا سب سے زیادہ خوش آئند واقعہ سمجھ رہا تھا۔ اور اس کے
ساتھ اس طرح محو تھا کہ کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ ایک مرتبہ بیگم عزیز نے
بہت متاثر ہو کر کہا تھا۔ "شہاب صاحب کی ساری زندگی ایک غزل ہے"
اگر اس تشبیہ کو تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے تو میری زندگی
کا وہ حصہ جو عذرا کے ساتھ گزرا یقیناً "بیت الغزل" کا حکم رکھتا ہے۔

بس اس وقت اس سے زیادہ لکھنے کی اجازت نہیں ہے
مروارید پہنچ گئی اور مجھے بستر پر جانے کا آمرانہ حکم مل گیا۔ اب میں
چاہے اس سے حجت و تکرار کروں چاہے چپ چاپ اس کے حکم
کو مان لوں۔ لکھنا بہرحال ناممکن ہے۔

۱۴ر دسمبر

اس ہفتہ مجھے پھر حرارت کچھ تیز رہی۔ اگرچہ بقول ڈاکٹر کے
کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن مروارید کے لئے اتنا کافی ہے
وہ اب مجھے چار پائی سے ہلنے نہیں دیتی۔ مروارید کی محبت کا بہ
دل پر گہرا نقش ہے۔ ایک تو یہی کیا کم تھا کہ اس کے گھر والے
اس وقت میرے علاج میں اس طرح روپیہ صرف کر رہے ہیں۔ اس پر
سے مروارید کا میرے پیچھے اپنے کو اس طرح ہلکان کرنا! ۔ جتنی
دیر گھر پر رہتی ہے۔ ہر لحظہ میرے قریب رہتی ہے اور اگر کوئی اور
نہ ہو تو مجھ سے لپٹی ہوئی پیار کیا کرتی ہے۔ میں ہزار سمجھاتا ہوں کہ
"مروارید ہر وقت میرے منہ سے منہ ملائے رہو گی تو تم کو بھی
یہی بیماری ہو جائے گی" مگر وہ کسی طرح نہیں مانتی اور اس کو میرا
وہم کہتی ہے۔

آج مروارید اپنی ماں کے ساتھ بیگم عزیز کے وہاں دعوت
میں گئی ہے اور ۹ بجے رات کو واپس آئے گی۔ شام کو چلتے چلتے
تاکید کر گئی ہے کہ میں اپنے کو تھکاؤں گا نہیں اور میں نے اس کو
ہر طرح اطمینان دلا دیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ روزنامچہ لے کر
نہیں بیٹھوں گا۔ مگر اب تو ۹ بجے تک میں تنہا ہوں اور وقت [illegible] ہے۔

دو ڈھائی مہینے کی چھٹیاں اب ختم ہونے کو تھیں۔ میں نے اس کو بڑی مسرت کی حالت میں گزارا۔ میری ماں کا دل باغ باغ ہو رہا تھا کہ بچے میں اتنے دنوں تک مسلسل گھر پر رہا اور وہ رہ رہ کر عذرا کو دعائیں دے رہی تھی۔ اس عرصہ میں میں برابر اس کی کوشش کرتا رہا کہ کسی سے کوئی ناگوار بات نہ ہونے پائے ... اور اس پُرکیف زندگی میں کوئی خلل نہ پڑے۔ اور میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا۔ صرف ایک بار مجھ سے اور ماجد علی سے تکرار ہوگئی تھی۔ اور وہ اس طرح کہ ماجد علی میرے ایک اسامی سے نہ جانے در پردہ کس بات پر خفا تھے اور اس کو اس کے کھیت سے بے دخل کرنا چاہتے تھے۔ میں اختلاف کر رہا تھا۔ وہ کسی طرح نہیں مانتے تھے۔ آخر میں مجھے سختی کے ساتھ ان کے اندر یہ احساس پیدا کرنا پڑا کہ ہوگا وہی جو میں کہہ رہا ہوں اس لئے کہ یہ میری زمین کا معاملہ ہے جس کے وہ زیادہ سے زیادہ نگراں ہیں میں نے اس کاشتکار کو بیدخل نہیں ہونے دیا۔ ماجد علی آخر میں نہایت برافروختہ ہوگئے۔ اور کہنے لگے "یہی انداز رہا تو زمینداری رہ چکی!" میں بھی ضبط نہ کر سکا اور کافی تلخ اور تیز لہجہ میں کہا۔ کس خواب خرگوش میں پڑے ہوئے ہیں یہی انداز رہا تو وہ زمانہ دور نہیں جبکہ یہی کاشتکار زمیندار کی ہڈیاں تک چبا ڈالیں اور کہیں ان کے آثار تک باقی نہ چھوڑیں عذرا کا دل لرزنے لگا تھا۔ حامد علی نے شاید اس کو محسوس کر لیا تھا اس لئے اگرچہ ان کو مجھ سے اختلاف تھا لیکن انہوں نے باپ کو سمجھایا کہ وہ فضول ضد نہ کریں اور ذرا سی بات کو بیکار طول نہ دیں غرضکہ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ اور کوئی بےلطفی نہیں ہوئی۔ میں پھر عذرا میں کھو گیا۔ عذرا میرے حق میں شراب ہو کر رہ گئی تھی جو کسی طرح مجھے ہوش میں نہیں آنے دیتی تھی۔

چھٹیاں ختم ہوئیں اور میں لکھنؤ چلا آیا لیکن اب کے ایک نئی [illegible] اور زندگی کی ایک نئی تاب اپنے اندر پا رہا تھا۔ ریشہ ریشہ میں ایک تازہ بالیدگی سی محسوس ہوتی تھی۔ کہنے کو پھر ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے لیکن اس مرتبہ میں بے چین تھا نہ عذرا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میں ان کے گھر ہی میں رہ رہا ہوں۔ میں مصمم ارادہ کئے تھا کہ ہر چھٹی میں گھر آیا کروں گا اور اکثر اتوار کو بھی چلا آؤں گا۔ اس کے علاوہ یہ اعتماد اور اطمینان پیدا ہو گیا تھا کہ اب میں عذرا کا ہو چکا ہوں اور عذرا میری اور یہ عمر بھر کا سودا ہے۔

آج سوچتا ہوں تو اسی لکھنؤ میں میرے تعلیمی دور کے جو چار برس گزرے ہیں۔ وہ میری زندگی کا سب سے زیادہ روشن دور تھا۔ بڑے ولولے اور بڑی گرمیوں کا زمانہ تھا۔ جو کام کرتا تھا ایک خاص ذوق اور ایک غیر معمولی نشاط کے ساتھ کرتا تھا اور ہر کام میں عذرا کا خیال کارفرما تھا۔ اس کا خیال ہر دم میرے اندر ایک توانائی اور ایک بالیدگی پیدا کئے رہتا تھا۔

میں نے انہیں دنوں میں سب سے زیادہ لکھا پڑھا ہے اور میری ادبی شہرت مسلّم اسی زمانہ میں ہوئی۔ اس کا اصل سبب تو وہی امنگ اور وہی نشاط تھا جو میری رگ رگ میں سرایت کئے تھا۔ اور جو عذرا کا پیدا کیا ہوا تھا لیکن اس کا ایک خارجی سبب قطب صاحب کی ذات بابرکات بھی تھی۔ لکھنؤ میں سب سے پہلے جن قابل ذکر صاحب سے میری ملاقات ہوئی وہ یہی قطب صاحب تھے۔ جو ان زمانہ میں "تصویر" نکالتے تھے۔ "تصویر" کا شمار چوٹی کے رسالوں میں تھا اور اردو دنیا میں ہر طرف اس کا نام اور ہر جگہ اس کی مانگ تھی۔ اور وہ زندگی بھر اس پر نہایت اطمینان اور فراغت کے ساتھ بسر کر سکتے تھے۔ لیکن قطب صاحب جتنے "مرد نیک" تھے اتنی ہی کمزوریاں بھی ان میں موجود تھیں۔ مثلاً وہ ضرورت سے زیادہ لوگوں کی خاطرداریاں کرتے تھے۔ لوگوں کو قرض دینے میں اسی طرح حاتم تھے جس طرح کہ خود قرض لینے میں۔ وہ محبت برتنے کے

ہوتے اور نمایاں بننے کی فکر میں مرے جاتے تھے۔ ہر طبقہ اور ہر قماش کے لوگ ان کے دوست تھے۔ اونچے سے اونچے طبقہ کی معاشرت کی تقلید کرتے تھے۔ نہایت عالی شان مکان میں نہایت اونچے معیار کی زندگی بسر کرتے تھے۔ کوئی مہینہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں یہ دعوتیں نہ دیتے ہوں۔ میرا تو خیال ہے کہ قلب صاحب آج جو طفیلی اور حاجتمندانہ زندگی اتنے دنوں سے بسر کر رہے ہیں۔ اس کے ذمہ دار یا تو شاعر اور ادیب ہیں جو بارھوں مہینے ان کے گھر ڈیرا ڈالے رہتے تھے یا وہ متمول طبقہ ہے۔ جس کی یہ تقلید کیا کرتے تھے۔ اور جو ہر ماہ ان کے وہاں دعوتیں کھایا کرتا تھا۔ ان کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ اتنا زبردست بار برداشت کئے رہتے۔ قلب صاحب سے میری پہلی ملاقات ایک کتب فروش کے وہاں ہوئی۔ لکھنؤ میں مجھے آئے ہوئے کوئی تین ماہ ہوئے تھے جن میں تین مرتبہ گھر جا چکا تھا اور ہر بار اسے زندگی کی تازہ لہریں لے آیا تھا۔ میں بورڈنگ میں رہتا تھا۔ قلب صاحب میرے نام سے پہلے سے واقف تھے۔ میرے مضامین کے قائل تھے۔ دو ایک خط بھی لکھ چکے تھے جن میں "تصویر" کے لئے مضامین اور افسانے مانگے گئے تھے۔

کتب فروش پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اور مجھے ذاتی طور پر جان چکا تھا۔ میں اکثر اس کی دکان پر آیا کرتا تھا۔ آج مجھے آئے ہوئے مشکل سے دس منٹ ہوئے ہونگے کہ قلب صاحب بھی وارد ہوئے۔ کتب فروش نے میرا اور ان کا تعارف کرایا اور کہا "قلب صاحب حیرت ہے کہ شہاب انجم صاحب اسی لکھنؤ میں موجود اور آپ اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ کیوں نہیں ان سے "تصویر" کے لئے مضامین حاصل کرتے ——!"

قلب صاحب نے رونی صورت بنا کر اور ماتھا ٹھوک کر کہا "بس اجی کا قصور ہے۔ قسمت خراب نہ ہوتی تو جس شہاب انجم کے مضامین قریب قریب ہر رسالہ شائع کر چکا ہے وہ "تصویر" کو یوں محروم رکھتا؟ میں نے کئی خط لکھے لیکن آپ نے "جاہلوں" کی بات کا جواب خموشی سے دینا مناسب سمجھا۔ خیر خوش رہئے۔ میں تو آپ کا عرصہ سے قائل ہوں۔ میں آپ کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔ مضمون لکھئے یا نہ لکھئے۔ مجھے آپ سے بے غرض محبت ہے۔ مجھے کسی سے معلوم ہوا تھا کہ آج کل آپ یہیں کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ فکر میں تھا کہ کسی طرح پتہ چلاؤں کہ آپ کہاں رہتے ہیں۔ جو ڈھونڈتا ہے۔ وہ پاتا ہے۔ آج مل ہی گئے۔" قلب صاحب کی منقطع صورت دیکھتا تھا۔ اور پھر ایک ذرا سی بات پر ان کا یہ ماتمی انداز مجھے بے ساختہ ہنسی آرہی تھی۔ لیکن ضبط کئے ہوئے تھا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں واقعی نہ رو دیں۔ اس لئے کہ آنکھیں اور ناک دونوں بھیگ چکی تھیں۔ میں نے کہا "قلب صاحب! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے فرصت نہیں ملی ورنہ آپ کے عنایت ناموں کا ضرور جواب دیتا۔ اور آپ کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیجتا۔ خیر گزشتہ را صلوات بھیجئے۔ میں تو اب لکھنؤ میں ہی ہوں۔ "تصویر" کے لئے برابر مضامین لکھتا رہونگا۔ آپ نے جس محبت اور قدر دانی کا اظہار کیا ہے اس کا اعتراف نہ کرنا کفر ہوگا۔" قلب صاحب مارے خوشی کے پھول گئے۔ فوراً رومال نکال کر آنکھ ناک پونچھی اور چہرہ برابر کر لیا۔ اور کہنے لگے "آپ کہاں ٹھیرے ہیں؟" ——————

میں نے جواب دیا "بورڈنگ میں"۔ بولے "واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ میرے ہوتے ہوئے آپ بورڈنگ میں ٹھیریں! میرا اتنا بڑا گھر موجود ہے۔ میں آپ کو دو پورے کمرے بالکل علحدہ دیدونگا اور آپ کے مشاغل میں کوئی خلل انداز نہیں ہونے پائے گا۔ بس

آپ بورڈنگ چھوڑ کر چلے آئے ورنہ مجھے بڑا رنج ہوگا۔ میں آپ کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔"

قلب صاحب کی رگِ اخوت ہر وقت جوش میں رہتی ہے اور وہ جس کسی سے بھی ملتے ہیں اس کو اپنا چھوٹا یا بڑا بھائی سمجھے بغیر نہیں رہتے۔ میں نے لاکھ سمجھانا چاہا کہ اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ میں تعلیم کی غرض سے لکھنؤ آیا ہوں اور بورڈنگ میرے لئے بہترین جگہ ہے لیکن قلب صاحب جس کے سر سوار ہو جاتے تھے۔ جن کی طرح سوار ہو جاتے تھے۔ دوسرے ہی دن سے بورڈنگ کی خاک چھان ڈالی اور آخر کار جب میں نے وعدہ نہیں کر لیا کہ امتحان ختم ہونے کے بعد آئندہ مہینے کی پہلی تاریخ سے میں انہیں کے گھر اٹھ آؤں گا۔ میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔

قلب صاحب کی روزانہ کی زندگی کے واقعات اگر قلمبند کروں تو ایک طویل دفتر ہو جائے۔ جو بات تھی لاجواب تھی اور جو انداز تھا نرالا تھا ان کے وہاں رہنے سے مجھے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو بڑے بڑے آدمی اور بڑے سے بڑے اہل قلم سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ دوسرے وہ اپنے ارد گرد ایک ادبی فضا پیدا کئے ہوئے تھے جس میرے ذوق کی تحریک ہوتی رہتی تھی۔ مجھ سے "تصویر" کی ہر اشاعت میں کچھ نہ کچھ لکھاتے رہتے تھے۔ اور میں ہر لمحہ اپنے اندر ایک تخلیقی ولولہ پاتا تھا۔ میں نے سب سے زیادہ اور سب سے اچھے مضامین، افسانے اور منظومات اسی زمانے میں لکھے۔

چودھری نبی احمد سے بھی پہلی ملاقات قلب ہی صاحب کے ذریعہ ہوئی اور اس ملاقات کو میں اپنے اس دور کے سب سے بڑے اکتسابات میں شمار کرتا ہوں۔

میرے لکھنے کی رفتار آج سست ہی۔ وہ دیکھئے مروارید آگئی میں نے سمجھا تھا کہ مجھ سے جواب طلب کرے گی۔ لیکن وہ تو شکایت کرتی ہوئی آئی ہے کہ "بیگم "نیر" بڑے دلی تعلق اور فکرمندی کے ساتھ میری خیریت دریافت کر رہی تھیں اور ان کا لب و لہجہ ان کے جذبات کو رسوا کر رہا تھا۔ اس پر میں مروارید کا پیار کئے بغیر نہیں رہ سکا ......

(باقی)

تنویر بمبئی

شہیدِ قوم سے خطاب

(از جناب ڈاکٹر ادیب عثمانی صاحب)

قوم کے جنگ جو! قوم کی زندگی ۔۔۔ قوم کے نیک خو! قوم کی زندگی

قوم کو بھی بقا ساتھ ہی دے گیا ۔۔۔ اے کہ لاریب تو قوم کی زندگی

قوم کی بات پر مرنے والا ہے تو ۔۔۔ تجھ سے ہے سرخرو قوم کی زندگی

قوم کے مایۂ ناز بیدار ہو ۔۔۔ لے چکی ہے لہو قوم کی زندگی

جو بفضلِ خدا آج پوری ہوئی ۔۔۔ تھی تری آرزو قوم کی زندگی

اُٹھ کے غلطیدۂ خاک و خوں دیکھ لے ۔۔۔ ہے یہی رنگ و بو قوم کی زندگی

تجھ سے قائم رہی تجھ سے دائم رہی
قوم کی آبرو قوم کی زندگی

غلام کی زندگی

از جناب الطاف مشہدی صاحب

مکرمی الطاف مشہدی صاحب کی یہ نظم ہندوستان کے جی حضوروں اور غلامی پسند طبقے کیلئے قابل غور و فکر ہے بشرطیکہ غلامی کی پستی انھیں اتنی آنکھیں دکھانے دے کہ ان کی نظر ان اشعار کی اہمیت تک جا پہنچے۔ کاش ہماری قوم کا معصوم حصہ اس سبق سے زندگی حاصل کرے۔ (مدیر)

الٰہی اگر مجھے اس ہند میں کچھ روز جینا ہے

تو میری قوتِ احساس مردہ ہو کے رہ جائے
دلِ خوددار بارِ ذلتِ افلاس سہہ جائے
بر اسے آستانِ سیم و زر یہ جھک کے شاداں ہو
خوشامد کا مرے ہونٹوں کو ہیبتاً للہ ارماں ہو
مری فطرت پہ محکومی کے بادل سایہ افگن ہوں
مری قسمت پہ محرومی کے بادل سایہ افگن ہوں
ابد کی نیند سوئے میرے دل میں حسِ خودداری
مرے جذبات سمجھیں حریت کو ایک بیماری
جبیں کو سجدہ ریزی کی تڑپ بیتاب کر ڈالے
مرے اخلاص کو لالچ کی دیوی گود میں پالے
وطن کے راہ میں مرنے کے ارماں خودکشی کرلیں
وطن کی چاہ میں مرنے کے ارماں خودکشی کرلیں
مرے افکار دیں اہلِ وطن کو درسِ غداری
مرے ایثار کے ایوان میں ہو زلزلہ طاری
مجھے اک کیف حاصل ہو یتیموں کے رلانے میں
مرے دل کو مزا آئے غریبوں کے ستانے میں
مری غیرت کی مشعل کپکپا کر سرد ہو جائے
مری مردانگی کا سرخ چہرہ زرد ہو جائے

الٰہی اگر مجھے اس ہند میں کچھ روز جینا ہے!

(خاص تنویر کے لئے)

افسانہ

یہ تیز زمانہ

از محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ

سرلا نے اپنی ساری کو سنبھالا۔ سر پر رومال لپیٹ کر رکھا۔ اور لکڑی کا گٹھا اٹھا کر گھر کی طرف چل دی۔ باورچی خانہ میں پہنچی۔ چولھا جلایا۔ رسوئی تیار کی۔ اتنے میں اُس کا باپ بھی جاگ گیا۔ مُنہ ہاتھ دھو کر باورچی خانہ کے سامنے والے شکستہ دالان میں آ بیٹھا۔ "پتا جی" لڑکی نے باورچی خانہ سے پکار کر کہا "بھوجن تیار ہے مگر دیکھیے میں کھانے کے بعد جنگل جاؤں گی۔ گھر کے دوسرے کام شام میں کر لوں گی! ٹھیک ہے نا؟" سرلا کے لہجے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس کے کرنے کا مصمم ارادہ کر چکی ہے۔ اُس کا باپ اُس کے اس لہجے سے بخوبی واقف تھا۔ آج نہیں بچپن سے وہ اسی طرح گفتگو کرنے کی عادی تھی گویا اُسے یقین ہوتا تھا کہ اُس کی مخالفت نہ کی جائے گی۔ اُس کی فطرت کی اس سرکشی کو گاؤں والے پسند کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں اُس کے باپ کو تو وہ دل و جان سے پسند تھی۔ اور بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ سرلا کے سرکشانہ انداز پر مغرور ہے۔ اس وقت بھی وہ بے ساختہ مسکرایا بلکہ ہنسا "جو جی چاہے کرو بیٹی۔ میں نے آج تک تمھیں کسی بات سے منع کیا ہے" باورچی خانہ سے سرلا کے ہنسنے کی آواز آئی "پتا جی آپ بڑے اچھے ہیں۔ ایسے اچھے جیسے چندرما ــــ"

کھاتا اور کھلا کر سرلا مکان کی اندرونی کوٹھری میں گئی ایک کونے میں چند کاپیاں جن پر نستعلیق حروف میں اس کا نام لکھا ہوا تھا اور چند کتابیں، جن پر خوش رنگ کاغذ کے کور چڑھے ہوئے تھے۔ بے ترتیب حالت میں پڑی ہوئی تھیں اُنھیں سے

اُنھیں اٹھایا اور جنگل کی طرف چل دی۔ سرلا کا باپ بھی لکڑی ٹیکتا ہوا زمیندار صاحب کے بنگلے تک پہنچ گیا۔ دیوان خانے میں بیٹھا چلم پیتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ وہ ایک معزز کسان تھا ــــ!

گاجر نگر کی بستی اس لحاظ سے کہ وہاں زراعت کو کافی فروغ تھا۔ سرسبز و مطمئن نظر آتی تھی۔ سرلا کا باپ بھی ایک متوسط کسان تھا۔ لیکن اس نے اپنے زمانۂ جوانی میں اتنا زیادہ کام اور محنت کی تھی کہ اُس کا بڑھاپا نہایت آرام اور بے فکری سے گزر رہا تھا۔ گاؤں میں اُس کے دو ایک مکان بھی تھے جو کرائے پر اُٹھے ہوئے تھے۔ بعض قطعات آراضی کا انتظام وہ خود کرتا تھا اور بعض کو اُس نے پٹہ پر اُٹھا رکھا تھا۔ سرلا اُس کی اکلوتی لڑکی اور بیوی کے انتقال کے بعد سے اُس کی تنہائی کی ساتھی۔ گاؤں کی دوسری لڑکیاں سرلا کو عجیب نظروں سے دیکھتیں وہ اپنے گھروں میں اتنی آزاد اور خود مختار نہ تھیں جتنی کہ سرلا ــــ اور اس کے علاوہ سرلا کی فطرت بھی اُنھیں کچھ عجیب و غریب سی معلوم ہوتی ــــ سُنتی ہو بہن" ایک دن گاؤں کی ایک لڑکی پانی بھرتے بھرتے اپنی بہن سے کہہ رہی تھی ــــ "سرلا کا غرور اب حد سے بڑھ گیا ہے پرسوں میں اُس سے سکھیا اور رشیا کی لڑائی کا قصہ سُنا رہی تھی سناتے سناتے میں نے اُس سے کچھ پوچھا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا کہنے لگی "نا بہن ــــ میں قصہ سُن ہی رہی تھی" میں نے کہا تو میں بیکار ہی بک رہی تھی؟ بولی: "ہوں تم جانو

میں تو اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ سامنے والے بن میں خدا جانے کتنی چڑیاں رہتی ہوں گی ــــ" اب بھلا یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے نا سمجھی ــــ میں کہوں نہ جانے اُسے ہو کیا گیا ہے۔ اپنے کو بہت بڑا سمجھنے لگی ہے" ۔ شنکر جی نے اپنی بھویں سکیڑیں اور سر پر گھڑے کو اچھی طرح سنبھالتے ہوئے بولیں "کچھ ایسی سندر بھی تو نہیں ہے"

یونیورسٹی کی عمارات شہر سے کافی دور تھیں۔ طلبا کو بذریعہ ٹرین وہاں تک جانا ہوتا درمیان میں بہت سے اسٹیشن پڑتے تھے۔ کاجر نگر بھی انہی اسٹیشنوں میں سے ایک تھا۔ آج سے کوئی چار سال پہلے احمد ایف۔ اے کا ہونہار طالب علم کاجر نگر کے اسٹیشن پر اترا۔ اسے پیاس معلوم ہو رہی تھی۔ خیال کیا کہ پانی پی کر جلدی سے ٹرین میں جا بیٹھے گا لیکن وہ ابھی پانی تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ریل نے سیٹی دی اور روانہ ہو گئی۔ دوسری ٹرین پورے دو گھنٹے بعد چھوٹتی تھی۔ احمد کو بہر حال یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ کالج میں آج اُن کوئی اہم کلاسیں نہ تھیں ــــ اکیلا اسٹیشن پر بیکار رہنا اُسے کچھ پسند نہ آیا۔ وہ پٹری پٹری چلتا بہت دُور نکل گیا۔ جہاں ریل کا راستہ سطح زمین سے بالکل برابر ہو گیا تھا۔ وہاں ایک گھنا جنگل تھا۔ احمد اس جنگل میں داخل ہو گیا۔ اسی جنگل میں سَرلا روزانہ لکڑیاں جمع کرنے کی غرض سے آیا کرتی تھی اس روز بھی وہ آئی۔ حسب دستور ہنستی، کھیلتی، اور گنگناتی ــــ یہیں ــــ اس سرسبز و شاداب جنگل میں احمد اور سرلا جو اس وقت تقریباً چار سال چھوٹے تھے۔ ایک دوسرے سے متعارف ہوئے ــــ احمد ایک افسانہ نگار اور شاعر مزاج انسان تھا۔ اُسے سرلا کی شخصیت دلچسپ اور جاذب توجہ معلوم ہوئی اور اسی بنا پر اُس نے پہلی ہی ملاقات میں سب کچھ پوچھ ڈالا ــــ "وہ کہاں رہتی ہے؟ نام کیا ہے؟ والدین کیا کرتے ہیں؟" اور سب سے آخر میں "کچھ اُس نے پڑھا لکھا بھی ہے کہ نہیں ــــ؟" سرلا نے سب سوالات کے جواب دیئے اور بڑی صفائی اور بے باکی سے ــــ آخری سوال کے جواب میں اُس نے کہا کہ وہ پڑھتی تو نہیں ہے۔ البتہ اُسے یقین ہے کہ اگر وہ پڑھنا شروع کرے تو دو ایک سال کے اندر سب کچھ پڑھ سکتی ہے "کوئی چیز دنیا میں مشکل نہیں"۔ اُس نے فلسفیانہ انداز میں کہا تھا "لکڑیاں جمع کرنا بھی آسان ہے اور کھانا پکانا بھی اور اسی طرح پڑھنا لکھنا بھی مشکل نہ ہوگا"۔ گفتگو کرنے کے دوران میں وہ مسلسل مسکراتی رہی تھی۔ وہ ایک اس قسم کی خوشی محسوس کر رہی تھی جیسی کہ اُسے اکثر جنگلوں میں عجیب و غریب بھونروں، بھنبیریوں اور چڑیوں کو دیکھ کر ہوا کرتی تھی "میرے گاؤں میں کوئی بھی اس شخص کی سی باتیں نہیں کر سکتا۔ وہ عجیب ایک نئی سی چیز معلوم ہوتا ہے" سَرلا نے اپنے دل میں سوچا۔

"میرے شہر میں کوئی لڑکی ایسی بے باک، صحتمند، تصنع سے آزاد اور نڈر نظر نہیں آتی" احمد نے خیال کیا "وہ تو ایسی ہے جیسی کہ موسم سرما کی بے پروا ہوائیں" اپنے اپنے دلوں میں یہی خیال لئے ہوئے وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اس کے بعد سے وہ اکثر اس جنگل میں ملا کرتے۔ اور اب تو سرلا روزانہ احمد سے سبق پڑھا کرتی تھی۔ سرلا کا بڈھا باپ اس بات سے واقف تھا۔ کیونکہ اکثر احمد سرلا کے گھر آجاتا اور وہیں درس تدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ بڈھا اس بات کا مخالف نہ تھا کیونکہ اُسے اس میں کوئی قباحت نظر نہ آتی تھی۔ سرلا دن کے زیادہ تر اوقات میں گھر کے کام

کالج میں مصروف رہتی، پھر اگر وہ تھوڑا سا وقت احمد کے ساتھ گزارتی تو اس میں ہرج ہی کونسا تھا ——"

حسبِ معمول سرلا اپنی کتابیں، کاپیاں اور پنسل وغیرہ لئے ایک درخت کی نسبتاً چوڑی اور مسطح پیڑ پر بیٹھی تھی۔ پیڑ کے آس پاس گاجر نگر کی سونا اگلنے والی سیاہ، خوشبودار زمین پر ہری ہری گھاس اُگی ہوئی تھی۔ جاڑوں کی ابتدا تھی۔ اس لئے گھاس کی رنگت سیاہی مائل سبز نہ رہی تھی۔ اس میں کپاسی رنگ جھلکنے لگا تھا۔ جو آنکھوں کو نسبتاً زیادہ خوش کرتا ہے۔ اُس کی نگاہیں ان سرسبز بیلوں میں نہار رہی تھیں۔ اور کبھی کبھی گھاس پر پُھدکنے والے ٹڈوں پر جم جاتی تھیں۔ جو اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے

جونہی ریل کی سیٹی سنائی دی۔ سرلا نے جلدی سے ایک کتاب اٹھالی۔ آج کل احمد اُسے وہی پڑھا رہا تھا جو کہ وہ خود کالج میں پڑھتا تھا۔ چار سال کے عرصے میں سرلا نے اتنا کچھ پڑھ ڈالا تھا کہ بعض وقت خود اُسے تعجب ہونے لگتا تھا۔ اور احمد کے لئے تو اب اُس کی ذہانت و ذکاوت ایک حل شدہ معمہ ہو کر رہ گئی تھی، کل احمد نے اُسے غالب کے اس شعر کا مطلب سمجھایا تھا ؎

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

وقت کے وقت سرلا نے محسوس کیا تھا کہ وہ شعر کا اصلی مفہوم سمجھ گئی ہے لیکن اب جب اُس نے سوچا تو اُس کو معلوم ہوا کہ شعر کا کوئی صاف اور واضح مطلب اُس کے ذہن میں موجود نہیں ہے۔

وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں احمد اُس سے اس شعر کے سمجھانے کے لئے نہ پوچھ بیٹھے۔ چنانچہ اُس نے کتاب اٹھالی۔ اور شعر کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ چند منٹ کے بعد احمد آگیا۔ "کیسی ہو سرلا؟" اس نے پوچھا

"اچھی ہوں" سرلا نے اپنی جگہ سے اُٹھے بغیر کہا۔ احمد اُس کے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گیا۔ "میں نے جو نظم تم سے زبانی یاد کرنے کو کہی تھی وہ یاد کر ڈالی؟" اُس نے ایک کتاب اُٹھاتے ہوئے پوچھا —— سرلا چونک پڑی اُسے نظم کا خیال ہی نہ رہا تھا۔ معافی طلب نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

احمد ہنس پڑا "خیر جانے دو۔ کل یاد کر لینا۔ یہ میں تمہارے فائدہ کے لئے کہتا ہوں۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ زبانی نظمیں یاد کرنا کرانا بالکل بچوں کی سی باتیں ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ ایسا کرنے سے انسان کی قوت حافظہ بہت تیز ہو جاتی ہے"

"سچ کہتے ہو احمد" سرلا نے کہا "میں اُسے ضرور یاد کر لوں گی پتاجی کے لئے بھوجن تیار کرتے کرتے ہی اگر پڑھتی رہوں تو یاد ہو جائے —— ہے نا؟"

"ہاں اور کیا" احمد نے کہا اور اُس کے ہونٹوں پر وہ نرم و شیریں تبسم کھیلنے لگا جو صرف سرلا کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ پھر اُس نے اُسے سبق پڑھایا۔ وہ کتاب اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ اور سرلا اُس کے شانوں پر سے جھکی پڑھ رہی تھی۔ اس حالت میں کہ اُس کے بال احمد کے چہرے کو چھو رہے تھے —— دیکھتے دیکھتے موسم تبدیل ہو گیا۔ یا تو دھوپ نکلی ہوئی تھی یا چاروں طرف ابر چھا گیا۔ ہوائیں جنہیں دور دراز کی زرخیز زمینوں کی خوشبوئیں ملی ہوئی تھیں، چلنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ فاصلہ پر ہلکی سی بارش ضرور ہوئی ہے۔ کیونکہ فضائیں بوجھل اور گیلی گیلی ہو گئی تھیں —— بطخیں اور کوے اپنے پروں کو پھڑپھڑاتے مستعدی کے انداز میں اِدھر اُدھر اڑنے لگے۔ جیسے کہ وہ فطرت کے پیامبر تھے۔ اور زمین پر بسنے والوں کو تغیرات موسم کی

اطلاع دینا انہی کے سپرد تھا۔

احمد نے کتاب بند کردی سبق تقریباً ختم ہو چکا تھا احمد نے مضمون کے آخری حصے کو سمجھاتے ہوئے نتیجتاً کہا لکھنے والے کا اصلی خیال یہ ہے کہ مرد مشکل سے مشکل اور تلخ سے تلخ لمحات میں بھی رو نہیں سکتا اور یہی بات اُسے عورت سے ممتاز اور علیحدہ کرتی ہے۔"

"عورت معمولی سے معمولی واقعات اور باتوں پر رو سکتی ہے اور یہی بات اُسے مرد سے ممتاز اور علیحدہ کرتی ہے" سترلا نے کہا" اور جہاں تک میرا خیال ہے اس معاملہ میں عورت مقابلتاً زیادہ خوش نصیب واقع ہوئی ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو سترلا —— رو سکنا دراصل ایک خوش قسمتی ہے۔ آنسوؤں کے چھینٹوں سے ہم اپنے دل کے دہکتے ہوئے شعلوں کو بجھا سکتے ہیں —— کیوں؟"

"ہاں احمد رونے سے بڑا سکون ملتا ہے۔ سچ کہوں مجھے تو مردوں پر صرف اس لئے رحم آتا ہے کہ وہ رو نہیں سکتے۔"

"شکریہ" احمد نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا اور مسکرایا ایک ایسی مسکراہٹ جسمیں ہلکا سا درد و الم جھلک رہا تھا۔ "میرا خیال ہے" سترلا مسلسل کہے جا رہی تھی "کہ اگر لوگ دنیا میں رونے کے فوائد کو جان لیں اور آنسوؤں کی قدر پہچان لیں تو رنج و غم ایک بڑی حد تک مٹ جائے۔"

"یہ تو ایک عجیب خیال ہے" احمد نے تعجب سے ہنستے ہوئے کہا" یہ تو ایسا ہے کہ ایک گھر کو جلتا دیکھ کر ہم اُس پر مٹی کا تیل چھڑکیں اور یہ کہیں کہ تیل کا چھڑکنا آگ بجھانے کے لئے نہایت ضروری ہے۔"

"آپ مجھے سمجھے نہیں" سترلا نے سنجیدگی سے کہا" میرا مطلب یہ تھا کہ جب انسان آنسوؤں سے کام لینا سیکھ جائے گا تو وہ کم از کم بظاہر اتنا افسردہ خاطر اور دل گرفتہ نہ نظر آئے گا۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں بہت سارے تنہا لمحات آتے ہیں ان لمحوں میں رو کر اپنے آپ کو آسودہ خاطر اور سکون پذیر کیا جا سکتا ہے" اس اظہار خیال کے بعد سترلا خاموش ہو گئی۔ جیسے کہ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ احمد دھیمی آواز میں یہ شعر گنگنانے لگا۔

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ ہے لب آشنائے خندہ ہے

لیکن موسم کا تقاضا کچھ اور تھا۔ احمد اپنی جگہ سے اُٹھا سترلا بھی اُس کا ہاتھ تھام کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی پہاڑی تھی۔ اس پر جنگلی جامنوں اور فالسوں کی جھاڑیاں کثرت سے تھیں۔ وہ دونوں پہاڑی پر چڑھ گئے اور چھوٹی بڑی جھاڑیوں کے درمیان سے اپنا راستہ بناتے ایک نسبتاً زیادہ دلکش کنج میں پہنچ گئے۔ جہاں پھلوں کی کثرت ...... کی وجہ سے درختوں کی شاخیں جھکی پڑتی تھیں۔ احمد کی اُنگلیاں فالسے توڑتے توڑتے اور سترلا کے ہونٹ کھاتے کھاتے سیاہی مائل اودے ہو گئے "تمہاری اُنگلیاں تو ایسی معلوم ہو رہی ہیں" سترلا نے احمد کی انگلیوں کو پکڑتے ہوئے کہا "جیسے جنگلی بھوروں کے پر" سترلا یہ کہتے کہتے ایک پیڑ پر چڑھ گئی۔ ابر چھا جانے کی وجہ سے موسم کچھ نورانی سا ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہی روشنیاں جو پہلے پوری فضائے بسیط میں پھیلی ہوئی تھیں اب سمٹ سمٹا کر ایک محدود جگہ میں چمک اُٹھی ہیں۔ جس درخت پر سترلا چڑھی تھی۔ اُس پیڑ پر جنگلی چنبیلی کی بیل پھیلی ہوئی تھی اور اُس کے پھولوں کی تیز تلخی مائل خوشبو سے آس پاس کی فضا معمور

تھی۔ پیڑ کی جڑ کے قریب صحرائی چوہوں نے اپنا گھر بنا رکھا تھا۔ اور اُس کے سامنے تازہ کھُدی ہوئی مٹی کے انبار لگے ہوئے تھے جن کی نرمی اور ملائمت کو نگاہیں بھی محسوس کر سکتی تھیں۔ کچھ روپہلی سنہری پروں والی جھینگریاں اور کچھ لالچی شہد کی مکھیاں اپنے پروں کی یکساں اور مسلسل آوازے اس سنسان مقام کی خواب آور کیفیتوں میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے احمد فالسے توڑتے توڑتے اور سرلا کھاتے کھاتے رُک گئی۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر مسکراتے ہوئے سرلا ایک بڑی سی شاخ کے سہارے درخت پر لیٹ گئی اور کہنے لگی "میرا جی چاہتا ہے کہ سب دن ایسے ہی جگمگاتے، جھلملاتے گزر جائیں ـــــ مسرتوں اور عشرتوں کی فراوانی کے لئے میری رُوح بیتاب نہیں ہے۔ بلکہ وہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سکون و طمانیت کے ننھے ننھے لمحوں کے ساتھ پرواز کرنے کی آرزومند ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو سرلا۔ زندگی کی اس مختصر سی مدت کا ہر دن اگر صرف آج کی طرح گزر جائے تو یہ کافی ہے، کافی سے بھی زیادہ ہے۔" احمد نے کہا "ہم اس سے زیادہ اور کسی چیز کی تمنا نہیں کرتے۔"

"چلو احمد" سرلا نے کہا "ہمالیہ کے اُس پار شاید کوئی چھپی ہوئی ایسی بستی ہو۔ جہاں انسانوں کے قدم اب تک نہ پہنچ سکے ہوں یا جہاں انسان اگر بستے بھی ہوں تو ایسے جو مسکراتے رہتے ہوں جو خوش اور مسرور ہوں۔ اس لئے کہ اُن کے پاس لمبی چوڑی خواہشیں اور تمنائیں نہیں۔ چلو ہم ایسی ایک دُنیا کو ڈھونڈ نکالیں اور اس طرح زندگی کے معنی کو سمجھنے کی کوشش کریں ـــــ"

احمد مسکرایا "سرلا تم تو بالکل ایک ہیروئن کی طرح باتیں کرتی ہو۔"

"روزمرہ کی زندگی میں ـــــ" سرلا نے کسی قدر افسردگی کے ساتھ کہا "ہمیں افسانوں اور ڈراموں کا خیال نہ کرنا چاہئے۔ یہ تصور ہماری مسرتوں کو ہمیشہ بُری طرح مجروح کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ ہم اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں اور دوسروں کے کانوں سے سُننے لگتے ہیں۔"

"خیر جانے دو" احمد نے کہا "مگر ٹھیرو ـــــ تم اپنی جگہ سے ابھی مت اُترو مجھے ایک نظم کا پورا مواد مل گیا ہے۔ تم اگر وہاں بیٹھی رہو گی تو میری نظم میں حقیقت کی رُوح پیدا ہو جائے گی۔"

"مجھے نظموں کا موضوع بننا کچھ پسند نہیں" سرلا نے کہا۔ "مگر میں بیٹھی رہوں گی جبکہ تم یہ چاہتے ہو۔" احمد درخت کے نیچے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور نظم لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ کبھی کبھی وہ سر اٹھاتا۔ سرلا کی طرف دیکھتا اور مسکرا دیتا۔ سرلا بھی جواب میں مسکراتی۔ وہ اس تمام عرصہ میں بالکل خاموش رہی۔ البتہ کبھی کبھی وہ اپنی کاپی میں جو کہ اُس کے ہاتھ میں تھی۔ کچھ لکھ لیتی تھی۔ احمد نے اپنی نظم ختم کر لی۔ اور جب سرلا مسکراتی ہوئی درخت سے اُتر آئی۔ تو اُس نے اُسے وہ نظم گا کر سنائی۔

سرلا نے اپنی کاپی نکالی "احمد اس دوران میں میں نے بھی اپنے بعض منتشر خیالات کو لکھ ڈالا ہے" اس نے کہا "شاید تم اُنھیں پڑھنا پسند کرو گے۔" احمد نے کاپی اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ اور پڑھنا شروع کیا۔

"دلچسپ شامیں اور خوشگوار راتیں جبکہ ہم دوستی کی ہلکی پھلکی دیوی کے نازک پروں سے پیدا ہونے والی ہواؤں میں سانس لیتے تھے۔ گزر گئیں۔ وہ دوپہر کے سکون آمیز مسکراتے

ہوئے لمحات جبکہ ہم ایک دوسرے سے بات کرتے متعلق نہ گھبراتے تھے ۔ پر لگا کر اڑ گئے ۔ آہ اے دوستی تو محبت کیوں بن گئی ؟

'خاموش رات کے حسین ستاروں کی طرح ہم صرف دیکھنے کے لئے پیچھے کیوں پڑ جاتے ہیں ۔ آہ کیا ہماری قوت سامعہ بالکل بیکار ہو گئی ہے ؟'

'جب میں جھینگروں کو دیکھتی ہوں تو سوچنے لگتی ہوں کہ اے خدا کہیں زندگی اور رقص ہم معنی چیزوں کے علیحدہ علیحدہ نام تو نہیں'

"اے آسمان مجھے اپنی بلندیوں ، اپنی عظمتوں اور اپنی بے پناہ خوبصورتیوں سے خوفزدہ کرنے اور مرعوب بنانے کی کوشش نہ کر ۔ کیونکہ اے ہزاروں آنکھوں والے محبوب مجھے تیرے ساتھ ہمدردی ہے ۔ ڈرتی ہوں کہ مبادا میرے خیالات و تصورات کی لامتناہی وسعتیں اور بلندیاں تیری عظمتوں کو شرمندہ نہ کر دیں اور تیرا یہ حسین نیلا چہرہ شرم سے گلابی نہ ہو جائے ؟'

'بغیر کسی نصب العین کے زندگی ایسی ہی ہے ۔ جیسے بغیر ایک ناخدا کے طوفانی سمندر پر ایک کشتی ، کون کہتا ہے کہ تاریکی نہیں ہے اس سے کسے انکار ہے کہ میں ایک قیدخانہ میں نہیں ہوں مگر اب جب کہ میں تاریک کمرے کے اندر اس طرح گھوم رہی ہوں کہ دیوار کا کوئی حصہ ایسا نہیں جسے میری انگلیاں نہ چھو سکتی ہوں تو پھر اے خدا یہ کیا اسرار ہے کہ میں دروازے کا پتہ لگانے سے قاصر ہوں ؟'

'ایک تمنا ہے میرے جی میں ، یہ کہ اس سیدھی اور صاف سڑک کو چھوڑ کر ایک ایسے راستے کے سرے پر آ جاؤں جہاں سے متعدد راہیں مختلف سمتوں میں جاتی ہوں اور اس وقت پہنچنے اور انتخاب کرنے کی مسرت میرے نصیب میں ہو کہ میں ان میں سے کونسی راہ اختیار کروں '

احمد پڑھ چکا تو کاپی ہاتھ میں لئے خاموش بیٹھا رہا ۔ سرلا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی " تم فلسفیوں کی طرح کیا سوچ رہے ہو احمد ؟" اس نے سوال کیا " کچھ نہیں " ۔ احمد نے اپنی نگاہیں سرلا کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا " یہ سوچ رہا تھا سرلا کہ تمہارے خیالات اور تصورات میں زمانۂ قدیم کی معصوم خوبصورتیاں اور موجودہ دور کی بلند پروازیاں اور نزاکتیں کہاں سے آگئیں ۔ میں کہتا ہوں کہ تم میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو تمہیں آنسہ می ۃ خالدہ خانم اور سروجنی نائیڈو کے ہم مرتبہ بنا سکتی ہیں " احمد کی نگاہوں میں تعریف و توصیف کی جھلک تیز ہوتی جا رہی تھی اس لئے سرلا نے مسکرا کر کہا " تم اگر چاہو تو ذرے کو آفتاب بنا سکتے ہو احمد ــــ تم شاعر ہو نا !"

بہت سارے دن اس طرح بیت گئے ۔ احمد روزانہ آتا ۔ سرلا روزانہ سبق پڑھتی اور پھر کبھی کبھی وہ جنگل کی سنسان خلوتوں میں سیر کرتے پھرتے ۔ احمد خوش خوش نظر آتا ۔ سرلا مسکراتی رہتی ۔ اور پھر کبھی کبھی وہ دونوں مل کر ہنستے احمد رخصت ہونے لگتا تو سرلا اس کے ساتھ اسٹیشن تک جاتی وہ اندر پلیٹ فارم پر چلا جاتا وہ اسٹیشن کے کٹہرے کے قریب کھڑی اسے جاتا ہوا دیکھا کرتی جب ٹرین چلنے لگتی تو احمد اپنی دستی ہلاتا ۔ اور سرلا اپنا ہاتھ ــــ !

بارش کا زمانہ تھا ۔ ندی نالے بھرپور چلنے لگے تھے ۔ جنگل کے سوکھے درختوں میں از سر نو جان آ رہی تھی ۔ مرطوب ہوائیں چل رہی تھیں ۔ سرلا آج صبح سے گھر کے باہر قدم نہ رکھ سکی تھی کیونکہ مسلسل مینہ برس رہا تھا جب شام ہوئی اور پانی ذرا کی تھما تو وہ نکلی ۔ پگڈنڈی پکڑ کر وہ اس قدیم جنگل میں پہنچ گئی ۔ جہاں کی فضا کا شاید ہی کوئی گوشہ اس کی مسکراہٹوں اور آوازوں سے خالی نہ رہا ہو گا ایک آم کے پیڑ کے نیچے جہاں ریتی دُھل دُھلا کر صاف شفاف نکل آئی تھی

وہ بیٹھ گئی۔ یہ شام کی ٹرین کے آنے کا وقت تھا اور وہ احمد کی منتظر تھی ــــ اُسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ احمد دور سے آتا دکھائی دیا۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھی حسب دستور مسکرا رہی تھی۔ اور اُمید کر رہی تھی کہ احمد کوئی بہت ہی دلچسپ بات کہہ کر اُسے مخاطب کرنے والا ہے۔ لیکن جونہی اُس کی نظر احمد کے چہرے پر پڑی۔ اُس کی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر سے یوں غائب ہو گئی جیسے صبح ہوتے ہوتے گل کشتو کی خوشبو ہواؤں میں پرواز کر جاتی ہے احمد بہت زیادہ غمگین اور افسردہ خاطر نظر آ رہا تھا۔ "کیا بات ہے احمد ــــ ؟" سرلا نے بےچینی سے اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔ "جی اچھا نہیں ہے کیا ؟" ایک ثانیہ کے لئے احمد کے ہونٹوں پر تبسم پیدا ہوا۔ اس تبسم میں بہت ساری کیفیتیں وقت واحد میں جمع تھیں اُس میں ایک ہلکا سا جذبۂ رحم تھا کچھ اپنے لئے اور کچھ سرلا کے لئے۔ اُس میں کچھ ذرا سی تلخی تھی کچھ اپنے جذبات کے خلاف، اور کچھ قدرت کے خلاف، اس میں ایک ذرا سا تصنع اور بناوٹ تھی جو واقعہ کی اہمیت کو کم کر دینا چاہتی تھی۔ "سرلا میں نے اب تک بہت سی باتیں تم سے چھپائی تھیں، لیکن اب اُن کا پوشیدہ رہنا ناممکن ہے" احمد نے کہا۔ "تم یہ تو جانتی ہو کہ میرا خاندان بڑا ہے اور اُس کا فرد مجھ سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ کئے ہوئے ہے۔ خاص کر میرے والدین ــــ میں بدقسمتی سے بی۔ اے میں فرسٹ آیا۔ اور گورنمنٹ نے مجھے سفاکانہ بےرحمی سے فارن اسکالرشپ عطا کر دیا۔ سرلا جانتی ہو اس کا کیا مطلب ہے ؟ مجھے اب یورپ جانا ہوگا۔ ہر شخص اس پر مصر ہے اور ایسی صورت میں میرا انکار کرنا ایک لایعنی سی چیز ہوگی ــــ"

"تو آپ انکار کریں ہی کیوں ؟" سرلا نے نہایت سنجیدگی اور سکون سے کہا۔ حالانکہ اُس کی روح میں ایک تلاطم برپا تھا اس نے محسوس کیا کہ اُس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ چنانچہ اُس نے انھیں پیچھے اپنی ساڑی کے آنچل میں چھپا لیا۔ اپنے چہرے کے سکون پر وہ اعتماد کر سکتی تھی۔ لیکن ہاتھوں پر نہیں ــــ احمد نے سرلا کے انداز تخاطب کی تکلیف دہ اجنبیت کو محسوس کیا۔ اور بیتاب ہو گیا۔ اُس کے پندار کو بُری طرح صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن اس نے سرلا کو کسی قسم کی بات نہ کی۔ نہ اُس کی طرف حیرت سے نگاہیں اٹھائیں نہ اُس کے ہاتھوں کی پوشیدہ کپکپی کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔



دس سال دیکھتے دیکھتے گزر گئے۔ سرلا اب گاؤں کے دولت مند زمیندار ہرش بابو کی بیوی اور تین بچوں کی ماں تھی۔ بابو صاحب کو اُن کے والد نے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ اور چاہتے تھے کہ اُن کی شادی بھی شہر کے کسی تعلیم یافتہ گھرانے میں کی جائے مگر ہرش بابو کو سرلا سے خاص دلچسپی تھی اور یوں بھی سرلا کچھ ان پڑھ نہ تھی گو کہ اس سے بہت کم لوگ واقف تھے کہ اُس نے پڑھنا لکھنا کب اور کیسے سیکھا تاہم ہر شخص جانتا تھا کہ وہ گاؤں میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی اور عقلمند ہے۔ سرلا جب بیاہ کے بعد ہرش بابو کے گھر آئی تو لوگ کہتے ہیں کہ کچھ دنوں تو وہ کھوئی کھوئی اور بیوقوف سی نظر آتی رہی۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی۔ اُس کے سلیقے اور حسن انتظام نے ہرش بابو کو گاؤں کا مکھیا بنا دیا ــــ ہرش بابو نہایت روشن خیال اور تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ اپنی بیوی سے اُنہیں خاص اُنس تھا۔ لوگ کہتے کہ ازل ہی سے سرلا اور ہرش بابو ایک دوسرے کے لئے مقدر ہو چکے تھے۔

ایک دن موسم بہت اچھا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو جانے کے بعد آسمان کھل گیا تھا۔ سرلا کا جی گھر سے اکتایا تو وہ نکل کر جنگل میں آ گئی۔ دیر تک ادھر اُدھر گھومتی رہی۔ پھر وہ اُس پیڑ کے قریب آئی۔ جہاں کسی زمانہ میں وہ احمد سے سبق پڑھا کرتی تھی۔ اُسے پُرانے واقعات یوں یاد آ رہے تھے۔ جیسے کہ اُس نے کسی کتاب میں پڑھے ہوں۔ آہستہ آہستہ اُس کے تصور نے دس سال کی مسافت طے کر ڈالی۔ احمد کا کہا ہوا ایک شعر فضاؤں میں اُڑتا ہوا اُسے سُنائی دے گیا۔ وہ اس وقت درخت ہی کی طرح خاموش، ساکن، باعظمت اور مُتبرک معلوم ہو رہی تھی پھر ایک غیر اختیاری جذبہ کے تحت وہ درخت کے سامنے گھٹنوں کے بل جُھک گئی اور چند لمحوں کے لئے یوں سنجیدہ ہو گئی گویا کہ وہ عبادت میں مصروف تھی۔ عین اس وقت کسی نے اس کا نام لیکر پکارا اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ پکارنے والا احمد تھا۔ سرلا گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی "احمد" اُس کی زبان سے نکلا اور پھر اُس نے اس طرح سر جھکا لیا جیسے کوئی جُرم کرتے میں پکڑی گئی ہو۔ احمد اس کے چہرے کے تاثرات کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اس کی سُہاگ کی نشانی سیندور پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا "سرلا اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ اگر تم ایک لمحہ پہلے آتیں تو مجھے بھی اسی قسم کی احمقانہ حرکت کرتا پاتیں۔ سرلا انسان ماضی کو بھول سکتا ہے فراموش کر سکتا ہے۔ لیکن ماضی اُسے نہیں بھول سکتا۔ وہ سایہ کی طرح ہر وقت اُس کے ساتھ رہتا۔ آدمی کی ہر چیز اس سے علیحدہ کی جا سکتی ہے لیکن اس کا ماضی کسی طرح بھی اس سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔"

"احمد" سرلا نے بیتاب ہو کر کہا "یہ تو میں نہیں جانتی کہ تم یورپ سے کب واپس آئے اور کیا کیا ڈگریاں لے کر آئے تاہم مجھے کچھ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تم پہلے سے کہیں زیادہ سفاک ہو گئے ہو، تم ناقابل برداشت حد تک بے رحم ہو۔ پہلے تم اس کا جواب دو کہ تم یہاں کیوں آئے؟ اور اگر آئے بھی تھے تو تم نے ایسی عجیب غریب باتیں کرنا کیوں شروع کر دیں؟" سرلا اپنے آنسوؤں کو روکنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔ اُس نے اپنے جذبات اور احساسات کو نہایت کامیابی سے چھپا ڈالا تھا جبکہ وہ ایک ناتجربہ کار لڑکی تھی لیکن اب جبکہ وہ ایک بیوی اور ایک ماں تھی۔ وہ انھیں چھپانے پر قادر نہ تھی۔ احمد نے اپنا مُنہ اُس کی طرف سے پھیر لیا۔ وہ اُس کی باتوں کا جواب نہ دینا چاہتا تھا۔ اُس کے لہجے کی تلخی میں وہ حلاوت تھی جو اُسے مطمئن اور مسرور کر رہی تھی۔ سرلا خاموش پیڑ کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ احمد جب دور نکل گیا۔ تو وہ بھی آہستہ آہستہ گھر کی طرف چل دی ——

اس شام ہرش بابو کو تعجب ہی رہا کہ سرلا ان سے اسقدر زیادہ خوش خلقی کیوں برت رہی ہے۔ وہ بات بات پر ہنس رہی تھی۔ کھلی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آج سے پہلے اپنی متاہلانہ زندگی میں کبھی اتنی مطمئن نہ ہو سکی تھی۔ تاہم یہ ایک واقعہ ہے کہ جب شام کی چاء کے بعد ہرش بابو لمبے لمبے قدموں کے ساتھ صحن میں ٹہل رہے تھے تو سرلا نے بڑی بے چینی سے اپنے دل میں سوچا کہ اُنکی چال میں ذرا سی بھی دلکشی نہیں اور یہ اُن کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ چھوٹی ہیں۔ پھر رات میں جب سونے کے لئے جانے لگی تو تھوڑی دیر تک اپنی خوابگاہ کی کھڑکی میں ساکت بیٹھی رہی۔ چاند کی شعاعیں اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ رو رہی تھی اُس کا ہر آنسو چاند کی منعکس شدہ شعاعوں کی وجہ سے بجائے خود ایک چھوٹا سا چاند بنا ہوا تھا۔ اس کے دریائے ہستی کے ٹھہرے ہوئے پانیوں کو آج کسی نے متحرک کر دیا تھا اور گو کہ متحرک کرنیوالی چیز تہہ میں ڈوب چکی تھی لیکن سطح پر ابھی تک ایک ہیجان سا برپا تھا اور بلبلے اُٹھ رہے تھے۔

عین اس وقت احمد شہر کے ایک شاندار ہوٹل میں بیٹھا شراب پی چلا جا رہا تھا شراب کی حدت سے اسکا چہرہ تمتما رہا تھا اور اُسکی پیشانی پر نیلی نیلی رگیں اُبھر آئی تھیں "عورت اپنے آنسوؤں سے اپنے آپ کو تسکین دے سکتی ہے اور مرد جام شراب سے" اس نے زیر لب کہا "قدرت کی نظر میں دونوں قابل رحم ہیں" اُس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور ایک لبالب جام کو

۴ ایک ہی سانس میں خالی کر دیا ——

خاص تنویر کیلئے

غیر مطبوعہ

تیرے بغیر...!!

از محترمہ سیدہ نواب سردار بیگم صاحبہ اختر (حیدرآبادی)

ہیچ ہے رعنائیِ شام و سحر تیرے بغیر
کس قدر بے کیف ہے ذوقِ نظر تیرے بغیر

یاد آیا ہے! کہ جب ہر سانس تھی پیغامِ کیف
ہر نفس ہے آج تیر و نیشتر تیرے بغیر

اب کہاں دیکھوں تری موجِ تبسم کا جمال
اب کہاں سے لاؤں وہ نورِ سحر تیرے بغیر

ہو گئے تھے جمع جو تیری ہوائے لطف سے
پھر وہی ذراتِ دل ہیں منتشر تیرے بغیر

تیری نظروں نے بتائیں دردِ دل کی عظمتیں
اب کہاں سے پاؤں میں اپنی خبر تیرے بغیر

جس کی خود تعمیر کی تیری نگاہِ لطف نے
کیا کروں میں اب وہ دنیائے دگر تیرے بغیر

جو ازل سے آج تک تھا وقفِ تشریح و بیاں
ہے وہی افسانۂ دل مختصر تیرے بغیر

دیدۂ یاس آفریں سے میرے دیکھے تو کوئی
کس قدر بے نور ہیں شمس و قمر تیرے بغیر

آہ پیہم وہ کہاں! وہ جذب کا عالم کہاں!!
نالۂ برہم ہے محرومِ اثر تیرے بغیر

بتکدے سے کوئی مطلب ہے نہ کعبے سے غرض
سرنگوں بیٹھے ہیں اربابِ نظر تیرے بغیر

حالتِ دل کیا کہوں؟ افسانۂ دل کیا کہوں؟؟
عالمِ دل آج ہے زیر و زبر تیرے بغیر

اب کہاں تیری نظر کی ہلکی ہلکی لرزشیں
اب فضاؤں میں کہاں رقصِ شرر تیرے بغیر

ایک تیرے دم ہی تک تھا لطفِ شعر و شاعری
کس طرح اختر کہے نظمِ دگر تیرے بغیر؟

شرخ و مال

از
وسنت آفریدی

(طبعزاد)

دریائے گومتی کے شمال میں ایک چھوٹا سا قصبہ بیت گڑھ کے نام سے مشہور تھا۔ قریباً دو تین سو مکانات اور جھونپڑیاں ہونگی حکیم شمشیر خاں کا مکان بھی اس قصبہ کے آخری کونے پر تھا۔

شمشیر خاں یک ادھیڑ عمر کے تنومند انسان تھے۔ یہ بہت کم گو اور تنہائی پسند شخصوں میں سے تھے۔ بہت کم کسی سے ملتے جلتے تھے۔ اکثر مکان ہی پر رہتے تھے۔ شاذونادر ہی باہر نکلتے تھے ان کا حلقۂ احباب صرف فقیروں اور سنیاسیوں ہی تک محدود تھا۔ گزر اوقات کے لئے انھوں نے عطّاری کے ساتھ ساتھ پنساری کی دوکان بھی کھول رکھی تھی۔ کچھ شُد بُد طب سے بھی واقف تھے اکثر گاؤں کے لوگوں کا علاج کیا کرتے تھے اس لئے عام طور پر حکیم جی کے نام سے مشہور تھے۔ لیکن سب سے تعجب خیز بات اگر تھی تو یہ تھی کہ ابتک انھوں نے شادی نہیں کی تھی لوگ جب اُن سے اس کا سبب پوچھتے تو کہتے کہ ارے شادی کس لئے کروں کھانا مل ہی جاتا ہے۔ آدھی عمر ہونے کو آئی اب کیا بوڑھاپے میں شادی کروں عیب جوانی میں ہی کی اور دوسرے عورت کی بیوفائی تو مشہور ہے۔ کم از کم مجھے تو اس پر پورا یقین ہے۔ مگر جب لوگوں نے بہت اصرار کیا تو آخر ایک روز حکیم صاحب نے بھی شادی کر ہی لی۔ واقعی کسی مرد کا بغیر عورت کے زندگی گزارنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ غرضکہ خوب دعوتیں ہوئیں۔ اور گاؤں کے بوڑھوں اور بڑھیوں کو باتیں کرنے کا ایک نیا مضمون ہاتھ آیا —— زمیندار صاحب کے یہاں بھی اسی کا چرچا تھا! "سنا ہے کہ دُولہن کسی شہر سے لائے ہیں" "زمیندارنی صاحبہ نے کہا" جبھی تو وہ پردہ وردہ بھی نہیں کرتی اور ہندوؤں کی طرح ساڑھی باندھتی ہے۔

"ایک بڑی بی بولیں" کل میں دوا لینے گئی تو کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی ارے سلام تک نہ کیا۔ ابھی بیس دن ہوئے شادی کے اور گھونگٹ غیب (غائب) میں نے پوچھا حکیم جی کہاں ہیں۔ کہنے لگی کوئی دوا بنا رہے ہیں۔ میں نے کہا ذرا بلا دے تو کہنے لگی میاں ان کے دوائیوں کے کمرے میں نہیں جاتی ایک ہمسایہ بولی" ارے منو کی بھی کچھ خبر خیریت آئی ہے" گنگو کی اماں بولیں۔ علیگڈھ کے مسٹر معین الدین جو زمیندار صاحب کے اکلوتے لڑکے تھے بیت گڑھ میں صرف "منّو" رہ گئے تھے یہ ابھی انہی کا ذکر تھا۔

ہاں منّو کے ابّا تو کہہ رہے تھے کہ خط آیا ہے خیریت سے ہے آٹھ مہینے کے بعد آئے گا۔ زمیندارنی صاحبہ نے کہا۔

بی بی یہ تمہارا ہی دل تھا جو اپنے لڑکے کو کالے کوسوں ڈال دیا مہترانی نے جھاڑو دیتے ہوئے کہا۔ میں نے بہت منع کیا۔ لیکن اس کے باپ بھلا سنتے ہیں کسی کی ؟ جانتی ہو تم حکیم صاحب اگر دن کو رات کہدیں تو وہ بھی رات ہی کہیں بس ذرا سا حکیم صاحب نے اشارہ کیا اور میرے سر ہو گئے کہ لڑکے کو بھیج دو۔ علم حاصل کرے گا۔ زمیندارنی صاحبہ نے کہا۔

آج زمیندار صاحب کے یہاں بہت چہل پہل ہے کیونکہ آج اُن کے اکلوتے لڑکے معین الدین علیگڈھ سے تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں۔ جس کی خوشی میں دعوت دی گئی ہے۔ حکیم صاحب بھی منّو سے مل کر بہت خوش ہوئے کہنے لگے کہ ارے میاں معین ہمارے پاس انگریزی نسخوں کی ایک کتاب ہے ذرا ان نسخوں کو اردو میں لکھا دینا۔ اگر تکلیف نہ ہوا کرے تو ذرا شام کو ٹہلتے ہوئے نکل آیا کرو۔ معین نے وعدہ کر لیا۔

منّو اب روز حکیم صاحب کے یہاں جانے لگا اور کچھ دنوں بعد وہی ہوا جو ہونا تھا۔ یعنی حکیم صاحب کی نوجوان دُلہن اور منّو میں رفتہ رفتہ محبت ہو گئی۔ سعیدہ (حکیم صاحب کی بیوی) کی کہانی بھی عجیب تھی۔ وہ ایک غریب خاندان کی لڑکی تھی اور اردو فارسی وغیرہ خوب جانتی تھی۔ مگر والدین نے صرف پیسے کی لالچ میں حکیم صاحب کو بیاہ دیا تھا گو حکیم صاحب اپنے شوہرانہ فرائض میں کبھی کوتاہی نہ کرتے، آج تک سعیدہ کو اچھا کھلایا اچھا پہنایا اور ایسی آرام دہ زندگی بخشی جس کا وہ صرف خواب ہی دیکھ سکتی تھی۔ لیکن سعیدہ کچھ اور چاہتی تھی اُسے شروع ہی سے کچھ حکیم صاحب سے نفرت پیدا ہو گئی تھی اس کو کسی ایسے ہمدرد کی تلاش تھی جو گھنٹوں بیٹھا اُس سے پریم اور محبت کی باتیں کیا کرے۔ وہ شوخ اور چنچل تھی۔ برخلاف اس کے اُس نے کبھی حکیم صاحب کو مسکراتے ہوئے بھی نہ دیکھا تھا۔ دن بھر وہ اپنے خاص کمرہ میں رہتے تھے۔ جس کا راز کسی کو معلوم نہیں تھا صرف دوپہر کو کھانے کے وقت یا رات کو کچھ معمولی سی گفتگو ہو جایا کرتی تھی۔ سعیدہ پر اس سنجیدگی نے بُرا اثر ڈالا!

منّو کسی نہ کسی بہانے روز حکیم صاحب کے یہاں پہنچتا۔ سلام دعا ہوتی اور منّو حکیم صاحب کو خاص کمرہ میں چھوڑ کر سعیدہ کے پاس چلا آتا۔ اکثر حکیم صاحب کے سامنے بھی منّو اور سعیدہ میں گفتگو ہوا کرتی اور حکیم صاحب کوئی اعتراض نہ کرتے۔

پر کہیں محبت بھی چھپا کرتی ہے ؎

دل سے اُٹھتی ہے آنکھ سے برستی ہے

جو کسی سے چھپ سکے یہ وہ مستی ہے

آخر کار حکیم صاحب کو بھی معین اور سعیدہ کی محبت کا پتہ لگ گیا اور اُنہوں نے صاف لفظوں میں سعیدہ کو متنبہ کر دیا کہ معین سے زیادہ پینگ نہ بڑھاؤ۔ یہ سن کر سعیدہ پر گویا پہاڑ پڑا۔ جدائی کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا مگر اس نے استقلال سے جواب دیا۔ "حکیم صاحب مجھے معلوم ہے کہ آپ کو میری طرف سے بدگمانی ہو گئی ہے۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ بیشک ہمارا ساتھ رہنا، چاندنی راتوں میں ندی کی سیر کرنا ایک دوسرے سے محبت کی باتیں کرنا یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو ضرور بدگمانی پیدا کرتی ہیں۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ محبت کوئی گناہ نہیں اور وہ بھی پاک محبت! منّو مجھ سے محبت ضرور کرتا ہے۔ لیکن ایسے ہی جیسے ایک بھائی اپنی بہن سے۔ میں اس سے اپنا جی بہلاتی ہوں۔ آپ کسی سے ملتے جلتے نہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں بھی گونگی بہری ہو جاؤں۔"

"بیگم خیال رہے آئندہ میری بیوی بغیر میرے حکم کسی سے نہیں مل سکتی۔" حکیم صاحب نے کہا۔

"لیکن اگر شوہر لا پرواہ ہو اور بیوی اپنے بھائی سے دل بہلائے تو؟" سعیدہ بولی ———

"میں تم سے سبق پڑھنے نہیں آیا۔" حکیم صاحب گرج کر بولے

اس کے بعد ہفتوں ایک دوسرے سے نہ بولے۔ ہاں اس عرصہ میں تو کبھی کبھار آتا رہا۔

ـــــــــــ

ایک روز دونوں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے یکایک حکیم صاحب کی نظر ایک سُرخ رومال پر پڑی جسے سعیدہ نے اپنے گلے میں باندھ رکھا تھا۔

یہ رُومال کہاں سے آیا؟ حکیم صاحب نے پوچھا۔

"مجھے منّو نے تحفتاً دیا ہے" سعیدہ نے جواب دیا۔

"میری عورت کسی سے تحفے نہیں لیتی ادھر لاؤ۔ رومال مجھے دو" حکیم صاحب بولے۔

لیکن یہ تو ایک بھائی کی پاک محبت کا آئینہ ہے! سعیدہ نے کہا۔

اسی لئے تو مانگ رہا ہوں کہ یہ منّو کا تحفہ ہے مجھے دو بیگم، حکیم صاحب نے ہاتھ بڑھایا۔ نہیں میں کبھی اسی لئے نہیں دے سکتی کہ یہ منّو نے مجھے دیا ہے سعیدہ جھنجھلا کر بولی۔

ادھر لاؤ مجھے دو، میں کہہ رہا ہوں مجھے دو، حکیم صاحب نے ترش ہو کر کہا — "نہیں میں کبھی نہ دوں گی" سعیدہ نے غصہ میں کہا۔

بیگم خیال رہے میں تمہارا شوہر ہوں حکیم صاحب نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں جانور ہوں۔ آپ مجھ سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کر رہے ہیں۔ سعیدہ نے جل کر کہا"

خیر جو کچھ بھی ہو۔ تمہیں رومال دینا پڑے گا۔ حکیم صاحب بولے

ابھی نہیں میں ہرگز نہیں دوں گی۔ ہرگز نہیں۔ سعیدہ نے استقلال سے جواب دیا۔

نہیں دو گی تم؟ حکیم صاحب نے پوچھا۔

نہیں! کبھی نہیں! سعیدہ کا جواب تھا اور وہ رونے لگی

حکیم صاحب کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے "لاؤ ادھر لاؤ" کہتے ہوئے انھوں نے ہاتھ بڑھایا۔ نہیں نہیں میرا رومال مت لو سعیدہ نے روتے ہوئے کہا ایک خونخوار درندے کی طرح شمشیر خاں نازک سعیدہ پر کود پڑے ہر چند سعیدہ نے رومال بچانے کی کوشش کی۔ مگر شمشیر خاں کے طاقتور ہاتھوں کے آگے ایک نہ چلی۔ سعیدہ خوب چیخ چیخ کر رونے لگی۔

میرا رومال دے دو۔ میرا رومال دے دو سعیدہ نے روتے ہوئے کہا کیونکہ یہ تمہارے منّو کا ہے اس کی نشانی ہے اس لئے نا۔

خبردار جو آئندہ سے اس کا نام بھی لیا۔ میں آج ہی اس کا آنا جانا بند کرتا ہوں۔ حکیم صاحب بولے۔

لیکن میں نے تو اسے پیر کے دن کھانے پر بلایا ہے سعیدہ بولی۔

بیگم سنو! اب تم اس کی دعوت نہیں کر سکتیں اب وہ یہاں نہ آنے پائے — حکیم صاحب نے غصہ سے کہا اور اپنے کمرہ خاص میں چلے گئے۔ بیگم وہیں بیٹھی رہیں قریباً چار گھنٹے کے بعد باہر نکلے کہنے لگے چلو سو گی نہیں؟۔

آپ نے میری نیند اور چین چھین لیا ہے۔ آپ میری فکر نہ کیجئے۔ جب نیند آئے گی سو جاؤں گی سعیدہ نے جل کر کہا۔

میری بلا سے جگو جگتی ہو تو" کہتے ہوئے حکیم صاحب سونے کے کمرہ میں چلے گئے۔

قریباً آدھے گھنٹہ تک بیگم اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی رہیں، پھر وہ اٹھی اور دبے پاؤں حکیم صاحب کے کمرہ خاص کی طرف چلی جس میں جانے کی حکیم صاحب کی طرف سے سخت ممانعت تھی وہ وہ منّو کی نشانی ہاں آج اپنے پیارے بھائی کی نشانی ہر طرح اور ہر قیمت پر حاصل کرنے کو تیار تھی۔ آہستہ آہستہ وہ کمرے کے دروازے۔

تک پہنچی۔ دیکھا تو قفل لگا ہوا تھا۔ وہ اُلٹے پاؤں واپس ہوئی
حکیم صاحب خراٹے بھر رہے تھے اس نے جیب میں سے
چابی نکالی اور واپس آئی۔ دروازہ کھولا۔ اندر جاکر دیکھا
بہت سی شیشیاں اور ڈبے وغیرہ رکھے ہوئے تھے اور سامنے
اسی پر ایک سرخ رومال پڑا ہوا تھا۔ خفیف سی نمی تھی ایسا معلوم
ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے دھو کر سکھانے کے لئے ڈال دیا ہے
اس نے جھپٹ کر رومال اتار لیا۔ اور اپنے سینے کے پاس
رکھ لیا۔ وہ واپس لوٹنے ہی والی تھی کہ اس کو ایک جگہ مٹی
کھدی ہوئی نظر آئی۔ اس نے سوچا آج یہ کمرہ خوب اچھی طرح
دیکھنا چاہئے آخر اس کمرہ کی اتنی احتیاط کیوں کی جاتی ہے
اس نے کمرہ میں چاروں طرف گھومنا شروع کیا۔ ہزاروں
بوتلوں میں کئی طرح کی دوائیں اور زہر بھرے ہوئے تھے
ایک جگہ چلتے چلتے اس کا پاؤں دھنس گیا اسے کچھ شک ہوا اس نے
مٹی ہٹا کر دیکھا تو آہ .... وہ سکتے میں آگئی .....
لاش تھی۔ اس نے جی کڑا کر کے چہرہ دیکھا ارے یہ تو "ملیا"
تھی۔ آہ حسین کمسن گوالن کی لڑکی جو آج دو روز سے غائب تھی
یکایک اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا حسین لڑکیوں کے غائب
ہو جانے کی افواہیں وہ بہت سن چکی تھی۔ لاش میں تعفن پیدا ہو رہا
تھا۔ اس نے جلدی جلدی مٹی ڈال دی اور زمین پہلے کی
طرح ہموار کر دی اور واپس آگئی۔ اس وقت اس کا خیال عجیب
عجیب خیالات کا جگہ بنا ہوا تھا۔ کبھی وہ چاہتی تھی کہ اسی وقت
جاکر پولیس کو خبر کر دے۔ کبھی حکیم صاحب سے ڈر لگتا۔ اس نے
گھبرا کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لئے۔ اور پھر رومال نکال کر
دیکھنے لگی۔ رومال دیکھ کر وہ کچھ بیخود سی ہو گئی کم از کم رومال
کے معاملے میں حکیم صاحب کو شکست ہو گئی تھی اور اب اس کا پیارا
رومال سے مل گیا تھا۔ باوجود اس قدر ہولناک انکشافات کے
اس کو نیند آگئی وہ سو گئی!

خلاف معمول صبح حکیم صاحب اس سے بہت نرمی سے پیش
آئے کہنے لگے معاف کرنا بیگم رات کو ...... ؟
اچھا تو میرا رومال دے دو؟ بیگم نے کہا۔
لے لینا۔ حکیم صاحب بولے اور سنو جو تم نے منو کی دعوت کی
ہے نا تو اس کے لئے سامان کیا کیا چاہئے۔ میں شہر جا رہا
لیتا آؤں گا۔ سعیدہ جانتی تھی کہ آج کی یہ رات بعد یہ کایا پلٹ کیسی۔
کہیں ان کو کمرے کی تلاشی کا حال تو نہیں معلوم ہو گیا خیر اس نے
بڑے تپاک سے کہا آپ جانتے ہیں کہ منو تعلیم یافتہ
شہری ہے عرصے سے رہا ہے اس کے لائق دعوت ہونا چاہئے
کچھ کیک۔ بسکٹ۔ سگریٹ، سوڈا لیمن کی بوتلیں لے لینا باقی
انتظام میں کروں گی مگر پیر کو تو دعوت ہے۔ آج اتوار ہے۔ ابھی
سے انتظام شروع کر دوں۔

حکیم صاحب کے جانے کے بعد سعیدہ سوچنے لگی کہ اگر آج منو
آجائے تو کیوں نہ حکیم صاحب کے کرتوت منو سے بیان کر کے ان کو قید
کرا دوں، مگر جب وہ یہ سوچتی کہ حکیم صاحب کو پھانسی ہو گی
تو یکایک اس کو حکیم صاحب پر رحم آنے لگتا۔ یہی وجہ تھی کہ شام
کو جب منو آیا تو وہ مصمم ارادہ کر چکی تھی کہ وہ حکیم صاحب کا راز کسی کو
نہ بتلائے گی۔ اور اگر حکیم صاحب نے اسے منو سے ملنے کے
لئے منع کیا تب وہ اس راز کے افشا کرنے کی دھمکی دے گی۔ شام
کا وقت تھا منو اور سعیدہ ایک کھیت کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے محو
گفتگو تھے۔ سعیدہ نے کہا۔

"معین بھائی کل آپ کی دعوت ہے میاں ... ۱۲ بجے مگر ذرا جلدی آجانا ـــــــ"

"شکریہ مگر سعیدہ تم مجھ سے اتنی محبت کیوں کرتی ہو" معین نے پوچھا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، بہن بھائی سے محبت کرتی ہی ہے" سعیدہ نے مسکراکر کہا۔

"تم بڑی اچھی ہو۔ سعیدہ" معین نے سعیدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا

"کیا سچ مچ معین بھائی تم نے کہا تھا کہ مجھ کو انگریزی پڑھایا کروگے" سعیدہ بولی۔

"ہاں مگر پہلے مٹھائی کھلانا ہوگی ـــــ کیوں کھلاؤگی؟" معین نے پوچھا

"ہاں ہاں کیوں نہیں ماسٹر صاحب" سعیدہ نے مسکراکر جواب دیا۔

"بہن سعیدہ؟ ...."

"کیا معین بھائی! ...."

چلو گھر تک تم کو چھوڑ آؤں۔ یہ کہتے ہوئے دونوں اٹھ کھڑے ہوئے!

آؤ آؤ معین میں تو تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ حکیم نے کہا۔ ذرا سعیدہ کو تو دیکھو کیسی کام میں منہمک ہے۔ کمبخت کو رات بھر نیند ہی نہیں آئی۔ آدھی رات سے ہی اٹھ بیٹھی ہے۔

معین نے نظر پھرائی۔ جس کا جواب ایک ہشاش بشاش مسکراہٹ سے ملا۔ اور سعیدہ یہ کہتی ہوئی دوڑی آئی "معین بھیا تم آ گئے کتنی دیر کردی"؟

"ہاں دیر تو ہو گئی" معین نے کہا۔

جلدی جلدی سعیدہ نے میز کرسی پر کھانا جمایا اور سب کھانے بیٹھے۔ سعیدہ نے اپنے ہاتھ سے طرح طرح کی چیزیں پکائی تھیں۔ خاص کر کچے پھلوں کا سلاد اور پڈنگ بڑے اہتمام سے تیار کیا تھا غرضکہ بڑی دلچسپی رہی۔ خلاف معمول آج حکیم صاحب بھی خوش سے تھے ـــــ

کھڑ کھڑ کھڑام کھٹ .... میاؤں ....

اے بلی نے سب دودھ گرادیا۔ سعیدہ نے چلاکر کہا اور دوڑی باورچیخانہ کی طرف۔ واپس آئی تو حکیم صاحب بولے کچھ پروا کی بات نہیں ہیں دودھ کا ڈبہ بھی ساتھ لایا ہوں ہیں کھالیتی آؤ۔

پہلا بسکٹ کے ٹین (ٹین کے ڈبے) چاقو سے کاٹے گئے لیکن دودھ کے ڈبہ پر چاقو پھسل پھسل جاتا آخر تنگ آکر حکیم صاحب نے معین سے کہا ذرا ڈبے کو نیچے سے پکڑ لو اور پھر چاقو بازی شروع کردی۔

آہ ..... منو کی چیخ نکلی۔

اے معاف کرنا۔ حکیم صاحب نے کہا۔ اتفاقاً چاقو پھسل کر ہاتھ پر لگ گیا۔ سعیدہ جلدی سے معین کے پاس پہنچی ایں یہ کیا ہوا

"اُوہ اتنا بڑا زخم کتنا خون بہہ رہا ہے" سعیدہ بولی۔

"کچھ نہیں اتفاقاً لگ گیا" معین نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

جلدی سے سعیدہ نے وہی سرخ رومال نکالا اور معین کے ہاتھ پر باندھ دیا۔

اچھا یہ رومال تم کو پھر مل گیا۔ اسے پانی سے تر کردو حکیم صاحب ایک معنی خیز انداز سے بولے

سعیدہ کا رومال پر پانی ڈالنا تھا کہ معین چیخیں مارنے لگا۔

"سعیدہ پیاری سعیدہ اس ظالم رومال کو جلدی ہٹاؤ۔ میرے تمام جسم میں آگ لگ رہی ہے۔ خدا کے لئے سعیدہ کھولو یہ خونی رومال ـــــ یکایک وہ تیورا کر زمین پر آرہا!

سعیدہ نے جلدی سے رومال کھولا۔ معین کا سر ہٹا کر پانی کے چھینٹے دیے مگر افسوس وہ مر چکا تھا۔ سعیدہ کی پھٹی ہوئی آنکھیں حکیم صاحب کی طرف اٹھیں۔ اوہ سمجھ گئی تم سوالاں پہلے ہی ہر جذب

مر چکے تھے۔ آہ سین بھائی — اگر ٹھیرو تم بچ نہیں سکتے۔ میں تمھارے خاص کمرہ یا بنگلہ ہوں کے قبرستان کی خبر ابھی پولیس کو کرتی ہوں۔ یہ کہکر وہ دروازے کی لپکی مگر حکیم صاحب کا ہاتھ اُس کی گردن پر تھا۔ بیگم دیکھا یہ انتقام۔ سعیدہ نے آنکھیں پھیر لیں اور آج اُس نے حکیم صاحب کے قہقہہ کی آواز سنی۔ یکا یک ہوا میں ایک خنجر چمکا۔ اور سعیدہ کی لاش زمین پر تڑپے بغیر ٹھنڈی ہو گئی تھوڑی دیر بعد حکیم صاحب دونوں لاشوں کو گھسیٹتے ہوئے اپنے خاص کمرہ کی طرف جارہے تھے —

پھولوں کی ڈالی

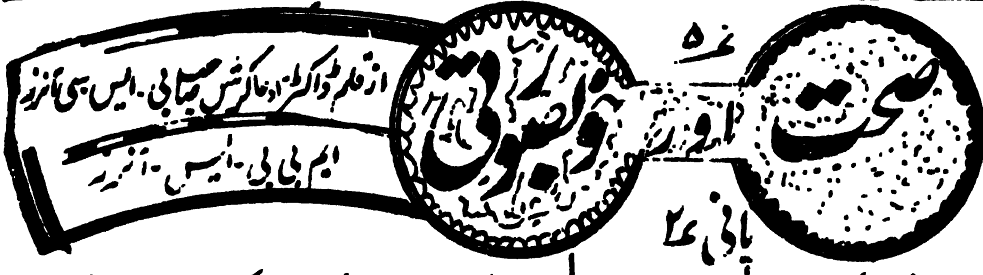
نتیجۂ فکر حضرت مولانا محمود اسرائیلی صاحب۔

یہ پھولوں کی ڈالی ہے کہ پاکیزہ دھنک ہے — یا دھانی دوپٹے میں ستاروں کی لڑی ہے
پریوں کا مگس راں ہے کہ پروینِ فلک ہے — یا لعل وزمرد میں لدی حور کھڑی ہے

بلبل کی طرح برگ جو پر تول رہے ہیں — ممکن ہے کہ ہوں سوئے چمن مائلِ پرواز
طوطی کی طرح یہ جو زباں کھول رہے ہیں — ممکن ہے کہ دکھلائیں کوئی نغمہ کا اعجاز

ہر برگ میں آویزاں ہیں شبنم کے نگینے — اور عکس فگن اُن میں ہے خورشید کی تنویر
چھوٹا سا فلک اس میں ستاروں کے دفینے — یا جلوہ نما سینکڑوں مہتابوں کی تصویر

جو پھول شگفتہ ہے وہ ہے دیدۂ بیدار — اور ہر ورقِ گل میں ہے مژگاں کی تحریر
تو دیکھ نہ اِن پھولوں کو محمود خبردار — ہر پھول میں پوشیدہ ہے اک عالمِ تسخیر



گلاب کو رات کاٹنا مشکل ہو گئی۔ دوسرے دن ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر حاضر ہو گئی۔ جاتے ہی پوچھا "چچا جان۔ اب بتلائیے کہ پانی جیسی معمولی چیز کیونکر ایک نعمت ہے"

ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا "بیٹا سنا تھا تمھیں ویسا ہی پایا۔ سچ مچ تمکو جس بات کی دھن ہو تم اسکا پیچھا کرکے ہی رہتی ہو بیٹا یہ لگن بری چیز نہیں۔ لو سنو۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تمھارے جسم میں سب اعضاء کو خوراک کس ذریعہ سے پہنچتی ہے"

گلاب نے سوچ کر جواب دیا "خون سے"

"ٹھیک ہے لیکن خون مائع ... کا کیا سبب ہے"

گلاب نے ہنستے ہوئے کہا "میں سمجھ گئی۔ آپ کہنا چاہتے ہیں کہ خون کی مقدار بنانے کے لئے اور اسے پتلا رکھنے کے لئے پانی کی اشد ضرورت ہے"

ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا "ٹھیک ہے بیٹا! لیکن اب یہ بھی بتلاؤ کہ خوراک تو تم ٹھوس کھاتے ہو اور منہ میں چبا کر باریک کرتے ہو یہ کس شکل میں خون میں ملتی ہے"

گلاب نے کہا "معلوم ہوتا ہے یہ بھی تو مائع شکل ہی اختیار کرتی ہے۔ تبھی یہ انتڑیوں کی دیواروں میں سے جذب ہو کر خون میں جاتی ہے۔ یہ بات تو ہم نے تحریر میں پہلے ہی خوراک کے مسئلہ میں پڑھ رکھی ہے"

ڈاکٹر صاحب "یہ بہت ٹھیک۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ خوراک آخر میں پانی میں ہی حل ہوتی ہے اور یہ تحلیل شدہ خوراک خون میں ملتی ہے۔ خون کو پتلا رکھنے کیلئے پانی کی ضرورت ہے"

تو اچھی گلاب۔ اب یہ بتاؤ کہ جب خوراک اعضاء میں خون کے ذریعہ پہنچتی ہے اور اعضاء کا ہی حصہ بنجاتی ہے تو اعضاء اس غذا کے بدلے میں خون کو کیا دیتے ہیں؟"

گلاب نے سوچ کر کہا "چچا جان یہ بات تو بتانا مشکل ہے۔ البتہ یہ سمجھ آتی ہے کہ اعضاء خون کو فضلہ ہی دیتے ہونگے"

ڈاکٹر صاحب نے خوش ہو کر کہا "ٹھیک۔ بہت ٹھیک تم تو سچ مچ سمجھدار لڑکی ہو۔ یہ فضلہ بھی خون کے ذریعہ ہی گردوں اور جلد تک پہنچتا ہے گردوں میں سے تو یہ پیشاب بن کر باہر نکلتا ہے اور جلد کے راستے پسینہ بنکر باہر نکلتا ہے۔ اور جلد کے راستے پسینہ بن کر دونوں ہی پیشاب اور پسینہ پانی جیسی چیزیں ہیں لہٰذا عیاں ہوا کہ فضلہ کو جسم سے نکالنے کے لئے بھی پانی کی ضرورت ہے۔ اب ذرا اور سوچو جس دن تم کو پانی پینے کے لئے نہ ملے تو کیا تم بیان کر سکتی ہو کہ تمھاری کیا حالت ہو جاتی ہے"

گلاب نے جواب دیا "چچا جان۔ جس دن پانی نہیں ملتا خاص کر جب ہم سیر کرنے جائیں اور کئی گھنٹہ تک پانی نہ ملے تو حلق تو بالکل ہی سوکھ جاتا ہے۔ آواز نہیں نکلتی۔ باتیں کرنا مشکل ہو جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جسم سے طاقت کھنچی جا رہی ہے۔ مجھے یاد ہے جب مجھے ایک بار دن بھر پانی نہ ملا تھا تو میں اتنی لاغر ہو گئی تھی کہ چل پھر نہ سکتی تھی۔ جسم کمزور ہو گیا تھا۔ گال اور آنکھیں تو اندر کو دھنس گئی تھیں۔ بابا جان کہتے تھے کہ میری آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں ان میں چمک نہ رہی تھی۔ میری جلد تو سوکھ ہی گئی تھی اس میں چمک تو نام کو بھی نہ رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا "شاباش صاحب۔ ایسا مکمل اور اعلیٰ بیان! لیکن تم نے سب باتیں یک ساتھ کہہ ڈالیں۔ ذرا ان کی تشریح تو کر دیں۔ تمہارا حلق سوکھ گیا یعنی کہ لعاب بننا بند ہو گیا ٹھیک اسی طرح جتنے بھی رس جسم میں پیدا ہوتے ہیں سب سوکھ جاتے ہیں۔ لعاب، معدہ اور انتڑیوں کے رس۔ جلد کو نرم رکھنے والے اجزاء۔ دماغ کا پانی بھی تو سوکھ جاتا ہے۔ خون کی مقدار بھی کم ہو جاتی ہے۔ خون اپنی مقدار کی کمی پورا کرنے کے لئے پانی اعضا سے کھینچتا ہے جس سے جسم کے سب اعضا تیچے ہو جاتے ہیں۔ جس کا ظاہر ثبوت یہ ہے کہ جیسا تم نے کہا گال اور آنکھیں اندر کو دھنس گئے جسم لاغر ہو گیا۔ وغیرہ۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ جسم کو نرم اور لچکیلا اور تر رکھنے کے لئے پانی کی ضرورت ہے۔ میں مبالغہ نہیں کرتا جب یہ کہتا ہوں کہ جسم کا اسی فیصدی حصہ پانی کا ہے اور باقی بیس فیصدی دوسرے اجزا کا۔ پانی کو معمولی چیز نہ سمجھو۔ صرف صحت میں ہی نہیں بلکہ بیماری میں بھی اس کی ضرورت ہے کیا تم نہیں جانتیں کہ بیماری کی حالت میں جسم میں کئی قسم کے زہریلے مادے جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کو باہر نکالنے کے راستے پیشاب اور پسینہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکیم لوگ بخار اور بیماری کی حالت میں ایسی دوائی دیتے ہیں جس سے پیشاب اور پسینہ زیادہ آئے۔ سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ بخار میں پانی کافی پیا جائے جس سے پیشاب اور پسینہ کی مقدار کافی ہو جائے اور سب زہر باہر نکل جائے۔

امید ہے تم پر کافی واضح ہو چکا ہوگا کہ ہم کو پانی کی کتنی ضرورت ہے۔ اندرونی نہیں، بلکہ بیرونی صفائی کے لئے بھی پانی سے غسل کیا جاتا ہے۔ اب مجھے مطب جانا ہے لہذا بیٹا اب مجھے اجازت دو۔ پھر کبھی موقع ملا تو صحت کے دیگر مسئلوں پر بھی غور کیا جائے گا۔

عزمِ رخصت

جناب امین حزیں - بہاولپوری

آ! کہ پھر عشق میں ہم سوختہ ساماں نہ رہیں!
میں بھی حیراں نہ رہوں، آپ بھی حیراں نہ رہیں!

دیکھ دیتا ہے کوئی دور سے آواز مجھے
بخش دے پھر نہ کہیں "وہ پرِ پرواز" مجھے!

مہ و انجم کے اشاروں کو سمجھتا ہوں میں!

چھوٹنے والی ہے یہ نقش پرستی مجھ سے
وقت کے پیچ میں بے چین ہے ہستی مجھ سے

پھر مرے گیت نہ الہام بداماں ہوں گے!

آ! یہی وقت ہے دوری سے پریشاں رہیں!
میں بھی حیراں نہ رہوں، آپ بھی حیراں رہیں!

پیکرِ روح ہے خمیازہ کشِ رزمِ حیات!
ٹوٹ جائے نہ کہیں سلسلۂ ہوش و ثبات!

"گردشِ غم" ہوں، نہیں لذت کشِ آلام ہوں میں
بزم سرایہ سے ٹکرایا ہوا جام ہوں میں

کاش سمجھو! کہ یہ دنیا کی تگ و دو کیا ہے؟

خود [illegible] مری تدبیر کا جادو ناکام
وحشیو! [illegible] تسکین کی امید حرام

مری برباد تمناؤں کی دنیا مت پوچھ!

آ! کہ جاتا ہے سفینہ مری تدبیروں کا
ٹوٹنے والا ہے جادو مری تقدیروں کا

آ! یہی وقت ہے دوری سے پریشاں نہ رہیں! میں بھی حیراں نہ رہوں آپ بھی حیراں نہ رہیں!

ہندوستانی ناٹک

(حضرت مجنوں گورکھپوری کی وہ تقریر جو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۱۴؍ اگست ۱۹۳۸ء کو نشر کی گئی۔ تقریر نشر کرنے کے بعد اس پر نظر ثانی کی گئی ہے اور جا بجا کچھ الفاظ بدل دئے گئے ہیں اور چند جملوں اور چند ٹکڑوں کا اضافہ کیا گیا ہے)۔ مدیر

ڈرامہ یا ناٹک ہندوستان کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ ہندوستانی شاعری کی طرح اتنی ہی پرانی چیز ہے جتنی کہ خود ہندوستانی زندگی۔ ناٹک کا لفظ اتنا پرانا ہے کہ آج صحیح طور پر یہ بتانا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل یہ کب بنا اور اس کا رواج کیسے ہوا۔ اتنا معلوم ہے کہ ناٹک "ناٹ" سے نکلا ہے جس کے معنی ناچ کے ہیں۔ اسی طرح روپک کا لفظ بھی نہایت پرانے زمانے سے استعمال ہوتا چلا آیا ہے اور اس کی صحیح تاریخ بھی معلوم نہیں۔ روپک کے لفظی معنی بھیس بدلنے کے ہیں اور سنسکرت زبان میں یہ ناٹک کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ جہاں تک ہم سے جہاں تک پتہ لگایا جا سکا ہے سنسکرت ناٹک کی بنیاد مذہب کے ساتھ ساتھ پڑی۔ مشہور روایت ہے کہ ایک مرتبہ بہت سے دیوتا ایک رائے ہو کر برہما کے پاس گئے اور اس سے درخواست کی کہ ہمارے جی بہلانے کے لئے کچھ سامان مہیا کیا جائے۔ برہما نے ان کی درخواست منظور کی اور ان کے لئے ناٹ وید ایجاد کیا جس میں مکالمہ یا بات چیت رگ وید سے لیا، ایکٹنگ یا نقالی یجر وید سے، گانا سام وید سے اور ناچنا اتھر وید سے۔ وشوا کرم کو حکم دیا گیا کہ ایک رنگ شالہ یا اسٹیج بنایا جائے۔ یہ رنگ شالہ اندر بھون میں تعمیر کیا گیا اور اندر دھوج کے تیوہار کے موقع پر اس رنگ شالہ میں پہلا ناٹک امرت منتھن کھیلا گیا جس میں سمندر متھے جانے کا مشہور قصہ پیش کیا گیا تھا۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ سب سے پہلے اس دنیا میں جن نے سب سے پہلے رنگ شالہ یا اسٹیج بنوایا وہ راجہ نہوش ہے اس نے گندھرب اور اپسراؤں کو بلایا اور ادا کاری یعنی ایکٹنگ کی خدمت انکے سپرد کی۔

اس قسم کی روایتوں کو کوئی مانے یا نہ مانے لیکن اس سے کم سے کم اتنا تو ثابت ہی ہوتا ہے کہ ڈرامہ کا وجود ہندوستان میں بہت پرانے زمانے سے ہے۔ اور ملکوں کی طرح یہاں بھی ناٹک کی ابتداء مذہبی ضرورت سے ہوئی جو شروع شروع پوجا پاٹ کے قسم کی چیز رہا۔ جو قصے ناٹک کی صورت میں پیش کئے جاتے تھے وہ عام طور سے دیویوں، دیوتاؤں یا رشیوں منیوں کی زندگی سے متعلق ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد راجہ مہاراجہ بھی ناٹک کے ہیرو ہونے لگے۔

ناٹک کے فن پر ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب ناٹ شاستر ہے۔ جس کو بھرت نامی ایک رشی کی تصنیف بتلاتے ہیں جب اندراسن میں اسٹیج تیار ہو چکا تو اس کی نگرانی اسی بھرت کے سپرد ہوئی اور اس کو حکم ملا کہ وہ ناٹک کے فن پر ایک کتاب لکھے۔

ان تمام روایتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کم سے کم دو ہزار برس پہلے ہندوستان میں ناٹک کی بنیاد

پڑھ چکی تھی اور حضرت عیسیٰ کے کوئی چار سو برس بعد یہ فن اپنے کمال کو پہنچ چکا تھا۔ سنسکرت کا مشہور ناٹک کار کالیداس جو ہندوستان کا شیکسپیئر مانا جاتا ہے اور جس کی شکنتلا ساری دنیا میں شہرت حاصل کر چکی ہے اسی زمانہ میں گزرا ہے مگر وہ خود کئی ایسے ناٹک کاروں کا ذکر کرتا ہے جو اس سے پہلے ہو چکے تھے اور جن کا وہ خود قائل تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کالیداس سے پہلے بھی ہندوستان میں ناٹک کا فن کافی ترقی کر چکا تھا۔ بہرحال جس ملک میں اشوگھوش، بھاس، کالیداس، بھوبھوتی، ہرش اور راج شیکھر جیسے ڈرامہ لکھنے والے پیدا ہو چکے ہوں وہ دوسرے مہذب ملکوں سے فخر اور اعتماد کے ساتھ آنکھیں ملا سکتا ہے۔

برہمنوں کے زوال کے ساتھ سنسکرت زبان کا بھی زوال شروع ہوا اور اس کی جگہ مختلف پراکرتوں نے لے لی۔ اس کا اثر ناٹک پر بھی پڑا۔ جو اب بڑے بڑے برہمنوں اور پنڈتوں کے ہاتھ سے نکل کر عوام کی چیز ہو گیا۔ اور بجائے سنسکرت کے پراکرت میں لکھا اور دکھایا جانے لگا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ پلاٹ میں بے اعتدالیاں پیدا ہو گئیں، زبان کا معیار گر گیا۔ بات چیت فحش اور غیر مہذب ہونے لگی۔ اور ناٹک۔۔ بازار کی چیز ہو کر رہ گیا۔ اسی زمانہ میں رہس اور سوانگ۔ اور بہروپ نے رواج پایا جو در حقیقت ناٹک کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں اور جن میں سوائے نقلیں بنانے کے کچھ نہیں ہوتا چند گانے اور چند تقریریں جاہل طبقہ پر اثر ڈالنے کے لئے یاد کر لئے اور دو چار اوباش مل کر ان کو گلی گلی دہراتے پھرے۔ یہ وہی گروہ تھا جس کو کچھ عرصہ بعد ملا غنیمت نے اپنی مثنوی نیرنگ عشق میں بھگت بازوں یا مقلد پیشوں کے نام سے یاد کیا ہے۔

جب مسلمان اس ملک میں آئے تو ہندوستانی ناٹک کی حالت ابتر ہو چکی تھی اور اس کی جگہ یہی بھگت بازی یا نقالی رہ گئی تھی۔ مسلمان اصل فن سے ناواقف تھے انہوں نے سوانگ اور رہس کو نہ صرف اپنی تفریح کا سامان پایا بلکہ اس کو ہندوستانی زندگی کا ایک لازمی جز سمجھا اور اپنی تفریح اور عوام کو خوش رکھنے کے لئے ان چیزوں کو فروغ دیا۔ مسلمان بادشاہوں اور نوابوں کی سرپرستی میں بھانڈوں اور نقالوں کی ایک مستقل نسل پیدا ہو گئی جو آج تک باقی ہے۔ موجودہ ہندوستانی تھیٹر کے اصل بیج یہی سوانگ اور رہس تھے۔

موجودہ ہندوستانی ڈرامہ ایک بالکل نئی چیز ہے جس کی بنیاد انیسویں صدی کے بیچ میں پڑی اگرچہ براہ راست پرانے سنسکرت ناٹک کا اثر اس پر بہت کم پڑا تاہم یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ موجودہ ہندوستانی ڈرامہ ایک ایسی نئی چیز ہے۔ جس میں پرانے ہندوستانی ناٹک اور انگریزی ڈرامہ کے اثرات برابر ملے جلے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے اور موجودہ ہندوستانی تماشوں کو قاعدہ سے ترتیب دی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جن کو طبعزاد کہا جائے۔ زیادہ تر یا تو سنسکرت ناٹکوں اور ہندو روایتوں سے لئے گئے ہیں یا عربی اور فارسی قصوں کی نقلیں ہیں یا انگریزی ڈراموں کے چربے ہیں جو تماشے عربی اور فارسی سے لئے گئے ہیں وہ اکثر عشق کی داستانیں ہیں۔

موجودہ جدید ہندوستانی ناٹکوں میں سب سے پہلا ناٹک شاہی دربار کا تربیت یافتہ ہے۔ میری مراد سید آغا حسن امانت کی اندر سبھا سے ہے جو واجد علی شاہ کی فرمائش سے لکھی گئی۔ امانت نے ہندوستانی ناٹک کے لئے ایک نیا راستہ نکالا۔ واجد علی شاہ ناچ رنگ کے جیسے دلدادہ تھے سب کو معلوم ہے ان کے مصاحبوں میں ایک فرانسیسی تھا اس نے بادشاہ سلامت کو "آپیرا" کی لذت سے واقف کیا۔ آپیرا فرانسیسی ناٹک کی ایک قسم ہے جس میں ناچ گانے کو خاص دخل ہوتا ہے۔ واجد علی شاہ کو

یہ چیز بھا گئی اور انھوں نے اسی نمونہ پر امانت سے اندر سبھا تیار
کرائی جس کی خلائق میں دھوم ہوگئی اس بناء پر کہا جاسکتا ہے
کہ ہندوستانی تھیٹر میں جو ناچ گانے کا عنصر اس قدر غالب ہے
اس کا سبب یہی ہے کہ ناچ گانا اس کے خمیر میں ہے۔

واجد علی شاہ کے لکھنؤ سے جانے پر اندر سبھا کو بھی
اپنا ڈیرہ خیمہ اٹھانا پڑا قیصر باغ میں بسنے والی بمبئی پہنچی اور وہاں
اپنا بازار اور گاہک پیدا کئے۔ پارسیوں کو تجارت کے لئے نیا
سامان ہاتھ آیا۔ انگریزی تھیٹر کا ان پر پہلے سے اثر تھا انھوں نے
بڑے بڑے شہروں میں تھیٹر کی کمپنیاں کھولیں اور نہ صرف پرانے
سنسکرت ناٹکوں اور ہندو دیو مالا سے تماشے تیار کئے بلکہ
عرب اور ایران کی پرانی داستانوں اور حکایتوں کو کام میں لائے۔

موجودہ ہندوستانی تھیٹر کے باوا آدم سیٹھ پسٹن جی فرامجی
ہیں جن کو اردو شاعری سے شوق تھا۔ اور جو رنگ اور پرتو
کے نام سے شعر کہا کرتے تھے انھوں نے سب سے پہلی کمپنی قائم کی
جس کے مشہور ناٹک کار رونق بنارسی اور حسینی میاں ظریف تھے
رونق عموماً انگریزی ڈراموں سے ترجمہ کرتے تھے اور خود
اپنی طبیعت کا جوہر بہت کم دکھایا کرتے تھے لیکن ظریف اپنی خداداد
اپج سے زیادہ کام لیتے تھے اور نئی نئی باتیں پیدا کرتے تھے
اگرچہ ان کی زبان میں جابجا خامیاں ہیں اور ان کی نظم میں فنی
خرابیاں پائی جاتی ہیں تاہم ان کے تماشوں میں ایک تازگی
اور دلکشی ہوتی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی قصوں سے
بھی اتنا ہی کام لیا ہے جتنا کہ عرب اور ایران کی داستانوں سے۔

"چاند بی بی" "گل بکاؤلی" "بدر منیر" "شیریں فرہاد"
"لیلیٰ مجنوں" "علی بابا" "حاتم طائی" "گل با صنوبر" ظریف
کے مشہور تماشوں میں سے ہیں۔

پسٹن جی کی وفات پر ان کی کمپنی ٹوٹ گئی اور اس کی
جگہ وکٹوریہ ناٹک کمپنی نے لی جو خورشید جی بالی والا کی قائم
کی ہوئی تھی اس کمپنی نے منشی ناٹک پرشاد طالب بنارسی کو
اپنا خاص ناٹک کار مقرر کیا۔ طالب نہ صرف ناٹک کے
فن کے ماہر تھے بلکہ شاعری کے اصول سے بھی واقف تھے انکی
زبان بہت صاف اور ستھری ہوتی ہے اور ان کے تماشوں
میں جتنے اردو گانے ہیں۔ وہ بازاری انداز سے ہٹے ہوئے
ہیں۔ طالب پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستانی ڈرامہ میں
نثر کو بھی داخل کیا۔ ورنہ 'اپیرا' اور 'اندر سبھا' کی تقلید میں
اب تک اور اکثر اس کے بعد بھی ناٹک صرف منظوم ہوتے
تھے اور اسٹیج پر جو گفتگو ہوتی تھی وہ شعر میں ہوتی تھی۔ طالب
نے ایک ڈرامہ یعنی "لیل و نہار" انگریزی سے ترجمہ کیا
ہے باقی جتنے ڈرامے لکھے وہ زیادہ تر ہندوستان کی
روایتوں اور ہندوستان کی زندگی سے متعلق ہیں "وکرم ولاس"
"ہریشچندر" اور "نگاہ غفلت" ان کے سب سے زیادہ مقبول
تماشے ہیں۔

اسی زمانہ میں کاؤس جی کھٹاؤ نے الفریڈ تھیٹریکل کمپنی
قائم کی اس کمپنی کے پہلے ناٹک کار احسن لکھنوی تھے جو مرزا
شوق مصنف زہر عشق کے نواسے ہیں اور زباں داں کہے جانے
کے مستحق ہیں۔ ان کے ناٹکوں کی زبان بڑی شستہ اور بامحاورہ
ہوتی ہے۔ ان کے اکثر تماشے جو عوام میں مشہور ہوئے شیکسپیر
کے ڈراموں کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں مثلاً 'خون ناحق'
ہیملٹ سے لیا گیا ہے۔ اور "گلنار فیروز" رومیو اور جولیٹ
سے۔ ان کے علاوہ "دلفروش" "چلتا پرزہ" اور "بکاؤلی"
بھی احسن کے مشہور تماشوں میں گنے جاتے ہیں۔

احسن کے بعد ان کی کمپنی نے پنڈت نرائن پرشاد بیتاب سے تماشے لکھوائے۔ بیتاب کے وہ تماشے زیادہ مشہور ہوئے جن کی بنیاد ہندوستان کے پرانے قصوں پر تھی مثلاً "مہابھارت" "رامائن" "کرشن سداما" وغیرہ۔ "قتل نظیر" بھی ان کا مشہور تماشہ ہے۔ باوجود تکلف اور تصنع کے بیتاب زبان میں کچے نظر آتے ہیں اور جو منظر یا حالت بیان کرتے ہیں اس میں واقعہ کی شان نہیں پیدا کرسکتے۔

کچھ ہی دنوں بعد نیو الفرڈ کمپنی قائم ہوئی اور اس کے لئے ایک ایسے شخص نے تماشے لکھنا شروع کئے۔ جس کو ہندوستانی تھیٹر نے استاد مان لیا ہے۔ اور جس کو مغربی مصنفوں کے مقابلہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ آغا حشر کے ناٹکوں کا اسٹیج پر آنا تھا کہ ان کا ڈنکا بج گیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ آغا حشر ہندوستانی ناٹک کی فضا میں سب سے زیادہ روشن ستارہ ہیں۔ نظم اور نثر دونوں میں ان کو برابر مہارت حاصل ہے وہ انسان کی جذبات کی گہرائیوں کا ہم کو بہت صحیح پتہ دیتے ہیں۔ خاص کر عشق کی شدید حالتوں کو وہ بڑی خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، قتل، غارت یا جوش و خروش کے نقشے کھینچنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور ان میں اکثر تیز رنگ بھر دیتے ہیں۔ ان کے اکثر پلاٹ دوہرے ہوتے ہیں جن کو وہ بڑے سلیقہ کے ساتھ نباہے جاتے ہیں لیکن خاتمہ پر ان کے تماشے پھیکے اور کمزور پڑ جاتے ہیں۔ ان پر یہ بھی اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ وہ نقل و حرکت سے کہیں زیادہ زبانی باتوں سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے تماشے بے جان ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانی ناٹک کی جو خدمت آغا حشر نے کی اس سے پہلے کسی نے نہیں کی تھی۔ عموماً وہ انگریزی ڈراموں سے پلاٹ لیا کرتے تھے مگر بعض تماشے ان کی اپنی تصنیف بھی ہیں۔ جن تماشوں کی سب سے زیادہ دھوم ہوئی وہ "شہید ناز" "اسیر حرص" "خوبصورت بلا" "سور داس" اور "سیتا بن باس" ہیں۔

آغا حشر کے پیچھے ناٹک کاروں کا ایک ٹڈی دل نظر آتا ہے۔ ان میں سے بعض کے تماشے مشہور بھی ہو چکے ہیں مثلاً فیروز شاہ کا "بھول بھلیاں" جو شیکسپیر کے کامیڈی آف ایررس" کا ترجمہ ہے۔ امراؤ علی کا "جہانگیر" جو ہیملٹ کا ترجمہ ہے۔ منشی غلام علی کا "مہر جبیا" محشر انبالوی کے "آتشیں ناگ" "خورپرست" اور "شکنتلا"۔ دوارکا پرشاد افق کا "رام ناٹک"۔ آغا شاعر کا "حور جنت"

اتنے ناٹک کاروں کے نام گنائے جاچکے اور ابھی نہ معلوم کتنے باقی ہیں۔ سننے والا سمجھے گا کہ ہندوستانی ناٹک ترقی کی تمام منزلیں طے کرکے تکمیل کے درجے کو پہنچ چکا ہوگا لیکن ہم کو افسوس کے ساتھ ماننا پڑتا ہے کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ امانت سے لے کر آغا حشر تک جتنے ناموں کی فہرست آپکے سامنے ہے ان میں کوئی ایسا نہیں جو اسٹیج سے باہر شاعری یا ادب کی دنیا میں کوئی حیثیت رکھتا ہو۔ "اندر سبھا" سے لے کر "شکنتلا" اور "حور جنت" تک کوئی ناٹک ایسا نہیں جس کو لٹریچر میں گنا جائے جو لوگ واقعی رچا ہوا مذاق رکھتے ہیں اور ادیب یا شاعر کہے جانے کے مستحق ہیں وہ اس میدان میں نہیں آتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی ناٹک صرف تفریح اور وہ بھی جاہل طبقہ کی تفریح کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے اور کیا ادبی نقطۂ نظر سے اور کیا اخلاقی یا سماجی معیار سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی۔ اس پر ہم کو زیادہ افسوس اس لئے ہوتا ہے کہ یہی ہندوستان کبھی کالیداس

اور سو بھوتی پیدا کر چکا ہے جس ملک میں "شکنتلا" "مالتی مادھو" "اوکرویشی" جیسے ناٹک لکھے جا چکے ہوں اس کا معیار اب "خوبصورت بلا" یا "شیریں فرہاد" ہو! یقیناً عبرت کی بات ہے۔

جو دو چار ڈرامے ایسے لکھے بھی گئے ہیں جنکو ادب میں جگہ دی جائے ۔ وہ اسٹیج پر نہیں آتے ۔ شوق قدوائی کے "میکفرسن" اور "لوسی" اور "قاسم و زہرہ" کو یا عزیز مرزا کے "وکرم روسی" کو یا منشی جوالا پرشاد برق کے "معشوقۂ فرنگ" کو شاید ہی کسی نے کبھی اسٹیج پر دیکھا ہو

لیکن ہم کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے ۔ پچھلے پچیس تیس برس سے کچھ پڑھے لکھے اور اچھا مذاق رکھنے والے لوگ بھی اس طرف متوجہ ہیں اور جہاں شاعری اور افسانہ نگاری میں نئی راہیں نکالی جا رہی ہیں وہاں ناٹک کو بھی نئے راستہ پر لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے اس درمیان میں کئی انشا پردازوں نے ایسے ڈرامے لکھے ہیں جن کو اخلاقی، سیاسی، سماجی اور ادبی ناٹک کا نام دیا جائے گا اور جن کو ہندوستانی ادب کی تاریخ میں جگہ ملے گی ۔ ان میں سے زیادہ تر مغربی ڈراموں کے ترجمے یا چربے ہیں ۔ جن لوگوں نے پہلے پہل اس ادبی خدمت کو انجام دیا ان میں مولانا ظفر علی خاں، حکیم احمد شجاع اور سید امتیاز علی تاج کے نام سب سے آگے رہیں گے ۔ مغربی ڈراموں کے جو ترجمے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ۔ ان میں سے بعض یہ ہیں ۔

"جان ظرافت" اور "ٹیبگرڈ سے وال" فرانس کے مشہور ناٹک کار مولیر کے ناٹکوں کے ترجمے ہیں جنکو نور الٰہی اور محمد عمر نے ترجمہ کیا ہے ۲۔ "قزاق" مشہور جرمن ادیب شلر سے ترجمہ کیا گیا ہے اور انہیں دو صاحبوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے ۳۔ "ظفر کی موت" اسکو بھی نور الٰہی اور محمد عمر نے بلجیم کے مشہور ڈرامہ نگار میٹر لنک سے ترجمہ کیا ہے ۴۔ جرمنی کے مشہور ادیب گوئٹے کے "فاؤسٹ" کا بھی ترجمہ ہو چکا ہے ۵۔ خود میں نے مغربی مصنفوں سے پانچ ڈرامے ترجمے کئے ہیں "ریا کار" مالیئر "برنارڈ شا" سے "آغاز ہستی" ٹولسٹائی سے "ابوالہول" میٹرلنک سے "مریم مجدلانی" اور بائرن سے "قابیل"

ان ڈراموں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو کبھی کھیلا گیا ہو یہاں ایسے ڈراموں کو خالص ادب میں شمار کیا جاتا ہے اور ان کو صرف پڑھنے کی چیز سمجھا جاتا ہے ۔ جن ملکوں سے یہ ڈرامے لئے گئے ہیں وہاں ان کو کتب خانے اور اسٹیج دونوں جگہوں کی رونق سمجھا جاتا ہے ۔ ان میں سے کوئی ڈرامہ ایسا نہیں جس کا یورپ کی ہر زبان میں ترجمہ نہ ہو چکا ہو اور جو وہاں کے ہر ملک میں سیکڑوں مرتبہ کھیلے نہ جا چکے ہوں ۔ لیکن یہ تو ان ملکوں کا ذکر ہے جہاں ہر شخص پڑھنے اور لکھنے کے قابل ہے جس ملک میں بچانوے فیصدی نہ اپنا نام پڑھ سکتے ہوں ۔ اور نہ اپنے دستخط کر سکتے ہوں ان سے یہ امید کرنا یقیناً ہٹ دھرمی ہے کہ وہ گوئٹے کے "فاؤسٹ" یا میٹر لنگ کے "مریم مجدلانی" کو اسٹیج پر دیکھ کر لطف اٹھا سکیں گے پھر بھی پچھلے دس بارہ برس کے اندر عوام کا مذاق اور رجحان کافی بدل گیا ہے اور اب وہ محض تفریحی تماشوں سے اتنا خوش نہیں ہوتے اب وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو تماشے ان کو دکھائے جائیں وہ اونچے درجے کے ہوں اور ان میں کوئی اخلاقی یا سماجی پہلو بھی ہو ۔ اس کا اصل سبب تو وہ سیاسی بیداری ہے جس نے بیس برس کے اندر سارے ملک کو جگا دیا ہے لیکن بظاہر اس کا ذمہ دار سینما ہے جس نے تھیٹر کی کمپنیوں کو معطل کر کے رکھ دیا ہے شروع شروع سینما میں جو تماشے دکھائے جاتے تھے وہ دوسرے ملکوں کے تیار کئے ہوئے ہوتے تھے ۔ اور اصل زندگی کی ہو بہو نقل ہوتے تھے اس نے آہستہ آہستہ ہمارے اندر ناٹک کا صحیح مفہوم پیدا کیا اور ہم کو معلوم ہوا کہ ناٹک کے معنی صرف ناچ رنگ یا گانے بجانے کے نہیں ہیں بلکہ اس کا کام ہماری اصلی زندگی کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر پیش کرنا ہے بعد کو جب ہندوستانی کمپنیوں نے فلم تیار کرنا شروع کیا تو انھوں نے

اس کا خیال رکھا کہ تماشے سبق آموز ہوں اور عوام کے مذاق اور معیار کو بلند کرنے میں مدد دیں۔ سینما کے تماشوں میں بھی اگرچہ ابھی تک محض ناچ گانے کا عنصر ضرورت سے زیادہ شامل ہوتا ہے۔ تاہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تماشے عام طور سے اخلاقی یا سیاسی یا سماجی مقصد سے لکھے جاتے ہیں اور ہماری سوئی ہوئی قوتوں کو جگاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ کامیاب کوششیں کلکتہ کی ایک فلمساز کمپنی ... بڑے اہتمام کے ساتھ اونچے درجہ کی چیز پیدا کرتی ہے اور اس کا خاص لحاظ رکھتی ہے کہ عوام کے مذاق کو بغیر کسی قسم کا صدمہ پہنچائے ہوئے اور ان کو بغیر چونکائے ہوئے ان کے معیار اور ان کی نظر کو بلند کرتی رہے۔

بہر حال ہم کو ہندوستانی ناٹک کا مستقبل اب پہلے سے بہت زیادہ شاندار نظر آ رہا ہے اور ہم بجا طور پر یہ امید کر سکتے ہیں کہ اگر ہماری یہ بیداریاں قائم رہیں اور ترقی کے راستہ میں خلاف امید رکاوٹیں نہ پیدا ہوئیں تو وہ زمانہ دور نہیں کہ ہندوستانی اسٹیج پر فاوسٹ "قزاقی" اور "مریم مجدلانی" کے قسم کے تماشوں کا ناٹک ہونے لگے۔ اور ہندوستان گوئٹے۔ مولیر اور شیکسپیئر جیسے ناٹک کار پیدا کرنے لگے۔

دنیائے دل

ازجناب قیصر امراوتی

بختِ ناسازگار کی دنیا
ہائے بے اختیار کی دنیا

کیا خدائی میں یہ نہ تھی شامل
مجھ غریب الدیار کی دنیا

مل گئی خاک میں شب فرقت
دیدۂ اشکبار کی دنیا

کیوں بسا کر اجاڑ دی تم نے
دلِ امیدوار کی دنیا

کیا قیامت نہ تھی شب وعدہ
فتنۂ انتظار کی دنیا

تیرے وحشی سنبھالے بیٹھے ہیں
دامنِ تار تار کی دنیا

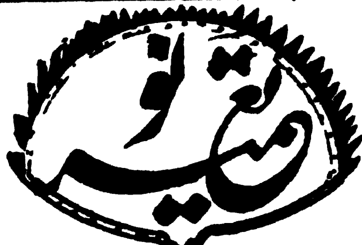
اب کہاں کیف عشق کا عالم
رہ گئی ہے خمار کی دنیا

آپ اپنی بہار کی مالک
یہ دلِ داغدار کی دنیا

یاد ایام عشق کی سوگند
ہم بسائیں گے پیار کی دنیا

چند شیشوں میں چند قطرہ میں
قیصر بادہ خوار کی دنیا

(خاص تنویر کیلئے)



جناب امام الدین صاحب رام نگری

۱

یکایک ماتمی ڈنکا بجا، لوگوں میں ہلچل مچ گئی، گوالوں نے دودھ دوہنا چھوڑ دیا۔ کسانوں نے ہل بیل، عورتوں نے چولھا چکی چھوڑ دی، اور سب کے سب راج محل کی طرف دوڑ پڑے،

" ہر شخص یہی کہہ رہا تھا۔

" یہ آخر کیسا ماتمی ڈنکا ہے؟"

" راج گھرانے میں کس کی موت ہوئی؟"

" بڑی رانی تو نہیں مر گئی؟"

" راجکمار تو نہیں مرا؟"

" راجہ کیلاش کانت تو انتقال نہیں کر گئے؟"

راج محل کے باہر لوگوں کی بھیڑ لگ گئی، جو خبر رعایا کے لئے سب سے زیادہ افسوسناک تھی وہی سننے میں آئی، راجہ کیلاش کانت ہی نے انتقال کیا تھا۔ اس خبر کے سننے سے لوگوں کو کتنا صدمہ ہوا، کتنے تو چیخ مار کر رو پڑے۔ اور آنسو تو سبھی کی آنکھوں سے جاری تھے۔

یہ غمناک خبر سنکر لوگ اپنے گھروں کو واپس ہوئے، راستے میں پھر اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔

"آج ہم بے باپ کے ہو گئے۔"

" ساتھ ہی ہمارا امن و اطمینان بھی رخصت ہو گیا"

" ہمیں ایسا راجہ پھر نصیب نہ ہو گا"

" ہم ان کی نیکیوں کو کبھی بھول نہیں سکتے"

" انھوں نے بیماروں کے لئے مفت دوائیں تقسیم کرائیں"

" یتیموں کے لئے یتیم خانے قائم کرائے"

" بیواؤں کے گزارے کا سامان کیا"

" مسافروں کے لئے مسافر خانے اور راہگیروں کے لئے کنوئیں بنوائے"

" خود بھوکے رہے اور ہمیں کھلانے کو دیا"

" ہماری مصیبت اپنی مصیبت سمجھی اور ہمارا دکھ اپنا دکھ"

" ان کو غریب سب سے زیادہ عزیز تھے"

" آہ! ہم ایسے اچھے راجہ سے محروم ہو گئے"

" ہم ایسے نیک راجہ کے لئے جتنا غم کریں کم ہے"

۲

راجکمار چندر کانت راجہ چندر کانت بن گیا۔ اسے رعایا دل سے عزیز تھی، وہ رعایا کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار رہتا، وہ نہایت شجاع اور بہادر تھا۔ وہ خوبصورتی میں بھی اپنی نظیر آپ تھا۔ پھر کون ایسی دوشیزہ تھی جو اسے دل و جان سے نہ چاہتی ہو گی۔ لیکن اسے تو عورتوں سے دلی نفرت تھی، عورتوں کے بارے میں اس کے عجیب خیالات تھے۔ اس کو خیال تھا کہ سارے فتنہ و فساد اور نزاع و عناد کی بنا عورتیں ہیں۔

راجہ چندر کانت کے اس خیال ہی سے لوگوں کو کچھ کم فکر و تشویش نہیں تھی، لیکن ایک روز جب لوگوں نے سنا کہ راجہ نے تین روز کے عرصہ میں عورتوں کو راجدھانی سے باہر نکل جانے کا

حکم صادر کر دیا ہے تو ان کے اضطراب پریشانی کی انتہا نہ رہی!

لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور ایک دوسرے سے کہنے لگا۔

"عورتوں کی ایسی ہتک و توہین!"

"بے چاریوں پر ایسا ظلم و تشدد!"

"آخر وہ جائینگی کہاں؟"

"یہ بھی کوئی بات ہے!"

"وہ ہماری مائیں ہیں، بہنیں ہیں، ہماری بیٹیاں ہیں۔ آخر ان کا کیا حال ہوگا؟"

غم و غصّے سے لوگ بیتاب ہو گئے، لوگوں کی آنکھوں سے غیظ و غضب کی آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ سب میں بغاوت کی لہر پیدا ہو گئی، گھر کی عورتیں خاموش تھیں، لیکن مرد لاٹھی ڈنڈے سنبھال کر باہر نکل پڑے۔

لوگ ستر سنگ کو اپنا سردار اور قائد مانتے تھے۔ اس کی فہم و فراست اور عقل و دیانت پر سب کو بھروسہ تھا، ہر شخص اس کی اصابت رائے کا قائل تھا، اور اس کے مشورے پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس نازک موقع پر بھی لوگ اسی کے پاس گئے اس کی ملک میں ہمیشہ امن و امان قائم رکھنے کی کوشش تھی اس پُر خطر مرحلے پر بھی اس نے اپنی دانشمندی اور معاملہ فہمی کو برقرار رکھا۔ لوگوں کو مخاطب کر کے اس نے کہا۔

"میرے بہادر عزیزو! تمھیں بھی مرحبا ہے اور تمھارے عزم و حوصلے کو بھی، رعایا راعی ہے اور پرجا ہی راجہ۔ رعایا کو حق ہے کہ وہ نا اہل کے سر سے حکومت کا تاج اُتار کر اہل کے سر پر رکھ دے۔ راجہ کا حکم سراسر ظلم و استبداد پر مبنی ہے ایسے حکم کے خلاف تمھارا اضطراب و اضطرار حق بجانب ہے۔ میرا دل بھی غم و غصّے سے لبریز ہو رہا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم جنگ و جدل شروع کر دیں اور ملک میں کشت و خون کا بازار گرم ہو جائے ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کر لینا چاہئے کہ راجہ نے جو فرمان جاری کیا ہے اس سے اس کی اصل غرض کیا ہے؟ کیا وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے۔ اپنی ذات کے لئے کرنا چاہتا ہے؟ کیا اس سے راجہ کا اپنا کوئی فائدہ مقصود ہے؟ میں نے جہاں تک غور کیا ہے معاملے کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور بات کی تہ تک پہنچا ہوں۔ اس میں راجہ کے پیش نظر اپنا کوئی مفاد نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے بخیال خود ہماری فلاح و بہبود کے لئے کر رہا ہے اگرچہ وہ سراسر غلط فہمی اور گمراہی میں مبتلا ہے جس سے وہ ایک روز متنبہ ہو کر رہے گا۔

در اصل راجہ کو تم سے زبردست محبت ہے جو عشق کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ وہ عورتوں سے نفرت کرتا ہے اور وہ ان کو اپنے ملک سے نکال دینا چاہتا ہے۔ تمھارے لئے یہ باتیں بیشک تکلیف دہ ہیں۔ نہ صرف تکلیف دہ بلکہ اشتعال انگیز بھی ہیں لیکن یہ مجنونانہ حرکتیں راجہ صرف تمھاری محبت میں کر رہا ہے۔ راجہ کو تم سے خلوص ہے، محبت ہے۔ وہ تمھارا خیر خواہ ہے وہ خود غرض اور نفس پرست نہیں ہے۔

اس لئے اگر تم مجھ پر اعتبار کرتے ہو تو میری بات مانو، صبر و سکون سے کام لو، امن و امان میں خلل نہ ڈالو، راجہ کے حکم کو قبول کر لو اور اس پر عمل کرو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ نوجوان راجہ خود اپنی غلطی پر نادم و پشیماں ہوگا اور وہ خود اپنی اصلاح کرے گا۔

مجھے امید ہے کہ تم نے جس طرح ہمیشہ میرا احترام کیا ہے، آج بھی میرا خیال کر کے میرے مشورے پر عمل کرو گے اور میرے

احترام کو قائم و برقرار رکھو گے؟"

مجمع نے جواب دیا۔ "ہم اپنے محترم قائد اور بزرگ سردار کی باتیں ہمیشہ مانتے آرہے ہیں اور آج بھی ماننے کے لئے تیار ہیں لیکن آپ وہی بتائے کہ ہم اپنی بے دست و پا ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو کہاں نکال دیں؟"

بوڑھے قائد نے کہا۔ "راج کی سرحد کے باہر جنگل کو صاف کرکے ایک نئی آبادی تمھاری شفقت کوششوں کے مقابلے میں یہ کام کچھ دشوار نہیں ہے۔"

مجمع نے یک زبان ہوکر کہا۔ "بہتر ہے۔ اگر ہمارے سردار کی یہی رائے ہے تو ہم راجہ کے حکم کی تعمیل کریں گے۔" ہجوم منتشر ہوگیا۔ لوگوں کا جوش کھاتا ہوا خون اس طرح پرسکون ہوگیا جیسے کھولتے ہوئے دودھ پر پانی پڑ جائے۔ جن آنکھوں میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی ان میں آنسو چھلکنے لگے۔ راجہ چندر کانت کی راج دھانی کے باہر عورتوں کی نوآبادی قائم ہوگئی۔ راجہ کے سینے میں حوصلہ مند دل تھا۔ وہ ایک اولوالعزم فرمانروا تھا۔ اس کے دل میں تمام ممالک پر قبضہ و تصرف حاصل کرلینے کا جذبہ کارفرما تھا۔ آخر وہ ایک روز ملکوں کے حالات و کوائف کے مطالعہ کی غرض سے ایک معمولی آدمی کی وضع میں تنہا ملک سے نکل کھڑا ہوا۔

۳

راجہ چندر کانت ایک سرا میں ٹھہرا ہوا تھا جس میں ملک [illegible] کی راجکماری آشالتا مردانہ وضع میں روزانہ سرا میں آتی اور مسافروں سے مل کر ان کے ملکوں کے حالات و واقعات دریافت کرتی تھی۔ وہ معمول کے مطابق سرا میں آئی۔ وہاں اس سے راجہ چندر کانت [illegible] سے ملاقات ہوئی۔ تھوڑے ہی دیر میں دونوں ایک دوسرے کے دوست ہوگئے۔ لیکن دونوں نے ایک دوسرے کو فرضی نام بتائے۔ چندر کانت [illegible] نے اپنا نام دجیت [illegible] بتایا اور راجکماری نے اپنا نام [illegible] دونوں میں [illegible] محبت ہوگئی۔

ایک روز دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔

راجکماری: تمھارے ملک کا راجہ کون ہے؟

[illegible] راجہ چندر کانت۔

راجکماری: چندر کانت! اچھا تم چندر کانت کے ملک کے رہنے والے ہو جس نے بے دست و پا عورتوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔ دجیت تم [illegible] نہ ہوتا۔ اگر زندگی میں ایک بار [illegible] چندر کانت [illegible] سے عورتوں کی اس [illegible] کا بدلہ نہ لیا ہو تو میرا نام [illegible] نہیں؟"

"تمہیں کیسے معلوم کہ وہ نامرد ہیں؟"

"اس کی حرکتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ میں [illegible] جاؤں گا اور اس کو خاک میں ملادوں گا"

راجکماری نے پیرایۂ گفتگو بدلتے ہوئے کہا۔ "اچھا ان باتوں کو چھوڑو، ابھی تم یہاں کب تک رہوگے؟"

"کل جانے کا ارادہ ہے۔"

"اتنی جلدی! اچھا اس بات کو سن لو کہ میں نے زندگی میں صرف تم کو دوست بنایا ہے۔ مجھے بھول نہ جانا میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ نہ میرے باپ ماں ہیں نہ بھائی بہن۔ تمھارے راجہ چندر کانت ہی طرح میں بھی اکیلا ہوں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ وہ راجہ ہے اور میں ایک غریب آدمی ہوں۔"

[illegible] کا دل بھر آیا آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اس نے راجکماری کا ہاتھ چوم کر کہا ـــ دوست! [illegible] زندگی بھر یاد رکھوں گا۔

راجہ چندرکانت [illegible] ملنے کے

[illegible] چندرکانت [illegible]

خود شائستہ فوج لے کر آئی۔ [illegible] کے سامنے

وجیت کھڑا ہے۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہوا۔ اس نے

پکار کر پوچھا — تم کون ہو؟

راجہ نے گرج کر جواب دیا۔ تمہارے خون کا پیاسا چندرکانت‘

راجکماری آشالتا سمجھ گئی کہ چندرکانت ہی وجیت کی صورت

میں اس سے ملا تھا۔ اس کے دل سے مقابلہ و معرکہ کا سارا جذبہ فرو

ہوگیا۔ وہ چندرکانت کو دل سے چاہتی تھی۔ اس نے ہاتھ سے

تلوار پھینک دی اور کہا۔ چندرکانت! میں تم سے لڑ نہیں سکتی‘ تم

مجھ کو گرفتار کرلو!

راجکماری گرفتار کرلی گئی‘ چندرکانت نے اس کو پھانسی

کا حکم دیا۔ راجکماری پر اس حکم سے کسی طرح کا خوف و ہراس طاری

نہیں ہوا‘ وہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔

پھانسی کا وقت آگیا وہ راجکماری تھی اس لئے اس کی

گردن میں ریشمی پھندا ڈالا گیا۔ چندرکانت سامنے کھڑا تھا؛

چندرکانت نے کہا۔ تمہاری کوئی خواہش ہو تو اسے

پیش کرسکتی ہو۔

راجکماری نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ کیا آپ سننے کے

لئے تیار ہیں؟

چندرکانت — ہاں‘ کہو‘ کیا خواہش ہے؟

• راجکماری — میری فوج کا ایک بہادر سپاہی درجن سنگھ

تھا۔ اس نے مرتے وقت اپنے دوست وجیت سنگھ کے لئے ایک

پیام دیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا دوست وجیت تمہارے

ہی ملک کا باشندہ تھا۔ میں وجیت کو اس کے دوست کا پیام

پہنچانا اپنا فرض سمجھتی ہوں‘ بس میری آخری تمنا یہی ہے!

راجہ — کیا درجن سنگھ واقعی مرگیا؟ اس کا کیا پیام ہے

راجکماری؟ کہو میں تمہاری جان بخشی کردونگا۔

راجکماری — اس نے کہا تھا کہ وجیت بھی اپنے راجہ کی

طرح عورتوں سے نفرت کرتا ہے مگر وہ غلطی پر ہے۔ عورتوں

کا وجود مردوں کی ہستی کی بقا کے لئے ناگزیر ہے۔ اگر تم اسی طرح

عورتوں سے متنفر اور بیزار رہو گے تو تمہاری نسل کیسے

چلے گی؟ تم اپنا جانشین کسے بناؤ گے؟ تمہارا نام کیسے زندہ

اور باقی رہے گا؟ اگر تمہارے آبا و اجداد بھی ایسا ہی کرتے تو آج

تمہارا وجود کہاں ہوتا؟ ان کے نام کو کون روشن کرتا؟ اگر تمام

مرد تمہارے خیال سے متفق ہو کر تمہاری ہی طرح عورتوں سے

کنارہ کشی اختیار کرلیں تو موجودہ نسل کے خاتمہ کے بعد دنیا سے

انسان کا نام و نشان ہی مٹ جائے۔ مرد و عورت ایک دوسرے

سے نفرت و پرہیز کرنے کے لئے نہیں بنائے گئے ہیں بلکہ

ایک دوسرے سے محبت کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ انسان

ہی پر کیا موقوف ہے۔ دنیا کی ہر مخلوق میں جذبۂ محبت کارفرما ہے

بھونرے کو دیکھو کس طرح روش روش اور ڈال ڈال پریم اگ

گاتا پھرتا ہے‘ ندی کو دیکھو کس جوش محبت کے ساتھ دوڑی بھاگی

سمندر سے ہم آغوش ہونے کے لئے چلی جا رہی ہے۔ سوچو

اور سمجھو کہ عورت کے بغیر مرد کو دنیا میں کبھی سچی مسرت و شادمانی کی

زندگی نصیب ہو سکتی ہے؟

راجہ کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں اس نے کہا۔

راجکماری اشالتا! کیا اب درجن سنگھ سے ملاقات نہیں ہو سکتی؟

”اگر ملاقات ہو تو کیا کرو — راجہ؟

”اگر اس سے ملاقات ہو جاتی تو وہ دیکھتا کہ اس کا دوست اپنی

غلطی پر کتنا نادم و شرمسار ہے ؟"

"تو میں اس سے ملاقات کرا دوں گی راجہ"

"سچ ؟" ــ راجہ نے بے ساختہ دوڑ کر راجکماری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ راجہ نے دیکھا کہ یہ تو درجن سنگھ ہی کا ہاتھ ہے تو کیا وہ درجن سنگھ کی صورت میں راجکماری اشا لتا ہی تھی ؟ وہ حیرت و استعجاب کے دریا میں غوطے کھانے لگا۔

" میں ہوں تمھاری درجن ! تمھاری قیدی، راجکماری آشا لتا !"

" میری درجن، میری آشا لتا !" دیوانوں کی طرح کہتا ہوا راجہ نے راجکماری کو گلے سے لگا لیا۔

ویران شہر از سرِ نو آباد ہو گیا۔

تاریخ پر بھاری نہ بن

اثر خامہ جناب شاد عارفی صاحب

اے باغبان ہند اُٹھ | اے پاسبانِ ہند اُٹھ
اے نوجوانِ ہند اُٹھ

جوشِ عمل سے کام لے | گرتے ہوؤں کو تھام لے

غفلت کے زانو پر نہ سو | حد ہو چکی بیدار رہو
تقدیر کا رونا نہ رو

ہمت سے اربابِ عمل | قسمت بھی لیتے ہیں بدل

فردا کی ہے کس کو خبر | خدمت وطن کی کر گزر
ناکامیابی سے نہ ڈر

رستہ پہ آزادی کے چل | ٹھوکر پہ ٹھوکر کھا سنبھل

مستقبل افترا کا نہ کر | آغاز نیک انجام کر
حُبِّ وطن میں نام کر

معمولِ غداری نہ بن | تاریخ پر بھاری نہ بن

(ماہِ نو)

ترجمہ از

جنابِ تمنّائی

چاند :-

میں نے پوچھا: "شام کو جب گول پورا چاند کدم کی شاخوں میں اُلجھ جاتا ہے۔ کوئی اُسے پکڑ نہیں سکتا؟"

لیکن بھیّا ہنس پڑے اور بولے: "ننھے، تم سے زیادہ بیوقوف لڑکا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ چاند اتنی دور ہے؛ کوئی اسے پکڑ کیسے سکتا ہے؟"

میں نے کہا: "بھیّا کیا کہتے ہیں! کھڑکی کے نیچے جب ہم کھیلتے ہوتے ہیں اور اماں سر نکال کے مسکراتی ہیں تو کیا اماں کا پیارا چہرہ بہت دور ہوتا ہے؟"

بھیّا نے کہا: "تم احمق ہو ننھے، ... اور پھر تم اتنا بڑا جال کہاں سے لاؤ گے کہ چاند کو پکڑ سکو؟"

میں نے کہا: "واہ واہ! ہاتھوں میں پکڑ لیں گے!"

بھیّا پھر ہنس پڑے اور کہا: "تم سے زیادہ بیوقوف لڑکا آج تک میں نے نہیں دیکھا۔ اگر نزدیک آ جائے تو معلوم ہوگا کہ چاند کتنا بڑا ہے۔"

میں نے کہا: "بھیّا، اسکول میں لوگ کیسی واہیات باتیں آپ کو پڑھاتے ہیں! اماں جب جھک کے ہمارے منہ چومتی ہیں تو کیا اماں کا چہرہ بہت بڑا ہو جاتا ہے؟"

لیکن بھیّا نے کہا: "تم احمق ہو!" ....

کہاں سے؟

"میں کہاں سے آیا ہوں؟ تم نے مجھے کہاں سے پالیا ہے؟" ننھے نے اماں سے پوچھا۔

اماں نے روتے ہنستے ننھے کو سینہ سے چمٹا کے کہا :-

"تم میرے دل میں آرزو بن کر چھپے تھے، میری جان!

"تم میرے بچپن کے کھلونوں میں تھے۔ جب میں مٹی کی مورتیں بناتی اور توڑ دیتی تھی تو دراصل تمہیں بناتی اور توڑتی تھی، میرے لعل!

"تم میرے دیوتاؤں میں تھے۔ انھیں پوجنے میں میں تمہیں پوجتی تھی!

"میری تمام امیدوں میں، محبت میں، زندگی میں، تم ہی تم تھے، میرے ننھے!

"نہ فنا ہونے والی خوشی میں جو ہمارے گھر میں ہے، تمہاری ہی رَو تھی، میرے پیارے!

"دوشیزگی میں جب میرا دل اپنی پنکھڑیاں کھول رہا تھا، تم اسکی خوشبو تھے!

"میرے پُرشباب جسم و اعضا میں تمہاری نرمی تھی، تمہارا گداز، جیسے سورج نکلنے سے پہلے آسمان پر روشنی! جنت کے ننھے دلارے، صبح کی روشنی کے ساتھ آنے والے، تم ہستی کے آبشار میں بہتے بہتے آخر میرے دل سے آ لگے ہو۔ جب تمہارے چہرہ کو دیکھتی ہوں تو ایک طلسم میں کھو جاتی ہوں، تم جو سب کے ہو، صرف میرے بن گئے!

"کھو دینے کے ڈر سے میں تمہیں سینے سے چمٹائے رکھتی ہوں۔

"کون سے جادو نے میرے ان کمزور بازوؤں میں دنیا کی دولت کو گھیر رکھا ہے!"

جذبات :

جو تمہارے جی میں آئے کہو لیکن اپنے بچے کی کمزوری میں خوب جانتی ہوں۔

بیٹا اس سے محبت کرتی ہوں اس لئے نہیں کہ وہ اچھا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ میرا ننھا ہے: میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ وہ کتنا پیارا ہوتا ہے جب اسکی غلطیوں کا اسکی خوبیوں سے موازنہ کرنے لگتی ہوں!

جب میں اسے سزا دینا چاہتی ہوں تو وہ بالکل میرا جزو معلوم ہونے لگتا ہے؛ جب میں اسے رُلاتی ہوں تو میرا دل خود آنسو بہانے لگتا ہے۔ اسے ملامت کرنے کا اسے سزا دینے کا صرف مجھے حق ہے۔ صرف وہی سزا دے سکتا ہے جو محبت کرتا ہو! (رابندر ناتھ ٹیگور)

آرہا ہے

سرسوتی سینے ٹون پونا کا انوکھا فلم

سچ ہے

اس فلم میں
چھٹے ہوئے
بہترین
سٹار کام کرتے ہیں

خاص اداکار:۔ موتی لال .... مس روز ...... بابا ویاس

سرسوتی سینے ٹون پونا کا

یہ وہ فلم ہے جو اپنی جلوہ فشانیوں اور برق پاشیوں کے ہنگاموں سے آپکو مبہوت کر دیگا!



یہ پکچر ہندی اور مرہٹی دو زبانوں کے مکالمے پر منحصر ہوئی ہے!! جن فلم اسٹاروں نے اس تصویر کے آسمان کو کہکشاں اور قوس قزح کی رنگینیاں اور حسن کاریوں کا افق بنا دیا ہے اُنکے نام کی فہرست ذیل میں ہے (۱) چندر کانت (۲) لیلا (۳) رتنا پربھا (۴) لو ندرے (۵) ڈنکر کمنار (۶) اوشا وغیرہم

اس کاروانِ رنگ و نور، انجمن حسن و جمال کی رہنمائی و سربراہی (یعنی ڈائرکشن) جس مشاق و طاق اُستادِ فن نے کی ہے وہ ہر تعارف و تعریف سے بالاتر واقع ہوئے ہیں! ہمارا روئے سخن جناب کمال جی پنڈھارکر کی ذات کی طرف ہے۔

پکچر کو براہ راست شخصی نگرانی جس بے مثال ماہر فن کی نصیب ہوئی ہے وہ شہرۂ ہندمسٹر آر۔ بی۔ ٹورنی ہیں۔

الغرض گوپی چند وہ پکچر ہے جو اعلیٰ ذوق کے تماشائیوں کے چشم و گوش کیلئے بالکل اک تازہ بتازہ نو بنو چیز ہو۔

اس کے نمائش کے پردے دونوں شے "عظمت و شرکت" کے جلوؤں سے لبریز ہے۔

گوپی چند سینما کے ایک پوری ہند کی ایک پکچر ہے۔



از جناب طنازِ ہند مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

۱

دُنیا سے الگ جا کے کہیں سر پھوڑو
یا جیتے ہی جی مُردوں سے ناتا جوڑو
کیوں ٹھوکریں کھانے کو پڑے ہو بیکار
بڑھنا ہے بڑھو، نہیں رستہ چھوڑو!

۲

کیا کیجیے رام رام کرتے ہی بنی
جائز نہ سہی یہ کام کرتے ہی بنی
چاہا تو بہت بتوں سے منہ پھیر چلوں
جھکتے ہی بنی سلام کرتے ہی بنی!

۳

کچھ کر تو چلیں، کوششِ ناکام سہی
انعام کے بدلے اور دشنام سہی
اُمید سلامت ہے تو کیوں باز آئیں
بوسہ نہ سہی بوسہ بہ پیغام سہی

۴

ہا ہا، شوخیِ طبع ہے لڑائی تو نہیں
کہتا ہوں کھری، اس میں بُرائی تو نہیں
کیوں ہر کس و ناکس ہے یگانہ دشمن؟
تاننی کی گدھی، کوئی بھگائی تو نہیں

۵

کیا جانیں، یہ کمبخت ہیں بندے کس کے
اللہ ہی پھیرے تو پھریں دن ان کے
جینے کا ہنر سیکھیں تو کیوں کر سیکھیں
جیتے مُردے جو سانس لیں گن گن کے!

۶

ارمان نکلنے کا مزہ ہے کچھ اور
اور رشک سے جلنے کا مزہ ہے کچھ اور
ہاں یاد ہے دوست سے لپٹنا لیکن
دُشمن کو کچلنے کا مزہ ہے کچھ اور



تیار کرنے والی منروا کا
تازہ ترین سوشل شاہکار







ڈائرکٹر:- کے۔ ایم ملتانی

پری چہرہ نسیم کی دل لبھانے والی اداکاری اور جادو بھرے گانے آپ پر وجد طاری کر دیں گے۔

دیگر اداکار:- نوین یاگنک۔ صادق علی۔ شاہ نواز۔ بٹی۔ بے بی کملا۔ خواجہ صابر غلام حسین۔ رمیش اور ابو بکر

منروا ہال لیمنگٹن روڈ بمبئی میں دسہرہ کے دن سے



"یہ خواب نہیں بلکہ خواب کی تعبیر ہے میری برجبیں!" کہتے ہوئے بے ساختہ ہمایوں نے اُس کا مُنہ چُوم لیا۔ برجبیں تھر تھر کانپنے لگی۔ جذبات نے اُسے مغلوب کر لیا۔ غیر متوقع طور پر اُسے اپنی کھوئی ہوئی چیز دوبارہ مل گئی تھی۔

وہ آرام کرسی پر بیٹھ گئی —— کرسی کی پُشت پر سر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں —— اُسے یقین نہ آتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی قسمت پھر مجھ سے کھیل رہی ہے۔

ہمایوں گھبرا سا گیا اور برجبیں کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور پکارنے لگا "عزیزہ! برجبیں!! تم کہاں ہو —— ہوش میں آؤ" برجبیں نے ہمایوں کا ہاتھ لے کر اپنے دل سے لگا لیا اور اُس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ڈھلک کر اُس کے رخساروں پر آ رہے —— یہ آنسو خوشی اور اطمینان کے تھے۔ مگر ہمایوں کی تاب جاتی رہی اُس نے بے چین ہو کر برجبیں کو اپنی آغوش میں لے لیا

ہمایوں اور برجبیں کی شادی ہو گئی۔ برجبیں دُلہن بنی ہوئی اتنی خوبصورت اور دلکش معلوم ہوتی تھی کہ ساری محفل کی نظریں اُس پر جمی ہوئی تھیں ——

وہ سفید ریشم کا جوڑا جس پر سُنہرے سلمے ستارے کا نہایت نفیس کام تھا۔ اور ہیرے کا سٹ پہنے ہوئے تھی۔ سفید لباس اور سفید چمکتے ہوئے زیوروں میں سے اُس کا تر و تازہ اور گلابی جسم ایسا جھلکتا تھا۔ جیسے سفید بلّور کے شیشے میں سے سُرخ شراب جھلک رہی ہو۔ بالوں کی شوبھا، گلاب کے پھولوں اور چنبیلی کی کلیوں نے بڑھا رکھی تھی۔ دوست احباب مسٹر ہمایوں کو مبارکباد دے رہے تھے کہ ایسی دُلہن پائی۔ برجبیں کے رُخسار فرطِ حیا سے سُرخ ہو رہے تھے۔ لمبی لمبی اور گھنی پلکیں جھپکی جاتی تھیں اور ان میں سے خوبصورت اور چمکدار آنکھیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔

ہمایوں اطمینان کی سانس لے کر دل ہی دل میں کہتا۔ اُف! مدتوں کی بے چینی اور تڑپ کے بعد آج دل کو قرار نصیب ہوا ہے۔ اب برجبیں میری ہے۔ میری محبت سچی تھی —— بالآخر اُس نے مجھے ملا ہی دیا —— آہ پیاری برجبیں! میری برجبیں!! اُس کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔

برجبیں دل میں سوچ رہی تھی۔ الٰہی! شکر ہے —— تو نے مجھے بچا لیا۔ میری دیرینہ تمنا پوری ہو گئی —— میں صرف ہمایوں کی ہوں اور وہ میرا —— اب کوئی طاقت مجھے اس سے جدا نہیں کر سکتی۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ عشق کا نتیجہ تو موت ہوتی ہے مگر میری محبت کا نتیجہ شادی؟ —— میرا ہمایوں! اُس نے سچ پوچھو تو میرے لیے کتنی تکلیفیں اُٹھائیں۔ موت کے مُنہ سے بچا ——

— آہ — آج اُن تمام تلخ کامیوں کی یاد سے روح کانپ
اٹھتی ہے — دنیا میں ہمایوں سے زیادہ میری قدر — عزت
اور محبت کوئی نہیں کر سکتا — اور میں اُسے کتنا چاہتی ہوں
— کوئی میرے دل سے پوچھے — اب ہم زندگی بھر کے
رفیق اور ساتھی ہیں —

(شادی کے بعد پہلے ہفتے میں)

ہمایوں اور برجیس محسوس کرتے تھے کہ وہ فضائے لطیف
میں تیر رہے ہیں۔ اُنھیں مسرت و بہجت کی لہریں جھولا جھلا رہی
ہیں۔ کیف و سُرور اُن پر نثار ہو رہے ہیں۔ سوائے محبت کے اُنھیں
کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ کون ہیں، کہاں ہیں، — اور کیا ہیں —
خوشیاں اور کامیابی اُن کے قدم آنکھوں پر لے رہی تھیں۔

(شادی کے بعد دوسرے ہفتے میں)

اُنھیں ذرا ہوش آیا۔ وہ کہنے لگے "او خدا! اتنی خوشی!
ایسی بے خودی — اتنی مستی — یہ چیزیں اتنی زیادہ بھی ہوتی
ہیں؟ خوشیوں کے بوجھ بھی بہت بھاری ڈالتے ہیں — ہم کچھ
تکان سی محسوس کر رہے ہیں۔ ذرا ان خوشیوں کو کم کر دے —
کامیابی اور خوشیوں کی مٹھاس سے منہ بھر گیا ہے — ہم ذائقہ بدلنا چاہتے
ہیں۔ اُف! ... وہ کسک کہاں گئی جو پہلو میں تھی؟ ... آہ ...
بڑی چیز کھو گئی! آج ہمارا گوشۂ دل اُس قیمتی چیز ... 'کسک' سے کیوں
محروم ہے؟ اُف یہ کیا ہوا — بڑی نعمت چھن گئی —

انسان کی فطرت کا خاصہ ہے کہ جو چیز نہ ملے، یا اُسے بہت
عزیز ہو، اور اُس کے لئے تڑپتا رہتا ہو اگر مل جائے تو اُس
کی قدر و قیمت بہت کم ہو جاتی ہے۔ ہمایوں اور برجیس
جو شادی سے پہلے ایک دوسرے کو نہ معلوم کیا سمجھتے تھے اب ایک دوسرے
کے لئے معمولی حیثیت کے رہ گئے۔ شادی اور ملاپ کی مسرتیں
تھک گئیں۔ کیفیات کا نشہ جلد ہی اُتر گیا۔ محبت مضمحل معلوم ہونے لگی۔
ان کی شادی کو ۱۱ سال ہو چکے تھے۔ تین بچے تھے۔ خسرو، بلقیس
اور نسرین۔ بالکل اپنے ماں باپ کی طرح خوبصورت۔ شوخ و شنگ

اب ایسے بھی دن آنے لگے تھے کہ برجیس ہمایوں سے رو رو کر
کہتی کہ میں اسی لئے تو کہتی تھی کہ شادی نہ کرو۔ ہمایوں جواب دیتا۔
"بیشک یہ ہماری حماقت تھی کہ شادی کر لی۔ دنیا میں محبت کوئی چیز
نہیں ہے یہ سب فریب نفس ہے۔"
برجیس کہتی "ہائے اُف وہ پشیماں کا پشیماں ہونا۔ یہ عقدہ تم
پر اب کھلا جب میری اور اپنی زندگی کی لطافتوں کو نفس کی بھینٹ
چڑھا چکے؟ —"
"ہاں" ہمایوں تلخی سے کہتا۔ اب تمہیں جو کرنا ہے کر لو۔
میری طرف سے پوری اجازت ہے" — "نہیں سمجھتی تو علیحدہ ہو جاؤ"
برجیس منہ پھیر کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگتی — اور ہمایوں
کتاب لے کر پلنگ پر جا لیٹتا — خسرو — اور بلقیس جن کی
عمریں بالترتیب دس اور نو سال کی تھیں۔ اسکول کے کپڑے پہنے
اور کتابیں ہاتھ میں لئے ایک طرف افسردہ کھڑے ہوتے۔ اُن
کا دل سکول جانے کو نہ چاہتا — اور سوچتے کہ ہمارے ماں
باپ ایسی ذرا ذرا سی باتوں پر کیوں لڑا کرتے ہیں؟ کہ پنجاب کا
صوبہ برا ہے یا اچھا۔ خدا کا وجود حقیقت میں ہے یا نہیں"

دھوبی کو سنیچر کے دن کپڑے دیئے جایا کریں یا جمعہ کو" انور پاشا
اچھے تھے یا بُرے"

اُن کو یہ کیا خبر تھی کہ یہ محبت کے بخار کا بحران تھا ——

استنے میں اُن معصوموں کو ماں اور باپ دونوں کی طرف سے
ڈانٹ پڑتی کہ اسکول جاؤ۔ وہ دل میں ڈرتے کہ اب دیر ہوگئی ہے سکول
میں ماسٹروں کی بھی ڈانٹ پڑے گی۔ مگر کیا کرسکتے تھے چار و ناچار سکول کو جاتے۔

یہاں برجیس ہمایوں میں اس بات پر بحث شروع ہو جاتی 'شادی
ماں باپ کی کی ہوئی کامیاب ہوتی ہے یا بربنائے محبت! مگر کچھ
فیصلہ نہ ہو سکتا۔ بحث میں تلخی پیدا ہو جایا کرتی۔ دماغی توازن قائم
نہ رہتا۔ اور ہمایوں یہ کہہ بیٹھتا کہ سروری تم سے لاکھ درجے اچھی تھی
برجیس کہتی اب کیا بگڑا ہے۔ جاؤ سروری ہی کی طرح کسی لڑکی سے
شادی کرلو۔

ہمایوں ناراض ہو کر کوٹ پہن کر باہر چل دیتا۔ مگر جاتے وقت
پلٹ کر برجیس کو دیکھتا اُس کی سُرخ آنکھیں' آنسوؤں سے تر "منہ"
دیکھ کر اُس کے کلیجے پر چھریاں سی چل جاتیں اُس کا دل چاہتا کہ اُسے
اپنے آغوش میں لے کے اُس کے آنسو پونچھے۔ اُسے پیار کر کے
چُپ کرادے مگر اُس کی "مردانہ آن" اُسے ایسا کرنے سے روکتی ——
وہ باہر چلا جاتا۔ برجیس دل میں سوچتی دیکھو اس نے مجھے دھوکا دیا۔
پہلے کتنی محبت تھی اب اس نے مجھے روتے دیکھا مگر آنسو تک نہ پوچھے۔ پہلے
میری ذرا سی افسردگی پر بے چین ہو جایا کرتا تھا۔ آہ —— مرد کی محبت!
بالکل ایک دھوکا ہے حالانکہ اُسے معلوم ہے کہ ہم نے اس کے لئے
کتنی قربانیاں کی ہیں۔ یکایک اس کی نظروں میں ہمایوں کا افسردہ چہرہ
پھر جاتا۔ وہ بیقرار ہو کر اُٹھتی اور کھڑکی میں سے اُسے جاتے ہوئے
دیکھتی۔ نوکر کو دوڑاتی کہ پوچھ آپ کب تک واپس آئیں گے —— اور
اُسے جھانکتی رہتی۔ جب وہ پلٹ کر دیکھتا تو یہ چھپ جاتی۔ اُسکی محبت
جاگ اُٹھتی۔ وہ اللہ سے دعا کرتی کہ یہ خوش رہے۔ اِس کے رونئیں پر
آنچ نہ آئے اُس کی بلائیں مجھ پر آئیں۔ یہ بچارہ ہے۔ ہمایوں میری زندگی
کا ساتھی اور رفیق ہے۔ میرے بچوں کا باپ ہے میری خوشیوں کا مرکز ہے۔

ہمایوں کا دل کہیں نہ لگتا۔ برجیس کا خیال ہی اُس پر چھایا رہتا
وہ جلد ہی لوٹ آتا۔ تین چار دن اِسی طرح کٹے۔ پھر وہ مل جاتے۔ ایک روز
برجیس نے کہا۔ محبت کے نتیجے دو ہی ہیں۔ یا تو جدائی میں تڑپتے ہوئے جان دیدینا
یا اگر محبت کی شامت آجانے سے مل گئے تو تڑپ' کشش' اور محبت' کو اپنے
ہاتھوں فنا دینا۔ "قیس و لیلیٰ" جن کا عشق زبان زد خلائق ہے جنکی کبھی فنا
نہ ہونے والی محبت پر دنیا ایمان لے آئی ہے انکی محبت کی اس عظمت شوکت کا
سہرا "جدائی" کے ہی سر ہے۔ ورنہ کیا یہ سو فیصدی یقین کے ساتھ نہیں
کہا جا سکتا کہ اگر فرض کر لیا جائے کہ "قیس و لیلیٰ" جدائی کی تلخیاں' فراق کی
تپشیں سہنے کے بعد مل جاتے تو آج اُن کی محبت کا نام بھی کوئی نہ جانتا۔
اور یہی حالت ہوتی جو ہماری ہوئی ہے۔

اس کے بعد اُس نے —— ہمایوں سے سمجھوتہ کر کے معمول بنا
لیا تھا کہ سال میں ۱۰ ماہ کے لئے ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے میاں بیوی
کے سے تعلقات رکھے جائیں۔ معمولی دوستوں کی طرح دونوں رہتے اور
ایک دوسرے کے لئے تڑپتے —— اور ہر سال ۲ ماہ کے لئے
دور دراز کسی دوسرے شہر میں چلی جاتی۔ اس عارضی جدائی سے انکی
محبت پھر بیدار ہو جاتی اور زندگی میں نئی دلکشی پیدا ہو جایا کرتی

"تو سُنا مسٹر توفیق —— میری ملکہ آج کل یہاں سے
ڈیڑھ ہزار میل پر بیٹھی ہوئی مجھے جدائی کے مزے لینے پر مجبور کررہی
ہیں —— اور میں یہاں اُن کی یاد میں تڑپ رہا ہوں —— چونکہ یہی تو
ہی محبت کی زندگی ہے" ہمایوں نے کہکر کہانی ختم کر دی۔ تمام شد



بائیسواں ہفتہ ۲۱

پربھات آخر پربھات ہی ہے

مہینوں سے وہی چہل پہل ہے

لارڈ کرشنا کی زندگی۔ جسے آج تک کوئی بھی ایسے اچھوتے رنگ میں پیش نہیں کر سکا

ڈائرکٹر:۔ ڈاملے اور فتح لال

گوپال کرشن

جسمیں شانتا آپٹے رام مراٹھے

پرسرام۔ پرہلاد۔ اور ایک ہزار دوسرے اداکار کام کرتے ہیں۔

سنٹرل ٹاکیز

ڈائرکٹر کے نرائن کالے

پربھات کا آنے والا شاہکار

میرا لڑکا

پربھات کی نئی تلاش مسز شانتا بائی ہبلیکر ماما بھینٹ۔ وسنت الہانس۔ چھوٹو

شانتا مجمدار۔ باوا صاحب وغیرہ

تاریخ کا انتظار کیجئے

عازمان حج کو ہمارا مشورہ

مغل لائن ہر سال اپنے جہازوں کو پہلے سے زیادہ آرام دہ اور عافیت بخش بناتی رہتی ہے۔ امسال سات آٹھ لاکھ روپیہ خرچ کر کے مغل لائن نے "رضوانی" اور "رحمانی" جہازوں کو اسلامی جہاز سے بھی زیادہ آرام دہ بنا دیا ہے۔

قابل تعریف بات یہ ہے کہ "اسلامی جہاز" کے کیبن۔ سیلون اور تمام وہ مقامات جہاں ڈیک پر سفر کرنے والے رہتے ہیں "فورسڈ ڈرافٹ" کے ذریعہ جو تھرموٹنک سسٹم کہلاتا ہے تازہ ہوا آتی جاتی اور بدلتی رہتی ہے۔ تازہ ہوا پہنچانے کا یہ سسٹم حاجیوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔

کھانے کا نظم: کھانے کا انتظام بمبئی کی ایک مشہور مسلم فرم کے ہاتھ میں ہے۔ جہاز میں تازہ گوشت مہیا کرنے کے لئے کثیر تعداد میں بھیڑیں اور بکریاں رکھی جاتی ہیں۔ اور حاجیوں کے سامنے اُن کو ذبح کیا جاتا ہے۔ تازہ سبزیوں اور پھلوں کو تازہ اور صحت پرور رکھنے کے لئے

کا انتظام ہے امسال

ریفریجریٹر کھانے کے انتظام میں بہت ہی فیاضانہ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

کرایہ میں تخفیف: مغل لائن نے اُن حاجیوں کے لئے جو رمضان سے پہلے سفر کریں اُن کے لئے کرایہ میں تخفیف کر دی ہے۔ بعض کوتاہ اندیش لوگوں نے اسکو "کرایہ کی جنگ" سے تعبیر کیا ہے حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ اگر عازمان حج کی تعداد مختلف جہازوں میں پھیل جائے۔ تو ضرور قیمت پر جانیوالے جہازوں میں بھیڑ کم ہوگی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کو زیادہ جگہ اور زیادہ آرام ملے گا۔ اور ساتھ ہی کمپنی کا خرچ بھی کچھ کم ہو جائیگا۔ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو رائے دیں گے کہ مغل لائن کی ہر ممکن طریقہ سے ہمت افزائی کریں تاکہ یہ کمپنی ہر سال اسی طرح ترقی و اصلاح کرتی رہے اور کرایہ میں جتنی کمی ممکن ہو کر سکے۔ ہمیں یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ چند لوگ نہ معلوم کن مصلحتوں کی بناء پر مغل لائن کو بدنام کرنیکی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لئے عام مسلمان بھائیوں کو چاہئے کہ وہ اس قسم کے پُرفریب پروپگنڈے سے متاثر نہ ہوں۔ بلکہ ساحل پر آ کر مشاہدہ اور تجربہ کی بناء پر جہاز کا ٹکٹ خریدیں۔

واپسی

مغل لائن کے پاس سات آٹھ بڑے بڑے جہازات ہیں اور یہ جہازات حجاز کے بندرگاہوں پر سال بھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ حج کے موسم میں حاجیوں کو پہنچا دیا اور مہینہ سوا مہینہ میں جو حاجی واپس آنا چاہیں اُن کو واپس لے آئے بلکہ یہ حاجیوں کی مرضی پر ہے کہ جب چاہیں وہ واپس آئیں۔ حج کا موسم ہو یا نہ ہو مغل لائن کے جہاز سال بھر انہیں ساحلوں پر کام کرتے رہتے ہیں بعض لوگ یہ پروپگنڈا کر رہے ہیں کہ صرف ایک طرف کا ٹکٹ لیا جائے اس کے تو معنی یہ ہوئے کہ یہ کمپنیاں حاجیوں کو واپس لانیکا ذمہ نہیں لیتیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے واپسی کے وقت حاجی بہت پریشان ہونگے۔ چنانچہ گزشتہ سال سندھیا کے جہاز پر جانے والے اکثر حاجیوں کو بہت پریشانی ہوئی۔ جب وہ واپسی کے لئے جدہ پہنچے تو سندھیا کا جہاز نہ ملا۔ وہ تو خیر سے مغل لائن کے جہاز آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ مغل لائن کے کارکنوں نے بغیر کسی پس و پیش کے اُن حاجیوں کو اُن کی منزل مقصود تک پہنچا دیا۔

اسی لئے ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ ہمیشہ "واپسی ٹکٹ" لیا کریں ورنہ واپسی کے وقت بہت سی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ملا طیب علی بی۔ اے سکریٹری آل انڈیا پبلک ہیلتھ ایڈوائزری کمپنی بمبئی
سنٹرل بنک بلڈنگ ۳۷ سائکلی سٹریٹ بمبئی ۸

تیسرا ہفتہ
رنجیت مووی ٹون کا انوکھا فلم



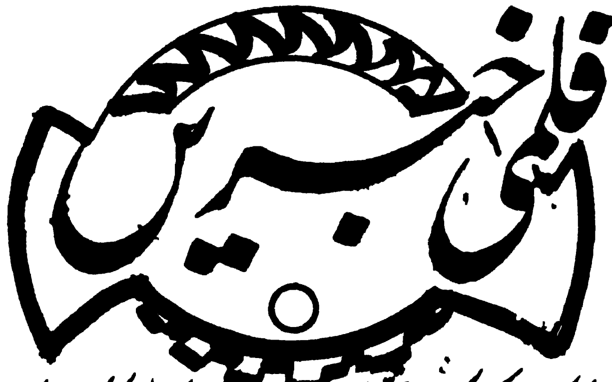


جینت ڈیسائی نے
اسے بالکل
اچھوتے
رنگ میں
پیش کیا ہے

اداکار:-
سنیتا دیوی
ایلا دیوی
پلیموریا
مظہر
ایشورلال
خاتون
اور کلیانی وغیرہ

ساتھ ہی لنکا دہن کا کامک بھی دکھایا جائیگا۔

ویسٹ اینڈ ٹاکیز بمبئی میں



رنجیت مووی ٹون :- کی کومیڈی پکچر "کیٹ" "تیلی بہت" کامیابی کے ساتھ ویسٹ اینڈ ٹاکیز میں دکھائی جا رہی ہے۔ اس پکچر کے بعد رنجیت کا "سیکرٹری" پیش کیا جائے گا۔ تلسی داس اور اچھوت بھی بڑی تیزی کے ساتھ تیار ہو رہی ہیں

پربھات فلم کمپنی :- کا گوپال کرشنا ۲۲ ہفتوں سے سنٹرل ٹاکیز میں چل رہا ہے۔ پربھات کا فلم "میرا لڑکا" بڑے زور شور سے تیار ہو رہا ہے۔

ساگر مووی ٹون :- کا گراموفون سنگر بہت کامیاب رہا اور اس وقت تک ہاؤس فل جا رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ فلم بہت اچھا چلے گا سٹوڈیو میں لیڈیز اونلی کا بہت زور شور ہے مسٹر انوپم میوزک پر بہت محنت کر رہے ہیں گراموفون سنگر کے بعد ساگر کا بہت ہی عجیب و غریب فلم "پوسٹ مین" پیش کیا جائے گا۔ مسٹر لوہار کی پکچر "سروس لمیٹیڈ" بھی تیار ہو رہی ہے۔

منروا مووی ٹون :- کا "جیلر" اس وقت تک چل رہا ہے۔ کمپنی کے اس پکچر کو ریکارڈ پکچر کہا جا سکتا ہے۔ غالباً کمپنی کا یہ فلم چوٹی کا فلم ہے۔ منروا مووی ٹون کا نیا پکچر "واسنتی" منروا ٹاکیز میں دسہرہ کے دن سے شروع ہوگا۔

سرسوتی سینے ٹون :- کا گوپی چند "راجل دیپرماد" میں اس وقت تک بڑے زور شور سے چل رہا ہے۔ سرسوتی کا پکچر "پیچ ہے" قریب قریب تیار ہے۔ اس میں مسٹر چودھری نے بہت محنت کی ہے۔ موتی لعل اور روز کا کام بھی دیکھنے لائق ہے۔

واڈیا مووی ٹون :- کے فلم "دبے کمار" اور پنجاب میل بڑے زور شور کے ساتھ تیار ہو رہے ہیں۔ عنقریب ہی پیش کئے جائیں گے۔

نیو تھیٹرز :- کا فلم ادھیکار آنے والا ہے۔

بمبئی ٹاکیز :- تو نیوز دینے کے خلاف ہی ہیں۔ معلوم نہیں نرمن کے بعد کیا آنے والا ہے۔



ساگر موویٹون کا رومانی ڈرامہ



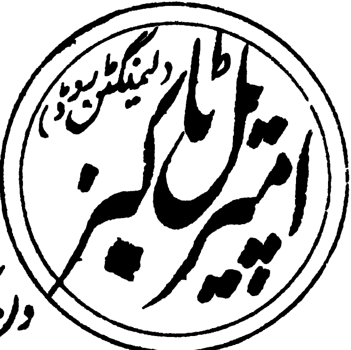
وہ مجسم گیت تھا - وہ - اس گیت کی مستی میں کھو گئی -



ڈائرکٹران
ویریندر دیسائی
رام چندر ٹھاکر

خاص اداکار
مس سبندر - پربھا - ببو
بدھوا ڈووانی - پانڈے
سنگھا پرشاد - قیوم علی
وغیرہ

اوقات
روزانہ
۵½ ، ۸ و
۱۰¾ بجے شب کو
سنیچر، اتوار، تہوار
کے ۲½ بجے
دن کو ایک کھیل زائد ہوگا!





SUNITA D I
IN FAN I CAT





NAEEM

PRABHA DEVI



See her … Sagar's latest … running at Imperial Talkies

SHANTA HUBLIKAR



Prabhat's new find She is coming in My Son

Only Cover Printed at the Lakshmi Art Printing Works Sankli Street Byculla, Bombay, 8


The TANVIR
MONTHLY
BOMBAY, 8
NOVEMBER
1938
مدیرہ :-
"سحر"

DESH BANDHU GUPTA M L A



To whom Afsana Brothers is dedicated in this issue by Sahir

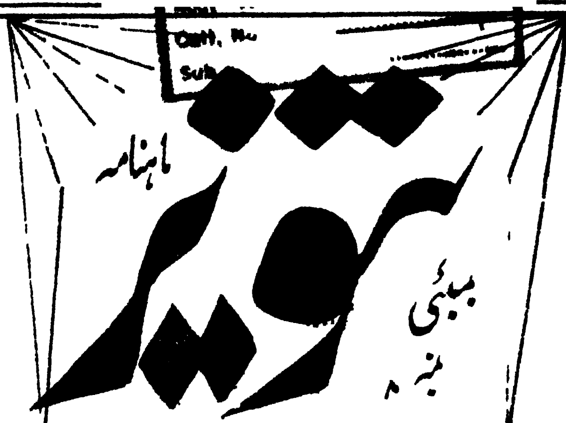
ماہنامہ تنویر

ہر انگریزی مہینے

کی ۷ تاریخ کو

شائع ہوتا ہے

مدیرہ سحر



سالانہ ہے

ششماہی عا۸ر

فی پرچہ ۴ر

مقامی ۳ر

ممالک غیر سے دس شلنگ

نائب مدیرہ :۔ انوری خانم

جلد ۲ | فہرست مضامین ماہ نومبر ۱۹۳۸ء | شمارہ ۱۱

سحر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی سے چھپوا کر دفتر رسالہ تنویر بمقام ۲ سانکلی اسٹریٹ بمبئی ۸ سے شائع کیا



دیوالی

سے تنویر کو خاص نسبت ہے۔ دیوالی آئی اور چلی گئی، سیاہی کو سفیدی سے بدل دیا گیا۔ اندھیری رات کو بجلی کے قمقموں سے ایسا جگمگا دیا گیا کہ دن کو بھی اُس پر رشک آنے لگے دیوالی ہندوستان کا خاص تہوار ہے۔ پھر بھی ہم نہیں جانتے کہ ہندوستان کی غلامی کی تاریک فضا کو کس طرح منور بنائیں۔

ہندوستانی اس روز لکشمی کی پوجا کرتے ہیں۔ اس پر بھی یہ دولت کی دیوی اُن سے سخت ناراض ہے اور اسی شہر بمبئی کی بندرگاہ سے ہر ہفتہ سونے کی شکل میں ولایت کو کھنچی چلی جا رہی ہے آخر اس کا کیا سبب ہے کہ جو لوگ لکشمی پوجا نہیں کرتے لکشمی جی اُنھیں پر فدا ہیں اور اُنھیں کے حضور میں حاضر ہے اور ہم جو اُن کا پوجن کرتے ہیں ہم سے وہ دور ہی دور بھاگتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ہمارا طریقۂ پرستش انھیں ناپسند ہے۔ لکشمی کی پوجا ہمت و جفاکشی سے کی جاتی ہے۔ بزنس میں ایمانداری اور دیانت ہی اسکی صحیح پوجا ہے۔

لکشمی کی پوجا کے لئے وہی ہاتھ جوڑے جا سکتے ہیں جو صاحب سیف و قلم ہوں۔ چونکہ لکشمی عالموں اور بہادروں کو ہی پسند کرتی ہے جاہلوں اور بزدلوں کو نہیں جس سر میں آزادی کا سودا سمایا ہو لکشمی اسی کے آگے نظر جھکاتی ہے۔ دولت کی دیوی آزاد قوموں کے قدموں میں اپنی جگہ بناتی ہے۔ غلام قوم کی شہ رگ پر تو فلاکت و نکبت کا ناخن ہوتا ہے۔ نحوست اور افلاس سر پر منڈلاتے رہتے ہیں ہندوستانی صحیح معنوں میں اگر لکشمی پوجن کرنا چاہتے ہیں۔ تو اُن کے ہاتھوں میں۔۔ سچائی کی تلوار، سر میں آزادی کا سودا، دلوں میں ہمت اور حوصلہ، معاملات میں دیانت و ایمانداری، مزاج میں تحمل و استقلال ہونا چاہئے چونکہ لکشمی پوجا کے لئے یہ نہایت ضروری سامگری ہے جس کے بغیر پوجا نامکمل رہتی ہے

رمضان المبارک

اس ماہ مبارک میں ریاضت وارتقاء کی زندگی بسر کرنیکی تاکید کی گئی ہے تاکہ انسانی طاقتوں اور فطرت کی اُپج میں اعتدال اور صحیح تناسب پیدا ہو کر انسان سچے معنوں میں انسان بن جائے۔ اگر ایک ماہ ہم صحیح طور پر غور و فکر کے ساتھ اپنے نفس کی تربیت کریں۔ اپنی بُرائیوں پر نظر ڈالیں اور اُن کا انسداد کریں اور اپنی خوبیوں کو بڑھنے کا موقعہ دیں تو اس ایک ماہ کی نیک "عادت" ہم کو گیارہ ماہ تک کے لئے سنبھالے رکھ سکتی ہے۔ اور دنیا سے برائیوں کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔

ہم دن بھر روزہ سے رہتے ہیں اِس سے ہمیں اُن بھوکوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے جو ہم جیسے ہی انسان ہیں ہم اپنے مال میں سے خدا کے نام پر کچھ حصہ نکالتے ہیں اور اپنے مستحق بھائیوں کو دیدیتے ہیں یہ انسانی ہمدردی کا پہلا سبق ہے۔

ہم اس مُبارک مہینے میں اپنے نفس کے ناجائز اور پست مطالبات کو روکتے ہیں چونکہ ہر چیز کی بہتات انسان کی طاقتوں کو تہس نہس کر ڈالتی ہے یہ "روک تھام" ہی بے پناہ طاقتوں کی بقا کی ضامن ہے ورنہ طاقت فنا ہو جاتی ہے ہم اس ماہ میں قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں اس پر غور و فکر کرتے ہیں تاکہ خدائی احکام کو ماننے کی صلاحیت ہم میں پیدا ہو۔

خدا کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ ضروری اور بالکل سادہ حکم کیا ہے؟ یہی کہ دنیا میں نیکی کو پھیلاؤ اور بدی کا خاتمہ کر دو۔

گر ہمائے بر حال ما

کہ ہم نے مذہب اور احکام مذہب کو ایک کھلونا بنا رکھا ہے۔ ہم خود غلام کیا بنے کہ ہمارا مذہب اور مذہبی احکام بھی رسم و رواج

کے غلام بن کر رہ گئے۔ ان کی روح "Spirit" باقی نہیں رہی۔ ان کے بے جان مُردے ہمارے سامنے پڑے ہیں اور اُن کے سہارے ہم اپنی مُردہ زندگی "گزارتے چلے جارہے ہیں۔
غضب خدا کا کہ آج "عبادت" بھی ہمارے اخلاق کو نہیں سنوار سکتی! پستی کی انتہا اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ اپنی زنگ خوردہ روحوں سے ہم نے آخری ہتھیار کو بھی زنگ آلودہ کر کے رکھ دیا ہے۔ خدا۔ رسول۔ قرآن اور عبادت ان سب کی متحدہ طاقتیں اور احکام بھی آج ہمیں نہیں سدھار سکے اور طرہ یہ کہ ہم ان ناموں پر اپنی جانیں قربان کرنے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں لیکن یہ جذبہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ورنہ ہم خدا اور رسول کے احکام کو عملاً کیوں نہیں مانتے؟ عقیدہ اگر عمل پر اثر انداز نہیں ہوتا تو وہ عقیدہ ناقص ہے!

آج جس کا دل چاہے مسجدوں اور مندروں کے دروازوں پر جا کر کھڑا رہے اور پھر ان میں سے جو انسان عبادت کر کے باہر نکلتے ہیں اگر ہو سکے تو ایک برائے نام عابد و زاہد کا پیچھا کرے اور اُن کے گھر جا کر اُس کی خانگی زندگی کو دیکھے اُس کے اعمال کو دیکھے کہ کہاں تک مذہب کے احکام کے مطابق ہیں ہمت و شجاعت کہاں تک ہے۔ علم و فضل کا کیا حال ہے تحمل و بردباری کس پیمانے تک ہے ایمانداری و دیانت کس درجہ پر ہے۔ خودداری اور انسانیت کا معیار کیا ہے عدل و انصاف کس حال میں ہیں۔ بیوی بچوں سے سلوک، پڑوسیوں سے برتاؤ کا کیا حال ہے۔
ظالموں و مظلوموں سے کس طرح پیش آتے ہیں۔ سچائی کی کہاں تک حمایت کرتے ہیں رحم و کرم کو کہاں تک کام میں لاتے ہیں۔ جس قرآن پاک کا اس ماہ مبارک میں صبح و شام ورد کرتے ہیں اُسے کبھی سمجھنے کی بھی کوشش کی؟ اور جو کچھ سمجھا اُس پر عمل کہاں تک کرتے ہیں۔ ان سے پوچھئے کہ پنجوقتہ نماز تمھیں کیا سکھاتی ہے؟ تو منہ تکتے رہ جائیں گے اگر ان سے پوچھئے کہ عبادت کا مقصد کیا ہے؟ تو کوئی جواب بن نہ پڑیگا۔

جب معمولی انسانوں کی معمولی سی حرکت کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے انسان ایک قدم بغیر مقصد کے نہیں اٹھاتا تو کیا خدا جل جلالہٗ نے بغیر مقصد کے ہمارے لئے یہ احکام نافذ کر دیئے؟ نعوذ باللہ۔

تو کیا خدا۔ رسول۔ اور قرآن کے ساتھ یہ تمسخر نہیں ہے کہ بغیر سمجھے بوجھے صرف رسم و رواج کے طور پر ہم عبادت کرتے ہیں اور عبادت کی روح کو ہم نے کچل کر رکھ دیا ہے۔ کیا ایسی ہی عبادت کے متعلق خدائے پاک نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ فرشتو! ان کی نمازیں ان کے منہ پر کھینچ کر مار دو؟!

عید

محنت اور ریاضت کے بعد ہی انسان کا حق ہے کہ وہ آرام و خوشیوں کا لطف اٹھائے مگر ہم ہر سال عید مناتے ہیں خوشی کی قیمت ادا کئے بغیر۔ اور اسی لئے اگر غور سے دیکھا جائے ... تو ہمیں خوشی و راحت کو ہم سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ مذہب اور قانون نے انسانوں کو یہ سبق دیا ہے۔ اور انسانوں کی اجتماعی زندگی کو انفرادی زندگی سے زیادہ اہم بتایا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی خوبی انسانی ہمدردی ہے۔ ایسا انسان بھی خوشی نہیں منا سکتا جس کے خیال اور تصور میں بھی کوئی [illegible] ایک بیمار اور غلام بھی سچی خوشیوں سے کبھی لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

پھر جس ملک میں ہزاروں انسان بھوک کے مارے ہوں۔ ننھے ننھے بچے، جن کے کھانے پینے، پڑھنے لکھنے اور کھیلنے کودنے کے دن ہوں وہ خوانچے لئے پھرتے ہوں۔ وہ ملک عید کس دل سے منائے؟ جس ملک کے باشندوں کا بہت بڑا حصہ تعلیم جیسی نعمت سے محروم ہو۔ وہ خوشیاں کیسے منائے؟
جس ملک کے نوجوان مردہ دل ہوں۔ آزادی کی تڑپ کھو بیٹھے ہوں۔ وہ ملک کس منہ سے خوشیاں منائے۔ جس ملک کی عورتوں نے اپنے فرائض پس پشت ڈال دیئے ہوں۔ اُس ملک میں عید؟
چونکہ عورت ہی طاقتوں اور خوشیوں کا مرکز ہے [illegible] آج جہنمی بنی ہوئی ہے۔ پھر خوشی کیسی؟!

(نوٹ) ہم بہن عزیزہ رشاد بیگم سے تہ دل سے بہن نجمہ اور بہن کوثر سے معافی کے خواستگار ہیں کہ اول الذکر بہن کا افسانہ "تغیر" اور ان تینوں بہنوں کے دستکاری کے نمونے اس اشاعت میں باوجہ قلت جگہ شائع نہ ہو سکے۔ دسمبر کی اشاعت میں افسانہ اور دستکاری کے نمونے شائع ہوں گے۔ (ادارہ)

عراقی سٹیٹ ریلوے

عراقی سٹیٹ ریلوے ۔ نجف اشرف ۔ کربلائے معلٰی ۔ کاظمین اور بصرہ کے مقامات مقدسہ کے زائرین کے لئے تیز ترین آرام دہ ارزاں ترین ذریعہ سفر ہے ۔ ـــــــــ مشہد ۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کو جاتے ہوئے یا واپسی پر عراق کے مقامات مقدسہ کی زیارت کیجئے ۔ اس طرح آپ کو دو مختلف زیارتوں کے اخراجات میں کفایت ہو جائے گی ۔

خاص آسانیاں اور تخفیف شدہ کرائے

حجاج کو ۱۵۰ ایام کے لئے خاص کوپن ٹکٹ مل سکتے ہیں جنکی رو سے ۵۰ کلو سامان مفت لیجایا جاسکتا ہے ۔ تفصیل یہ ہے :-

دوسرا درجہ	تیسرا درجہ	
۴۲ روپے	۱۴ روپے	بک "A" سے ماقل (بصرہ) سے کربلائے معلٰی اور پھر بغداد کاظمین (اجواد ین سٹیشن) تک اور کاظمین سے سامرہ اور واپس براہ کاظمین ماقل (بصرہ) تک سفر ہوسکتا ہے ۔
۴۰ روپے	۱۲ روپے آٹھ آنے	بک "B" سے ماقل (بصرہ) سے کربلائے معلٰی اور پھر بغداد یا کاظمین (اجواد ین سٹیشن) اور واپس ماقل تک سفر ہوسکتا ہے ۔

تین برس سے کم عمر کے بچے مفت اور بارہ برس سے کم آدھے ٹکٹ پر

ماقل (بصرہ) پر ہمارا حج ایجنٹ حجاج کو ملتا ہے

تمام اہم مقامات مقدسہ کے درمیان روزانہ ٹرینیں نجف اشرف سے براہ راست مدینہ منورہ کو ایک نیا خشکی کا راستہ جو صحرا میں سے ہوکر گزرتا ہے بنالیا ہو جاتی ہیں ۔ یہ عراق گورنمنٹ کے زیر انتظام ہے ۔ راستہ نجف اشرف سے براہ حیسہ اور حنیل کے کرائے یہ ہیں ۔

دوسرا درجہ	تیسرا درجہ
۲۰۰ روپے	۱۳۴ روپے

مفصل معلومات ٹکٹ ۔ حج ۔ کوپن ۔ بکیں وغیرہ مختلف سب ایجنٹوں سے بمبئی اور کراچی سے مل سکتے ہیں ۔ جنکے پتے یہ ہیں ۔

۱ ۔ مولوی محمد باقر حاجی دیرجی جمال کا مسافر خانہ جبل روڈ عمر کھادی بمبئی ۔

۲ ۔ دی آنریری جائنٹ سیکرٹری ۔ فیض پنجتنی ۔ پالا گلی بمبئی ۔

۳ ۔ مسٹر ای ۔ اے ۔ لوٹیا مانڈوی کولیواڑا بمبئی نمبر ۳

۴ ۔ حبیب جی رحمت کھاردار کراچی ۔

۵ ۔ مسٹر عبد العلی شیخ عیسٰی جی معرفت میسرز یوسف علی علی بھائی کریم جی اینڈ کو نیپر روڈ کراچی

۶ ۔ دی آنریری سیکرٹری فیض پنجتنی معرفت حاجی مٹھا بھائی گوکل کو دی گارڈنز ۔ کراچی

خاص برائے تنویر

تشطیر بر غزل خدائے سخن میر تقی مرحوم

نتیجۂ فکر
حضرت مولانا محمود اسرائیلی

تشطیر اردو شاعری میں ایک بالکل نئی چیز ہے۔ اردو کے مایۂ ناز اور کہنہ مشق شاعر اعظم حضرت مولانا محمود اسرائیلی صاحب کو اسکا خیال پیدا ہوا اور آپ نے اس کے لئے خدائے سخن حضرت میر تقی میر کی اس غزل کا انتخاب کیا جس نے میر کے درد کو خاص طور پر چمکایا اور غالب کی قدر نہ کیا بات کر تیں آتی تہ بات کر دکھائی ہے۔ تشطیر میں غزل کے مصرعہ اولی پر ردیف اور قافیہ کے ساتھ دوسرا مصرعہ لگایا جاتا ہے اور مصرعہ ثانی پر مصرعہ اولی بغیر قافیہ و ردیف کے لگایا جاتا ہے اور اس طرح ہر شعر کے دونوں مصرعوں کے درمیان دو مصرعوں کی گنجائش نکال کر شعر کو قطعہ بنا دیا جاتا ہے۔ (مدیرہ)

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
ہم جو کہتے تھے وہ ہوا جب تو نے نہ مانا تھا ہمدم
چارہ سازوں اور طبیبوں کو ہم نے بدنام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یادِ زلفِ سیہ میں تڑپے دیکھ کے رخ دم توڑ دیا
دنیا میں ناکام رہے ہم زندگی کو بدنام کیا
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
اپنی اک تدبیر بھی تو تقدیر کے آگے چل نہ سکی
مرنا چاہا مر نہ سکے اور جیتے جی کیا کام کیا؟
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یاس کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
عمر کو کاٹا بندِ الم میں پھر بھی یہ ظالم کٹ نہ سکی
اپنی سیہ بختی کا شہرہ جگ کو ہنسا کر عام کیا
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
دنیا چھوڑی، دھونی رمائی، ڈال کے کچھ زنار کے تار
سنتے ہیں مندر میں جا کر ایک صنم کو رام کیا
قشقہ لگایا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

تشطیر بر غزل غالب

از نتیجۂ فکر حضرت مولانا محمود المرابلی

با حسن لطیف سے

کوئی امید بر نہیں آتی — قسمت اب راہ پر نہیں آتی
ان کی صورت کو دیکھئے کیونکر — کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے — اب نہ آئے اگر نہیں آتی
دل میں پھر بیکلی یہ کیسی ہے؟ — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اس پہ بھی اب مگر نہیں آتی
حالِ دل پر ہی اک نہیں موقوف — اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — ان کی خوبی نظر نہیں آتی
میں نے چاہا بھی پارسا ہونا — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — دل سے لب تک گر نہیں آتی
ان کے آگے خموش بیٹھا ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا — تجھ کو تشخیص گر نہیں آتی
ایسا ناداں تو نہیں ہے تو — تو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — اپنی صورت نظر نہیں آتی
یوں تو دنیا کی خبریں آتی ہیں — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
اور یہ اُمید بر نہیں آتی
سانس رُکتی ہے سانس چلتی ہے
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس مُنہ سے جاؤ گے غالبؔ
جب طبیعت ادھر نہیں آتی
دل میں بُت اور مُنہ میں بوئے شراب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

منثورات

خاص تنویر کیلئے

از:- ملک سلمان الارشد فاروقی

دیکھو — ٹیگور کا شاہکار

صبح جبکہ پہلی کرن ناشگفتہ کلیوں کے لئے کھلنے کا اُمید سے بھرا ہوا پیغام لے کر آتی ہے اور یہی کرن ہم کو خواب غفلت سے بیدار کرتی ہے وہ صرف ایک لفظ کہتی ہے دیکھو! لیکن یہ پیغام کیا ہے وہ کیا دیکھنے کو کہتی ہے — کیا؟ غنچوں کا کھلنا یہ کون کون سے نظارے پیش کرتی ہے — کیا ایسا عمدہ منظر جو ہم بیان نہیں کرسکتے یا ہم نے اس کو پورے طور سے نہیں دیکھا ہم نے ان اوقات پر نظر ڈالی نہ کہ سچائی کو جو لا انتہائی مسرت کی وجہ ہے۔ خیر ہر صبح سورج کی کرن دنیا اور اہل عالم کی طرف اپنی لمبی انگلی سے اشارا کرتی ہے وہ سبزے کی ایک چھوٹی سی پتی پر پڑنے لگتی ہے اور پھر اس طرح سے مُسکراتی ہے کہ آسمان میں چکا چوند معدہ ہو جاتی ہے وہ ہم سے کہتی ہے کہ خدا کے لئے آنکھیں کھولو — بیدار رہو! دیکھو! بس دیکھو! یہی اس کا اشارہ ہے (ترجمہ)

چینی ادب

فوقیت

ہن خاہ کا شاہکار

تم غلام ہو: — دنیا کے بدترین انسان — بزدل! دنیا پہ بار — کمبخت! اپنے سے ناواقف — تم کو دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں —

تم آزاد ہو — ہم غلام یہ درست ہے — مگر تم سنگدل ہو — بے حس! تم سے ہم اچھے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہم غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مگر تم آزاد ہو — اس آزادی کی قدر و قیمت جانتے ہو — لیکن پھر بھی دوسرے انسانوں کو غلامی کا طوق پہنانا چاہتے ہو — آزادی جو انسان کا پیدائشی حق ہے اسکو چھینا چاہتے ہو — اسی لئے ہم غلام کو تم پر فوقیت حاصل ہے۔ (ترجمہ)

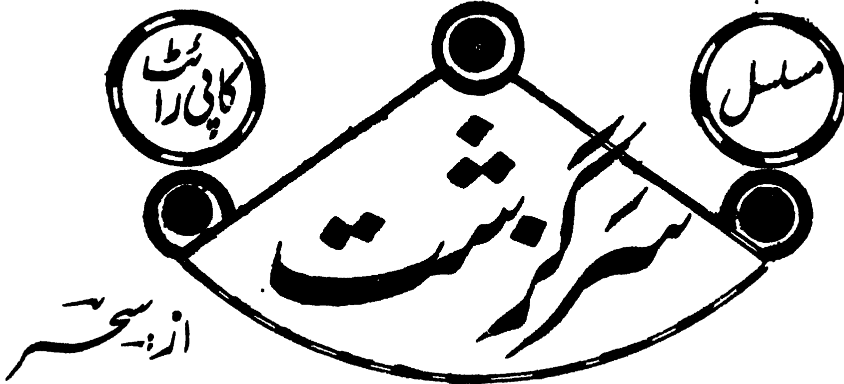
بدقسمت

سر والٹر اسکاٹ کا شاہکار

کیا کوئی ایسا شخص ہے جس کا دل اسی قدر مردہ ہے اور وہ خود اسقدر بے حس ہے کہ اسکے ذہن میں یہ خیال نہ ہو کہ یہ ہمارا وطن ہے جسکو کہ ہم مادر وطن کہتے ہیں۔

کیا؟ کوئی شخص ایسا ہے جسکو اسوقت بھی خوشی نہ ہوتی ہو جبکہ وہ غیر ممالک سے اپنے وطن کو آتا ہے! اگر ایسا ہے تو اسکو غور سے دیکھو اسکے حالات کا جائزہ لو! اسکی فطرت کا مطالعہ کرو تو تم کو معلوم ہوگا کہ اسکے پاس بہت سے خطاب ہیں اور ایک کثیر تعداد روپیہ کی سنہری سکوں کی موجود ہے اور وہ انہیں پر مغرور ہے — لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ان خطابات اور دولت کے ہوتے ہوئے بھی وہ انتہائی بدقسمت ہے وہ خود غرض ہے وہ زندگی ہی میں اپنا تمام اعزاز کھو دیگا اسکا کوئی وقار نہیں رہیگا اور بالآخر اسی غم میں مر جائیگا اور پھر اسی ملک کی حقیر مٹی میں مل جائیگا جسکا کہ اسکو خیال بھی نہ تھا لیکن اس کے مرنے پر کسی کو رنج نہ ہوگا نہ اسکی موت پر ماتم ہوگا اور نہ اسکی تعریف ہوگی کیونکہ وہ تو زندگی ہی میں مر چکا تھا! مرنے کے بعد تو اس کا نام بھی سننے میں نہ آئے گا — یہ زندگی ہوگی اس بدقسمت انسان کی جو ہمیشہ بدبخت اور بدقسمت کے لقب سے پکارا جائے کا معلوم ہے اس بدقسمت کی زندگی پر؟ — ! (ترجمہ)





از: سحر

ہم نے کہا ہم سب بچے چھپ کر جا رہے ہیں۔ بڑی بی بی، دُلہن بی اور ننھے کو معلوم نہیں ہے ورنہ وہ ہمیں نہ جانے دیتے۔

"آخر کہاں جا رہے ہو" ——— دربان نے پوچھا۔

"قسطنطنیہ" ہم نے جواب دیا۔ اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں "بٹیا! کیا دیوانی ہو گئی ہو"؟ ——— اُس نے مجھ سے اور پھوپھی جان سے کہا ———

اُس کے تیور بدلے ہوئے دیکھ کر ہم نے دس دس روپیہ کے دو نوٹ اُس کے ہاتھ میں رکھ دیئے کہ ہمیں چُپ چاپ نکل جانے دے اگر یکّے نہیں مل سکتے تو نہ سہی۔ ہم بغیر اسباب کے صرف تن کے کپڑوں سے ہی چلے جائیں گے ———

مگر اس کے جواب میں دربان نے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ اور سخت لہجے میں کہنے لگا کہ تم سب واپس گھر میں لوٹ جاؤ۔ اور یہ سوانگ کے کپڑے اُتار دو۔ ابھی کسی کو خبر نہیں ہوئی ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ چلو بکس میں اندر رکھے آتا ہوں۔ یہ آبرو پر بٹہ لگانے والی حرکت میں ہرگز نہ کرنے دوں گا۔ میں نے تمہارے باپ کو گود میں پالا ہے ——— آخر تم لوگوں کو ہو کیا گیا؟ یہ کیا سوجھی؟ شریفوں کی بہو بیٹیاں کہیں ایسا بھی کرتی ہیں؟

ہم نے لاکھ سر پٹکا۔ اُس کی منتیں سماجتیں کیں اور سمجھایا کہ "بھائی شریف بیٹیاں وہ کچھ بھی نہیں کرتیں جو ہم کو اس گھر میں کرنا پڑتا ہے۔ خدا کے واسطے ہمیں جانے دے۔ ہم پر ترس کھاؤ" مگر وہ نہ مانا۔ اب ہم نے کہا یہ یوں تو ہرگز نہ مانے گا۔ چلو زبردستی نکل چلیں۔ میں نے اُس کے ہاتھ پکڑے۔ چنگوا نے اُس کی کمر میں سے کُنجیاں کھولیں۔ پھوپھی نے اُسے دھکا دے کر ایک طرف کو ڈھکیل دیا اس پر بھی وہ مزاحمت کرنے لگا تو زرّیں اور قمر نے اُسے ایک ایک گھونسہ رسید کیا۔ شیریں اور مہر نے اُسے خوب نوچا۔ اور علم سویا ہوا چنگوا کی گود میں تھا۔ ہم قفل کھولنے لگے اس پر مجبور ہو کر دربان نے چلّانا شروع کیا اور ننھے، دادی ——— اور سوتیلی ماں کو پکارا اب ہم بے بس ہو رہے تھے۔ بے وقوفی سے اور کھسیانے ہو کر ہم نے دربان کو کہا "اچھا تو نے ہمیں نہیں جانے دیا ہم آدھی رات کو کوٹھے پر چڑھ کر پچھلی دیوار سے رسّی کے سہارے اُتر کر چلے جائیں گے ——— اور آزاد ہونے کے بعد تجھے پھانسی دیئے بغیر نہ چھوڑیں گے"

اتنے میں سوتیلی ماں ——— دادی ——— ننھے اور سب نوکر چاکر آموجود ہوئے اور ہم سَر سے پکڑ لئے گئے۔ دربان نے سب حال کہہ دیا اور یہ بھی کہا کہ خبردار رہنا اور خیال رکھنا۔ یہ رات کو پچھلی دیوار سے اُتر نہ جائیں ———

ہم سب کشاں کشاں صحن میں لائے گئے۔ رات بھر ہم سب ایک ہی چارپائی پر بیٹھے رہے اور ننھے، دادی اور

سوتیلی ماں نے ہماری رکھوالی کی۔ ایک سیکنڈ کے لئے بھی ہمیں وہاں سے ہلنے نہ دیا گیا۔ ہمیں آپس میں بات کرنے کی بھی اجازت نہ تھی ان تینوں نے ہمیں خوب طعنے دیئے کہ "کس کے لئے بھاگی جا رہی تھیں؟ غرضکہ ایسی ایسی مغلظات بکی گئیں کہ پناہ بخدا —— جو جو باتیں ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں اور جن سے اب تک ہم ناواقف تھے۔ وہ اُن طعنوں میں سنی گئیں ——

ہم نے اتنا تو کہا کہ "بھوپے سے ایک کی شادی کر کے ابھی تمہارا دل ٹھنڈا نہیں ہوا ہے جو دوسری کی شادی اُس کے بھائی ننھے سے کر رہی تھیں۔ کل نکاح کی تاریخ تھی اس لئے ہم بھاگے جا رہے تھے"

اب تو رات زیادہ گئی تھی ورنہ یہ لوگ مارے ضد کے آج ہی قاضی کو بلا کر زریں کا نکاح ننھے سے کر دیتے ہم ان کے طعنے اور گالیاں سُن رہے تھے اور خون کے گھونٹ پی پی کر رہ جاتے تھے۔ غرض ساری رات قیامت کی طرح گزری

صُبح کو ہی ان لوگوں نے والد صاحب کو تار دیا کہ جلدی آؤ۔ ہم نے اس درمیان میں ایک چٹھی قصبہ کی پولیس کو اس مضمون کی لکھ کر بھیج دی کہ "جلد آکر بچاؤ ورنہ خون ہو جائے گا" اور ایک ہمارا چچا زاد بھائی جمیل نامی لڑکا تھا جو ہم سے بہت محبت کرتا تھا وہ اتفاقاً آ گیا اُس کے ہاتھ چٹھی پولیس سٹیشن کو بھیجدی گئی۔

اِدھر والد صاحب کو تار دے کر یہ لوگ بہت بُرے بُرے الفاظ میں ہمیں کہہ رہے تھے کہ اب اُن کو مدد کے لئے بلاؤ نا جن کے لئے بھاگی جا رہی تھیں"!

ہم تو کسی کے لئے نہیں بھاگ رہے تھے۔ ہم تو شیطانوں سے پناہ مانگ کر بھاگ رہے تھے اور قسطنطنیہ جا رہے تھے انور پاشا کے پاس —— یہ ہم لوگ دل میں سوچتے جاتے تھے اور مُنہ سے انہیں جلانے کو کہتے تھے کہ ہاں دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ ہمیں کوئی کیا بچائے گا اور کیا مدد کرے گا اللہ بچانے والا اور مدد کرنے والا ہے۔ اس پر ہمیں جواب ملتا کہ اللہ تم ایسے لوگوں کی مدد نہیں کرتا ہم چُپ ہو جاتے۔

یہ لوگ ہمیں ستا ہی رہے تھے کہ پولیس آ گئی۔ پولیس کا نام سُنتے ہی ان کی ڈانٹ ڈپٹ اور طعن و تشنیع گالیاں اور کوسنے فوراً منتوں سماجتوں میں تبدیل ہو گئے۔ ننھے تو کوٹھری میں جا کر چھُپ گیا اور دادی سے صاف انکار کر دیا کہ میں ہرگز زریں سے شادی نہ کروں گا۔ دادی اور سوتیلی ماں نے آکر ہمارے ٹھوڑی تلے ہاتھ ڈال ڈال کر پوچھنے لگیں کہ "بیٹا پولیس کیوں آئی ہے؟ اب ہمیں تمھیں بچا سکتی ہو۔ اب یہ پولیس کیا کرے گی۔ سوتیلی ماں نے زریں کو الگ لے کر پوچھا ...."بٹیا پولیس عورتوں کو تو پکڑ کر قید نہیں کرتی؟"

مگر اب ہماری باری تھی ہم نے کہا کہ ہم نے ہی پولیس کو بلایا تھا تاکہ تمھیں سزا دیں۔ اب ہم گھر میں ہرگز نہ رہیں گے اور رہیں گے بھی تو ہماری حفاظت کو پولیس ڈیوڑھی پر بیٹھی رہیگی تم نے طعنے دے دے کر ہمارا دل چھلنی کر دیا ہے۔ زریں کی شادی والد سے چھُپ کر ننھے کے ساتھ کر رہی تھیں نا —— اسی پر ہم بھاگے جا رہے تھے۔ اور ہمیں تم نے پکڑ لیا۔ اب والد سے کہو گی کہ لڑکیاں بدچلن تھیں گھر سے بھاگی جاتی تھیں تو یقیناً والد ہمیں جان سے مار ڈالیں گے۔ جان کسے پیاری نہیں ہے۔ ہم نے اپنی جان کی حفاظت کے لئے گورنمنٹ سے مدد طلب کی ہے۔ اب تو دادی اور سوتیلی ماں کے ہوش اُڑ گئے۔

"اوئی بچیو! اللہ تم سے سمجھے" کہہ کر وہ رونے لگیں۔ اِدھر ڈیوڑھی میں سے انسپکٹر پولیس بار بار کہلا بھیجتا کہ لڑکیوں اور ننھے اور گھر والوں کو بلاؤ —— وہ آکر اپنے بیانات لکھوائیں ——

مگر قصبہ کی بات ہے ۔۔ اور پھر معزز پٹھانوں کے دروازے پر کبھی پولیس آئی
بھی نہیں، شور مچ گیا۔ اور بجلی کی طرح سارے قصبے میں یہ بات پھیل
گئی۔ ہمارے والد کے چچا یعنی ہمارے دادا دوڑے آئے اُن کا ہم پر
بڑا بہت اثر تھا۔ وہ ہمیں بہت پیار کرتے تھے اور ہم اُنھیں بہت
چاہتے تھے۔ اُنھوں نے ہمیں پولیس کو نہ ملنے دیا اور نہ معلوم کیا
کچھ بندوبست کر کے معاملہ رفت وگزشت کرا دیا۔ ہمارے مشنری دوستوں
یعنی دیسی لیڈی ڈاکٹر صاحبہ اور اُن کے ساتھیوں نے اُدھر پولیس پر زور
ڈالا کہ واقعی اس صورت میں لڑکیوں کی جان کا خطرہ ہے۔ تب دادا میاں
کی منت پر یہ طے پایا کہ ہم دادا میاں کے گھر چلے جائیں اُنھوں نے ہماری حفاظت
کا ذمہ لیا۔ مگر اس شرط پر کہ صبح شام ایک آدمی پولیس کا اور ایک مشن کی عورت
آکر دُور سے ہی ہماری خیریت کی خبر تھانے میں لے جایا کرے۔ اور مشن
کی عورت دُور سے ہمیں دیکھ جایا کرے گی۔ مگر ہمارے اعزہ نے اس
بات سے صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ مشن والوں کو ہم سے بات بھی کرنے دیں گے۔

والد صاحب آگئے ۔۔ مگر دادا میاں نے اُنھیں کسی قسم کی سختی
کرنے سے روک رکھا تھا۔ چونکہ ایک ریوالور ہمارے پاس تھا اور پوشیدہ
طور پر تھا سوائے دادا میاں اور والد صاحب کے کسی دوسرے کو اس کی
خبر نہ تھی۔ وہ ڈرتے تھے کہ ہم سر پھری لڑکیاں ہیں۔ مبادا بدنامی سے
بچنے کے لئے اپنے آپ کو گولی ماریں یا غصہ میں آکر اُن میں سے کسی کو نشانہ
بنا ڈالیں۔ اُدھر پولیس اور مشنریوں کا بھی خوف تھا۔

دادا میاں کی لڑکیاں اور بیوی برابر اس ٹوہ میں پائی رہتیں کہ
ریوالور کا پتہ لگائیں یہ ریوالور نہایت خوبصورت تھا اور بہت چھوٹا سا
تھا۔ یہ ہمیشہ میرے لباس میں سینے کے پاس رہا کرتا۔ اور کارتوسوں کی پوٹلی
جو شاید ۲۰ کے قریب تھے۔ زری کے کپڑوں میں تھے۔ ہم بہت حفاظت
سے ان چیزوں کو اپنے پاس رکھتے ۔۔۔ اس ہنگامے کو ہوئے تقریباً
تین ہفتے گزر چکے تھے۔ حالات اور طبیعتیں اعتدال پر آرہی تھیں کہ
ایک روز دادا میاں نے ہمارے ساتھ بڑی میٹھی میٹھی باتیں کر کے اور
پھسلا پچکار کر ہمیں اس بات پر آمادہ کیا کہ ہم اپنا خوبصورت ریوالور اُنھیں
بھی صرف ایک نظر دیکھنے کو دیں۔ اُنھوں نے اپنے سارے ہتھیار بندوقیں
پستول تلواریں وغیرہ ہمیں دکھائیں ۔۔۔ ہم بڑے بے وقوف
تھے مگر اس میں ہمارا قصور نہ بھی تھا اُن کی باتوں میں آگئے ہم اپنے
ہاتھ میں ہی پکڑے ہوئے دادا میاں کو اپنا ریوالور دکھا رہے تھے
کہ اُنھوں نے کہا ۔۔۔ بٹیا میں تمھارا کتنا خیر خواہ ہوں
دُنیا سے اگر اعتماد ہی اُٹھ جائے تو باقی کیا رہے گا۔ تمھیں مجھ پر
بھروسہ نہیں یہ میری کتنی بے عزتی ہے اور اگر میں بھی تمھاری
نظروں میں ناقابلِ اعتماد ہوں تو تم بھی تو آخر میرے ہی بچے
ہو ۔۔۔ غرضکہ اُنھوں نے اپنی تقریر سے ایسا اثر
ڈالا کہ ہم نے ریوالور اور کارتوس اُن کے ہاتھ میں دیکھنے کو دیدیئے
اُنھوں نے تھوڑی دیر تو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اور پھر کہا یہ
بڑی خطرناک چیز ہے تم اسے ساتھ لے کر سوتی ہو اور ہر وقت
اپنے جسم کے ساتھ رکھتی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں لاؤ میں اسے بطور
امانت کے رکھ لوں۔ جب تم چاہو گی لے لینا کہتے ہوئے
اُنھوں نے جیب میں رکھ لیا۔ اور چل دیئے۔ ہم مُنہ ہی دیکھتے
رہ گئے اور اُن کے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑے بھی کہ "دادا میاں
ہمیں تو اسے اپنے پاس ہی ہر وقت رکھنے کی عادت ہے آپ
ہمیں دیدیجئے"۔ مگر وہ کہاں سُنتے تھے اور فوراً باہر مردانے
میں چلے گئے۔۔

اب جب اُنھوں نے ریوالور بھی چالاکی سے ہم سے چھین لیا اور ہمیں پورا
بے بس اور نہتا کر دیا تو ایک دن دوپہر کو والد صاحب نے
ہمیں بلا کر باز پُرس کی کہ ایسی حرکتیں کیوں کیں ۔۔۔

کہاں جا رہی تھیں ـــــ کیوں جا رہی تھیں ؟ اور پولیس کو کیوں بلایا تھا؟ ہم نے کہا ہم تحریری بیان دیں گے ۔ چنانچہ ہم نے لکھا "کہ ہم قیدیوں کی سی زندگی بسر نہیں کر سکتے ۔ بھورے مجھے بالکل پسند نہیں ہے ۔ مجھے اُس سے دلی نفرت ہے زریں شادی کرنا نہیں چاہتی ـــــ ہم آزادی کو پسند کرتے ہیں ۔ ہماری زندگی کا مقصد خدمت انسانیت اور خدمت وطن ہے ۔ اگر وطن میں ہمارے لئے کوئی گنجائش نہیں تو ہم لڑ کر چلے جانا چاہتے ہیں ۔ ہم اپنی طاقتوں کا گلا گھونٹ کر نہیں رہ سکتے ۔ نہ ہی یہ ادنیٰ کام ہم سے ہو سکتے ہیں کہ گھر سنبھالیں ، بچے پیدا کریں ۔ بھورے کا شکار بنیں ۔ آپ سے ڈریں اور کانپیں ، ہم نے آخر کون سا گناہ کیا ہے کہ انسان ہو کر دوسرے انسانوں سے ڈریں اور اُن کی حکومت سہیں جو ہم سے بھی بدتر ہیں "

پھر ہم نے دادی ، سوتیلی ماں اور ننھے کی سازش کا بھی ذکر کیا ۔

والد صاحب اور دادا میاں دونوں ہمارا پرچہ پڑھ کر حیران ہو گئے اور انھیں غصہ بھی بہت آیا ۔ اور نہ معلوم کیوں انھوں نے یہ ہی سمجھا کہ ہم ہی درحقیقت خطاوار ہیں ۔ اور بالکل ناجائز مطالبات کر رہے ہیں ۔ اور بھورے سے دشمنی کا سبب تو اُن کے خیال میں صرف ایک ہی آتا تھا کہ اس کا خیال کسی اور طرف ہے ۔ اس لئے بھورے کی بہت حمایت کی جاتی تھی اور مجھے موردِ الزام قرار دیا جاتا تھا ۔

اب ان سب نے مل کر فیصلہ کر لیا کہ ہمیں سزا دی جائے اور وہ سزا ہو قیدِ تنہائی کی ، اور پانچوں بہن بھائیوں کو نہ ملنے دیا جائے ۔ ہمارے دل میں یہ بات پہلے ہی کھٹک رہی تھی ۔ چنانچہ ہم پانچوں بہن بھائیوں کو یہ الہام سا ہو گیا کہ کل سے ہم بچھڑ جائیں گے ۔ چاندنی رات تھی ہم پانچوں بیٹھے اپنی تاریک قسمت پر غور کر رہے تھے ۔ ہم نے کوئلہ منگوا کر وہیں زمین پر لکھنا شروع کیا ۔ اور الف بے کی جگہ یائے تک پوری نئی الف ب طیار کر لی ۔ پھول پتیوں کی شکل میں ۔ اور اس رسم الخط کا نام رکھا "حروفِ بےکسی" کہ جب الگ کر دیئے جائیں تو اسی تحریر میں ایک دوسرے کو خط لکھا کریں ۔

صبح ہوتے ہی سخت سزا ملی ۔ بچہ چھین کر انا کے حوالے کر دیا گیا اور ہم چاروں کو الگ الگ کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا ۔ تہر چونکہ چھوٹا تھا اُسے آزاد رکھا گیا ۔

اور ہم سے کہا گیا کہ اب یہ قید ہی تمہارے ہوش ٹھکانے پر لائے گی اور اس قید سے اُسی وقت چھٹکارا پا سکو گی کہ قرآن اُٹھا کر قسم کھاؤ کہ شرفاء کی لڑکیوں کی طرح سوسائٹی کے تمام قوانین کی پابندی کریں گے ۔ اپنے آپ کو شوہر کی لونڈی اور جوتی کے برابر سمجھیں گی آزادی جیسی بُری چیز کا نام بھی زبان پر نہ لائیں گے "ـــــ وغیرہ

* * * * * * * * *

اس واقعہ کی وجہ سے زریں کی منگنی ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی ۔ اگر زریں کا منگیتر اس موقع پر جرأت سے کام نہ لیتا تو بس یہ ایک اور بدنامی سر پڑتی ۔ اُس کے منگیتر نے اپنے باپ سے صاف کہہ دیا کہ اگر یہ منگنی توڑتے ہو تو پھر میری شادی کا نام نہ لینا ۔ میں پھر تمام عمر شادی نہ کروں گا ـــــ

غرضیکہ سب نے مل کر بہت کوششیں کیں اور اس صداقت کی چنگاری کو جو ہمارے دل میں روشن تھی اور اُس کی چمک ان پتھر جیسے چہروں پر شاق گزرتی تھی اُس چنگاری پر چالاکی ، عیاری اور ظلم کی راکھ ڈالتے ہی چلے گئے ۔ پانچ مہینے ہم اپنی ضد پر اڑے رہے اور سب سختیاں سہتے رہے ۔ مگر کوئی معاہدہ اپنے ضمیر کے خلاف نہیں کیا ۔

چونکہ ماہ عالم کے بھائی پیدا ہونے والا تھا ـــــ میں شدید بیمار ہو گئی اور قریب المرگ تھی ۔ لاچار ہو کر ان لوگوں نے مجھے تو قید سے نکال لیا اور چارپائی پر ڈال دیا ۔ مگر میرے بہن بھائی مقید ہی رکھے گئے ۔ میں نے پھر فاقہ کشی شروع کر دی کہ انھیں بھی آزاد کر دو

ورنہ جان دیدوں گی ـــــ خیر عارضی طور پر انھیں بھی بیسری تیمارداری کے لئے آزاد کردیا گیا۔

اب ہمیں ملنے کا موقع ملا۔ تب ہم نے صلاح کر کے فیصلہ کر لیا کہ قید تنہائی نے تو ہمیں مار ہی ڈالا۔ اب لاؤ جھوٹ بول کر ہی آزادی حاصل کریں۔ مل بیٹھنے کا موقع ملے گا تو کچھ سوچیں گے۔

ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ

تین ماہ تک میں بستر علالت پر پڑی رہی۔ ماہ کے چھوٹے بھائی کا نام اختر رکھا گیا۔ جب میں اچھی ہوگئی تو حکم ہوا کہ چلو سب کے سب قید کی کوٹھریوں میں، ورنہ شرائط کے مطابق قسم کھا کر عمل کرنے کا عہد کرو۔ اور شرائط نامے پر دستخط کرو۔ شرائط نامہ یہ تھا:۔

"میں ہر تدین بھورے کو دل سے محبت کروں گی۔ اسے اپنا شوہر تسلیم کروں گی۔ اس کے ہر حکم کی بخوشی تعمیل کروں گی۔ وہ مجھے جوتیاں بھی مارے تو پھولوں کی بارش سمجھوں گی۔ ذلتیں سہوں گی۔ چکیاں پیسوں گی۔ غلامی کروں گی۔

میرا ڈولا اس کے گھر گیا تھا اب مر کر جنازہ ہی نکلے گا ـــ جو شرفاء کی آن ہے اس کے حکم کے بغیر میں بہن بھائیوں سے بھی ملونگی نہ خط لکھوں گی اس کی اجازت بنا عبادت بھی نہ کروں گی۔

میں اس بات کو مانتی ہوں کہ شوہر مجازی خدا ہے خدا کے بعد اگر سجدہ جائز ہوتا تو میں اسی کو سجدہ کرتی میں اس کی لونڈی اور جوتی کے برابر ہوں۔ دنیا میں بھورے ہی میرا سب کچھ ہے اسے خوش کرنے کو اپنی عزیز ترین کتابیں بھی جلادوں گی اور کبھی کتاب یا قلم ہاتھ میں نہ لوں گی ـــ اگر کوئی میرے ہاتھ میں کتاب یا قلم دیکھ پائے تو میری انگلیاں کاٹ ڈالی جائیں ـــ میں اُف بھی نہ کروں گی۔ آزادی عورتوں کے لئے شرمناک چیز ہے اس کا ناپاک نام کبھی زبان پر بھی نہ لاؤں گی" اسی قسم کی کچھ تبدیلیوں کے ساتھ دوسرے بہن بھائیوں کے لئے بھی شرائط تھے ہم سب نے مجبوراً دستخط کئے۔ اب قرآن اٹھا کر قسم کھانے کی باری آئی دل ہچکچاتا تھا کہ "ہائے سب جائز چیزوں سے توبہ اور حرام چیزوں کو اختیار کرنے کا عہد اس پاک کتاب کو اٹھا کر کیوں کر کریں" ـــ

یہ سوال اللہ میاں اور قرآن سے ہمارا دل کر رہا تھا اور زبان سوسائٹی کے احکام کو تانبے کے ٹھیکرے کی طرح گھڑ گھڑا کر عہد کر رہی تھی

زمین و آسمان گھومتے نظر آرہے تھے۔ آنکھوں میں اندھیرا آرہا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آنکھیں رو رہی تھیں۔ روتے ہوئے ہچکیوں کے ساتھ ہم نے یہ عہد کیا ـــــ اس وقت ہماری حالت قابل دید تھی۔ ادھر یہ عہد اور قول و قسم ختم ہوئے اور ہم پانچوں بے حال ہوکر چارپائیوں پر جا گرے۔

اُدھر والد صاحب، دادا میاں۔ بھورے، ننھے دادی جان، سوتیلی ماں اور سوسائٹی کے معزز افراد نے فاتحانہ انداز میں باآواز بلند کہا ـــــ "الحمد للہ آج اِن کی آزادی کا جنازہ نکل گیا"۔ اور ہمارے کانوں کے راستے دل میں ایک بھالا سا چلنے لگا۔ آزادی کا جنازہ؟ توبہ! سوسائٹی کی نام نہاد شرافت، اور تمہارے فرسودہ ایمان اور بوسیدہ مذہب کا جنازہ ان شاء اللہ نکل کر رہے گا۔ آزادی جیسی نعمت کا جنازہ نکالنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔ یہ ہمارے دل نے کہا۔

(باقی)





کولمبیا ریکارڈس

کولمبیا کمپنی کا ماہ رواں کا تازہ ریکارڈ

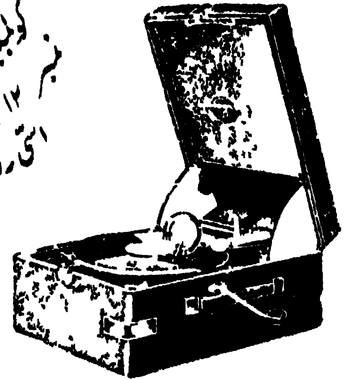
مشہور و معروف ماہر موسیقی وریڈیو اسٹار مس رادھا بائی

G.E.	یا شاہ مدینہ والے	دس انچہ دو طرفہ قیمت صرف دو روپیہ
3150	سید مکی مدنی مولا	

کم خرچ بالا نشین

ہر ایک خریدار کو خریدنے میں آسانی ہو اس لئے کولمبیا گرامو فون مشینوں کی قیمت نہایت تخفیف کر دیگئی ہے

گراموفون	قیمت
کولمبیا پورٹیبل ماڈل نمبر ۲۰۰	۵۵ روپے
〃 〃 نمبر ۵۶	۴۰ روپے
〃 〃 نمبر ۲۲۰	[illegible] روپے
ٹیبل گرینڈ نمبر ۵۵۳	۹۵ روپے
〃 〃 نمبر ۱۱۵	۱۲۰ روپے



کولمبیا پورٹیبل ماڈل نمبر ۲۱۲ قیمت صرف اسی روپیہ

مغربی ہند کے واحد تقسیم کنندگان ایس روز اینڈ کمپنی لمیٹڈ ۱۰ سپارٹ رو فورٹ بمبئی





نیو تھیٹرز لمیٹڈ کلکتہ

کا

تازہ شاہکار

اسٹریٹ سنگر

جس میں

سیگل و کنن بالا نے اداکاری اور موسیقی کے کمالات دکھائے ہیں

جاری کردہ :- **کلکتہ فلم ایکسچینج بمبئی**

وہ آئینگے

از جناب احسن صفوی داناپوری

سنتا ہوں آج حشر اٹھانے وہ آئینگے
اپنے قتیلِ غم کو جلانے وہ آئینگے

پھر عام ہو رہی ہیں جراحت فروشیاں
دنیائے درد و شوق بسانے وہ آئینگے

آنے لگے گا جب دلِ بیتاب کو قرار
پھر کج نگاہیوں سے لٹانے وہ آئینگے

جاتے ہوئے اشاروں سے پوچھینگے میرا حال
آتے ہوئے کسی کے بہانے وہ آئینگے

بیہوشیوں کے کیف میں ان کو نہ بھول جاؤں
پھر میرا عہد یاد دلانے وہ آئینگے

غفلت میں بارِ غم سے سبکدوش ہو نہ جاؤں
خوابِ گراں سے مجکو جگانے وہ آئینگے

پھر بیخودی میں شوق کا دامن چھوٹ جائے
پھر مجکو میرے حال پہ لانے وہ آئینگے

دم رک نہ جائے تیزیٔ انفاس سے مرا
روداد حسن مجکو سنانے وہ آئینگے

اب رچ رہا ہے دستِ کرم میں جگر کا خوں
رنگِ حنا سے آگ لگانے وہ آئینگے

میں تو سمجھ چلا تھا جدائی کو عینِ وصل
دیوانہ مجکو پھر سے بنانے وہ آئینگے

ہر ذرہ مجکو مہر بقدر فروغ تھا
پردے مری نظر کے اٹھانے وہ آئینگے

احسن میں خود کو کھو کے بھی ان کو نہ پا سکا
اور خود کو پا کے اب مجھے پانے وہ آئینگے





از حضرت مجنوں گورکھپوری

حضرت مجنوں گورکھپوری کے جو احسانات اُردو ادب پر ہیں۔ اُسے کوئی فراموش نہیں کرسکتا لیکن غلام ہندوستان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ باکمال ہستیوں کی صحیح معنوں میں قدردانی کے جذبے سے ناآشنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری قوم بلند پایہ اہلِ کمال ہستیوں سے تہیدست ہوتی جارہی ہے۔ مجنوں گورکھپوری بھی گزشتہ کئی برسوں سے ادبی دُنیا سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ رہے تھے۔ اور یہ ہمارے لئے ایک ناقابلِ برداشت تکلیف تھی۔

تنویر اور قارئینِ تنویر اپنی خوش بختی پر جس قدر ناز کریں بجا ہے کہ ان کی خاطر ہندوستان کا مایۂ ناز ادیب مفکر پھر میدانِ صحافت میں واپس آگیا۔ اور افسانہ نگاری کا آفتاب پھر فضائے ادب کو اپنی شعاعوں سے مزدۂ حیات دینے لگا۔

چنانچہ تنویر کی کوئی اشاعت بھی مجنوں گورکھپوری کی قلمی سحر طرازیوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اُن کی عنایات و التفات کا شکریہ ادا کرنا میرے لئے مشکل ہے تاہم اپنی اور قارئینِ تنویر کی طرف سے اُن کے احسانات اور تنویر سے ہمدردی کی دل سے شکرگزار ہوں۔ اور اُمید کرتی ہوں کہ وہ اس کا خاص طور سے اہتمام رکھیں گے کہ تنویر کی کوئی اشاعت اُن کی حیات افزا تحریروں سے خالی نہ ہو ورنہ تنویر کی رونقیں ماند پڑ جائیں گی۔

"نقشِ ناہید" آپ کا تازہ ترین شاہکار ہے جو خاص تنویر کے لئے آپ نے لکھا ہے۔

(مدیرہ)

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ میں خود کو اور اپنی زندگی کو آخر کیا سمجھتا ہوں جو آج اس کو دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں تو پوچھنے والا حق بجانب ہوگا۔ مجھے خود حیرت ہے کہ یہ بیٹھے بیٹھے آخری وقت میں کیا سوجھی اور میرا مقصد کیا ہے میں سوا اس کے کچھ نہیں جانتا کہ یکایک میرے اندر تحریک ہوئی ہے کہ میں اپنی اندرونی زندگی اپنے دل و دماغ اور روح کے سانحات کو بیان کروں۔ جس سے شاید آخری وقت میں کچھ تسکین ہو۔ اس جذبے کا تجزیہ نہیں کرسکتا لیکن اپنے کو اس سے مجبور پاتا ہوں۔

مگر آپ کہیں گے کہ اسی طرح تو سب اپنی سرگزشت اور اپنے روزنامچے شروع کرتے ہیں۔ سب ہم کو یہی یقین دلاتے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں چھپنے کے لئے لکھ رہے ہیں اور ان کا مقصد ان واقعات کو جو صرف ذاتی اور انفرادی اہمیت رکھتے ہیں عوام کے سامنے لانا نہیں ہے۔ پھر وہ لکھتے کیوں ہیں؟ میں بھی آپ کی ہاں میں ہاں ملا کر ان لوگوں سے یہی پوچھتا ہوں۔ خیر دوسرے کیا کرتے ہیں اور کیوں؟ اس کا نہ میں ذمہ دار ہوں اور نہ اس سے مجھے کوئی سروکار ہو سکتا ہے۔ میں تو صرف اپنے حرکات و سکنات کا ذمہ دار ہوں۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں ہے کہ میں یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ محض اپنا جی بہلانے کے لئے نہیں لکھ رہا ہوں میری غرض یقیناً یہ ہے کہ میرے یہ انتشارات دوسروں کے سامنے آئیں اور دوسرے ان سے کچھ اثر قبول کریں۔

میں کسی کی زندگی کو صرف ذاتی یا انفرادی نہیں سمجھتا۔ افراد کی زندگی کا ایک ایک لمحہ جماعت کی زندگی سے کسی نہ کسی حد تک متعلق ہوتا ہے اور اس کو کسی نہ کسی اعتبار سے متاثر کرتا ہے اسی طرح جماعت کی زندگی کا ایک ایک واقعہ افراد کی زندگی پر اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہتا۔ زندگی ایک مجموعی اور کلی حقیقت ہے۔ انفرادی اور اجتماعی اس کے دو پہلو ہیں جو ایک دوسرے سے کبھی بے تعلق نہیں ہو سکتے۔ ہم الگ الگ ان پر نظر ڈالتے ہیں اس لئے وہ الگ معلوم ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ جو لوگ کسی نہ کسی حیثیت سے منظر عام پر آ چکے ہیں اور کسی نہ کسی حد تک عوام کی چیز بن ہو چکے ہیں ان کی زندگی تو اور بھی ذاتی اور انفرادی نہیں رہ جاتی۔ جب ایک بار آپ عوام کے سامنے آ گئے اور ان کی زندگی میں شریک ہو گئے کیا چور ڈاکو یا زانی کی حیثیت سے، کیا شاعر مصلح یا پیغمبر کی حیثیت سے تو پھر آپ کی زندگی کا کوئی پل اور کوئی سانحہ ایسا نہیں جو صرف آپ کا ہو اور جو دوسروں کی زندگی پر اچھا یا برا اثر نہ ڈالتا ہو یا نہ ڈال سکتا ہو یہ اور بات ہے کہ بہت سے حالات اور واقعات مخفی رہ جائیں اور دنیا کو ان کا علم ہی نہ ہو۔

میری زندگی کبھی بھی میری ذات تک محدود نہیں رہی ہے عوام سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق مجھے ہمیشہ رہا۔ میرے جاننے والوں کی تعداد خاصی ہے، ایک زمانہ وہ تھا جب کہ میں صرف شاعر اور ادیب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن زمانے کے تیور اور دنیا کا رنگ دیکھ کر مجھے اپنے اصلی جوہر اور فطری میلان سے منہ پھیر لینا پڑا پھر بھی میری موجودہ زندگی میں میرے وجدانی عناصر کی کافی جھلک باقی ہے۔ میں اپنی فطرت سے کبھی پورا انکار نہ کر سکا۔ اب میں ایک معمولی سے مدرسے میں انگریزی کا معلم ہوں۔ ساٹھ روپے ماہوار ملتے ہیں۔ جن میں سے بیس روپے ہوٹل کا کرایہ دے دیتا ہوں۔ کچھ اخباروں کے لئے لکھ دیا کرتا ہوں۔ جس سے مہینے میں دس پندرہ .... مل جاتے ہیں۔ یہ کوئی بڑی حوصلہ افزا رقم نہیں ہوئی لیکن میں خدا کی اتنی بڑی دنیا میں بالکل تن و تنہا ہوں اور آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اس لئے مجھے وہ اقتصادی فراغت اور معاشرتی آزادی میسر ہے جو بڑے بڑے تنخواہ داروں کے حصے میں نہیں آئی۔

میرے احباب اب بھی مجھے شاعر اور ادیب سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حسن کاری (آرٹ) کا مادہ میرے خون کے ذرے ذرے میں ہے جو ہر حال میں ظاہر ہوتا رہے گا مگر اب تو یہ محض کہنے کی بات ہے۔

میرے ایک ذوق سے عوام ناواقف رہ گئے۔

میرے اندر مصوری کی صلاحیت بھی بچپن سے ہے اور جب میں اسکول اور کالج میں پڑھتا تھا تو میری تصویروں نے اکثر مقابلوں میں انعامات بھی حاصل کئے ہیں۔ میں نے اپنی اس صلاحیت کو ترقی نہیں دی۔ اس لئے اس کو نہ زیادہ فروغ ہوسکا اور نہ وہ دنیا کے سامنے آسکی۔

میں اب اپنے کو وقت کا آخری راگ سمجھتا ہوں جس کا آخری وقت آگیا ہے اگر اس کو آپ شاعری سمجھیں تو اس کی نثر یہ ہے ایک ڈاکٹر جو میرے بڑے چاہنے والے دوست ہیں آج ہی مجھے آگاہ کر گئے ہیں کہ اس طرح میں زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتا میرا سارا نظام عصبی منتشر ہوچکا ہے۔ میری ہستی کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ درد سر اور بے خوابی کی تین سال سے مستقل شکایت ہے۔ کوئی دو ماہ سے ہلکی ہلکی حرارت بھی ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے ہوئی ہے کہ میں کچھ دنوں کی چھٹی لے لوں میرا بس چلتا تو ہرگز چھٹی نہ لیتا اس لئے کہ مجھے یقین ہے میرا آخری وقت سر پر آگیا ہے اور ٹلنے والا نہیں ہے۔ اب میں زندگی کے ایک ایک لمحے کو اپنے کام میں لے آنا چاہتا ہوں قبل اس کے کہ میں پاگل ہوجاؤں یا مجھے دق ہوجائے۔ انھیں دو باتوں سے ڈاکٹر مجھے ڈرا رہے ہیں۔ ہاں ایک تیسری صورت بھی ہوسکتی ہے۔ کسی دن ہوٹل کے مالک کی بندوق چپکے سے لے آؤں اور خود اپنی زندگی کا قصہ پاک کردوں، ہاں تو میں چھٹی نہ لیتا لیکن میرے مدرس اعلیٰ نے مجھے چھٹی لینے پر مجبور کردیا اور اب میں بیکار ہوں۔

تین سال سے میرا معمول یہ رہا ہے کہ دس بجے دن سے چار بجے شام تک مدرسے میں گزارتا ہوں۔ کسی کو یقین ہوگا کہ میں اس تین سال میں صرف دو بار ہوٹل سے باہر گیا ہوں؟ آخر میں کیا کیا کرتا ہوں؟ یہ آپ کو معلوم ہوجائے گا۔ میرے کسی دوست کو ٹھیک علم نہیں کہ میں کیا کیا کرتا ہوں لوگ سمجھتے ہیں کہ میں پڑھتا رہتا ہوں یا شعر کہا کرتا ہوں یا کوئی زبردست کتاب تصنیف کر رہا ہوں۔ یہ سب غلط ہے نظمیں ضرور کبھی کبھی کہتا ہوں اور کہہ کہہ کر صندوق میں دفن کرتا جاتا ہوں پچھلی عید میں ایک نظم لکھی تھی جس کے کچھ اشعار جی چاہے سن لیجئے۔

مبارک پھر وہی ہنگام آیا　　مہ نو عید کا پیغام لایا
بشارت آرہی ہے آسماں سے　　نحوست اٹھ گئی سارے جہاں سے
مسرت سے کوئی خالی نہیں ہے　　زمیں پھر رشکِ خلدِ بریں ہے
دعا پھر وعدۂ لاتقنطو ہے　　کہ ہر دل کامیابِ آرزو ہے
نہ بیماروں کو بیماری کا غم ہے　　نہ ناداروں کو ناداری کا غم ہے
مناجاتی نہ مایوسِ مناجات　　خراباتی نہ محرومِ خرابات
اُٹھے گلدستہ بندانِ محبت　　ہوئے پھر تازہ پیمانِ محبت
دلوں کے آج غنچے کھل رہے ہیں　　کہ بچھڑے عمر بھر کے مل رہے ہیں
مشقت ختم ہے فرہاد ساری　　ہوئی ... وں سے نہر جاری
مگر اپنا وہی حال زبوں ہے　　نوید عید پیغام جنوں ہے
نمود مہر عکسِ داغِ ہجراں　　طلوعِ صبح چاکِ جیب داماں
تپش آمادہ پھر نالے ہوئے ہیں　　مرے زخم جگر کے لالے ہوئے ہیں
ستم ہے جینے ہی ہجور رہنا　　اسی دنیا میں وہ کر دور رہنا
سن اے بیگانۂ رسم وفا سن　　مری محرومیوں کا ماجرا سن

"سحر گہ عید میں دور سبو تھا
پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا"

یہ آخری شعر میر کا ہے جس کو میں نے حسب حال پایا اور اپنے اشعار میں شامل کردیا۔

لیکن شعر کہنے میں کس کو اتنا انہماک ہوسکتا ہے کہ وہ

اپنے کو تین سال سے ایک کمرے میں بند کئے رہے۔ رہا کچھ اور لکھنے کا سوال سو اب دماغ کام نہیں کرتا اور نشست میں مجھ سے ایک صفحہ بھی نہیں لکھا جاتا۔ یہ چند اوراق بھی دو ہفتوں کی کمائی ہیں اور سیکڑوں نشستوں میں سیاہ ہوئے ہیں۔ میں اپنے اندرونی کمرے میں بیٹھا رہتا ہوں۔ اگر کوئی دوست آتا ہے تو باہر کے کمرے میں آجاتا ہوں ورا اپنے تیور سے ظاہر کر دیتا ہوں کہ اس کی صحبت میرے لئے جان کا وبال ہو رہی ہے۔ کوئی بہت بے تکلف ہوا تو بیٹھا رہ جاتا ہے۔ ورنہ میرا اشارہ پاکر کسی بہانے سے چلا جاتا ہے۔

مجھ سے اصرار کیا جا رہا ہے کہ میں کسی ساحلی مقام پر جاکر کچھ دن سکون کے ساتھ گزاروں اور کوئی ایسا کام نہ کروں جس سے دماغ پر زور پڑے۔ اور نہ اپنے جسم اور اعصاب کو تھکاؤں ورنہ اگر دق نہ بھی ہوا تو اس درد سر اور اس بے خوابی کا انجام برا ہے اور میں جانتا ہوں کیا ہوگا۔ میری جیب میں ایک پیسہ نہیں ہے ساحلی یا پہاڑی مقام پر جانے کا کیا ذکر ہے؟ میں اس وقت پابندی اور ضابطے کے ساتھ اپنا علاج بھی نہیں کر سکتا یہی بہت ہے کہ فراغت کے ساتھ گزر اوقات کر رہا ہوں اور میرے سر کسی کا قرضہ نہیں ہے۔ جب میں مروں گا تو زندگی کا سارا حساب بیباق رہے گا۔

ہاں تو مجھے یا تو دق ہوگا یا جنون، اور جب میں غور کرتا ہوں کہ میرے خاندان میں بیسوں کی کمی نہیں رہی ہے جو پاگل ہوکر مرے ہیں تو مجھے اپنا انجام بہت صاف نظر آنے لگتا ہے مجھے سل و دق نہیں ہوگا۔ ایسی بیماریاں مجھے نہیں ہوسکتیں مجھے یا تو پاگل ہونا ہے اور پاگل خانے میں مرنا ہے یا پھر اگر حواس درست رہے اور ارادے اور عمل کی قوت باقی رہی تو اپنی زندگی کا خاتمہ اپنے ہاتھ سے ہوگا۔ میرا دماغ متزلزل ہو چکا ہے اور میں جلد جلد جو کچھ سمجھ میں آئے لکھ ڈالنا چاہتا ہوں۔ قبل اس کے کہ ہوش و حواس ہمیشہ کے لئے جواب دے دیں۔ مگر ایک نشست میں زیادہ لکھا بھی تو نہیں جاتا!

کیسا صریح ظلم ہے! کیسی کھلی ہوئی بے انصافی ہے! مجھے احساس ہے کہ میرے اندر شدید قوتیں ہیں جو گھٹ کر رہ گئی ہیں اور جو نہ اپنے کام آسکیں نہ دنیا کے، اسے خود ستائی نہ سمجھئے مجھے کوئی مغالطہ نہیں ہے۔ میں دنیا کی رائے سے بہکا بھی نہیں ہوں۔ میں اس عمر اور اس دور سے گزر چکا ہوں جب کہ چاپلوس زبان سے اپنی تعریف سن کر آدمی کا دماغ عرش پر پہنچ جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ رائے عامہ کی حقیقت کیا ہے اور اس کو کیا مرتبہ دینا چاہئے۔ میں باطنی جوہر کو پہچانتا ہوں اور اصلی اور جھوٹی قوتوں میں تمیز کر سکتا ہوں۔ یہ بالکل اتفاق ہے کہ دوسروں نے بھی میری ابتدائی صلاحیتوں کو مان لیا اور بحیثیت شاعر اور ادیب کے عوام میں بھی میں تھوڑا بہت کامیاب رہا۔ مگر یہ کامیابی اسی قدر غیر معقول اور ناقابل اعتبار ہے جس قدر کہ ایک نہایت خوشگوار خواب۔

مجھے بچپن سے احساس ہے کہ میرے اندر ایک غیر معمولی تخلیقی قوت خون کے ساتھ حرکت کر رہی ہے جو کبھی کبھی اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ میں خود اس کو برداشت نہیں کر سکتا اس قوت خلاق نے یوں تو نہیں نہیں کر بھی بہت کچھ پیدا کیا لیکن دنیا کی رائے پر نہ جائیے جو ہمیشہ تیسرے درجے کی چیزوں سے بھی مرعوب ہو جاتی ہے۔ میں جو کچھ کر سکتا تھا

نہیں کرسکا۔ یہ احساس مرنے کے بعد بھی مجھے چین سے نہ رہنے دیگا۔

اور جب میں سوچتا ہوں کہ اتنی عمر گزار کر اور اتنا کچھ کر چکنے کے بعد بھی اپنا شاہکار نہ پیدا کر سکا تو مجھے واقعی جنون ہونے لگتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ اپنے جامۂ ہستی کو تار تار کر کے رکھ دوں۔

ہر انسان اپنے اندر ایک بُت کدہ رکھتا ہے جو اس کا اپنا تعمیر کیا ہوا ہوتا ہے اور ہر شخص کے کچھ بُت ہوتے ہیں جو اس کے اندر سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ وہی بُت ہیں جن کو شاعر "اصنام خیالی" کہتا ہے اور جو پتھر کی مورتوں سے بھی زیادہ سنگین ہیں۔ کسی کو اس کی فرصت اور توفیق ہوتی ہے کہ وہ اپنے بتوں کو یکساں جوش اور انہماک سے پوجتا ہے اور کوئی زندگی کی کثافتوں میں اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ اس کو اپنے بتکدے کا ہوش بھی باقی نہیں رہتا۔

میرے اندر بھی ایک بُت کدہ تھا جو طرح طرح کے بتوں سے معمور تھا۔ ان میں سب سے بڑا بُت ایک عورت کا تھا۔ یہ میری عورت کی تخیل تھی جس کو میں بچپن سے بڑی شدت اور محویت کے ساتھ پوجتا رہا جب میں کبھی حسن و عشق کی داستانیں سنتا یا پڑھتا تھا تو سوچا کرتا تھا کہ جس عورت کے ساتھ مجھے محبت ہو گی وہ کیسی ہوگی رفتہ رفتہ میرے خلاق تخیل نے اس کو ایک صورت دی اور دھیرے دھیرے میرے اندر اس کا ایک بُت قائم ہو گیا۔ اب جتنے اور بُت تھے وہ دوسرے درجے پر تھے اور اس کے زیر نگیں تھے۔ کچھ دنوں کے بعد نہ جانے کیوں میں اس تخیلی پیکر کو ناہید کے نام سے یاد کرنے لگا۔

میں فطرتاً ان لوگوں میں سے ہوں جن کو دنیا خیال پرست کہتی ہے اور جو تخیل کے مقابلے میں واقعہ کو نہ صرف ادنیٰ درجے کی چیز سمجھتے ہیں بلکہ جو تخیل کو واقعے سے زیادہ حقیقی مانتے ہیں اور اسی میں کھوئے رہتے ہیں۔ میں بچپن سے اپنی تخیل کا سودائی تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جاگتے میں جتنے خواب دیکھے ہیں کسی نے سوتے میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔ میں ہر وقت خواب دیکھا کرتا تھا اور خواب میں دنیا کو سنوارا کرتا تھا اور جب سے میری تخیل نے اس عورت کو پیدا کیا تھا میری خواب دیکھنے کی قوت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ روزانہ مجھ پر کئی بار ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور میں اپنی آنکھوں سے ناہید کو دیکھنے لگتا تھا۔ کبھی کبھی تو جب میں پلٹ کر ہوش میں آتا تھا تو اپنی اس حالت سے دہشت معلوم ہونے لگتی تھی لیکن یہ دہشت دیرپا نہیں ہوتی تھی۔ میں پھر اپنی تخیل کے طلسم کدے میں گم ہو جاتا تھا۔

مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرے اندر ایک شعلہ روشن ہے جو میری ساری ہستی کو روشن کرنا چاہتا ہے جس وقت میری قوت خلاقی مجھ پر مسلط ہو جاتی تھی تو سارا بدن دھدھک اُٹھتا تھا گرد و پیش کی فضا دھندلی ہو کر سمٹ جاتی تھی اور اس کی جگہ ایک نئی فضا پیدا ہو جاتی تھی اور پھر میری ناہید میرے سامنے ہوتی تھی۔ میں اپنے کو ایک جذبۂ پرستش سے مغلوب پاتا تھا اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ اس کے قدموں پر سر رکھ دوں۔

جب تک لڑکپن کی عمر تھی مجھے اپنی اس حالت میں جسکو "بیدار خوابی" کہنا چاہئے۔ بڑا مزا ملتا تھا لیکن جوں جوں میری زندگی جوانی کی طرف قدم بڑھاتی گئی۔ یہی چیز میرے لئے کلفت کا سبب بھی ہوتی گئی۔ اب جتنی دیر میں اس عالم خواب سے دور رہتا تھا۔ بے چین رہتا تھا اور ناہید کے لئے تڑپا کرتا تھا میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہو رہی تھی کہ زندگی کی جو گھڑی گزرے ناہید کے ساتھ گزرے۔ بے طرح جی چاہتا تھا کہ یا تو خود ہمیشہ کے لئے

ناہید کی دنیا میں چلا جاؤں یا اس کو خواب کی بستی سے نکال لاؤں
دونوں میں سے کوئی صورت ممکن نہیں تھی لیکن جوانی کے ولولے اور
جوانی کی امیدیں بھی مشہور رہیں! میں اپنے دل کو اس خیال سے تسکین
دے لیا کرتا تھا کہ ایک نہ ایک دن ناہید مجھے زندگی بھر کے
لئے مل جائیگی اور میرا یہ خیال ایمان کی طرح قوی اور راسخ تھا۔ اس
وقت اگر غالب بھی مجھے یہ سمجھاتے کہ یہ محض دل کے بہلانے کے لئے
ایک اچھا سا خیال ہے تو میں نہ مانتا بلکہ الٹے ان کی ساری شاعری
کو حرف غلط بنا دیتا۔

زمانہ کسی کے بت ہمیشہ قائم رہنے نہیں دیتا اور اگر بت
قائم رہ گئے تو ہمارے جذبۂ بت پرستی کی شدت ضرور گھٹ جاتی
ہے اور ہم کو اپنے بتوں کے ساتھ وہ گم شدگی باقی نہیں رہتی۔
زندگی نے میرے ساتھ بھی یہی کیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا میر
خواب کا جادو مجھ پر سے اترتا گیا اور مجھے یقین ہوتا گیا کہ ناہید مجھے کبھی
نہیں ملے گی ایک مدت تک میں در پردہ ہر وقت اور ہر جگہ
ناہید کو ڈھونڈھتا رہا یہانتک کہ مجھ پر یہ حقیقت سورج کی طرح
روشن ہو گئی کہ میری زندگی ناہید سے ہمیشہ خالی رہے گی۔ میں
رفتہ رفتہ ناہید کو زندگی کی ادنی اور ثقیل مصروفیتوں میں دفن
کرتا گیا۔ آخر کار وہ سب کچھ بھولا ہوا سا خواب ہو کر رہ گیا پھر بھی
مجھے اس خواب کی اتنی لاج تھی کہ میں نے تنہا اور مجرد رہنے کی
قسم کھالی۔ میرا دل کہتا تھا کہ اگر ناہید کے سوا کوئی دوسری عورت
میری زندگی میں شریک ہوئی تو رہی سہی زندگی تہس نہس
ہو جائیگی اور اب اگر مجھے کوئی اطمینان ہے تو صرف یہ کہ مرتے دم
تک اپنا عہد نباہ دیا۔

مجھے عقل و ہوش کے عالم میں رہتے ہوئے ایک عمر ہو چکی تھی
اور میرے مزاج جنوں میں اعتدال قائم ہو چکا تھا۔ میں اپنی
خواب خیال کی قوتوں کو دوسری سمتوں میں صرف کرنے لگا تھا۔
اور ناہید کی تخیل سے نہ جانے کتنی حسین و جمیل چیزیں پیدا ہو چکی
تھیں۔ میں نے دنیا میں جتنے کام کئے سب میں شعوری یا
غیر شعوری طور پر ناہید کارفرما تھی اگر چہ بظاہر اس کو بھولا ہوا تھا۔

۱۹۳۵ء میری زندگی میں ایک تاریخی سال ہے! اسکو
تین برس ہو گئے۔ اس مدت میں میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔
قیصر باغ ہوٹل میں مجھے آئے ہوئے مشکل سے سال بھر ہوا تھا
.... شروع گرمی کا موسم تھا۔ فضا میں بہار کی تاثیر پھیل رہی تھی
مدرسہ صبح سے لگنے لگا تھا اور میں دوپہر ہوتے ہوتے ہوٹل میں
آجاتا تھا۔

ایک دن میں مدرسے سے واپس آیا اور اپنے کمرے کی طرف
جانے لگا تو دیکھا کہ میرے کمرے سے پہلے جو کمرہ پڑتا ہے اس میں
ایک چھوٹا سا گھر آباد ہے۔ نہ جانے کس خیال سے میں ٹھٹھک گیا کمرے
کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اسباب قاعدے اور ترتیب سے لگائے
جا رہے تھے۔ ایک عورت میری طرف پیٹھ کئے کھڑی تھی اس سے
لپٹے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے بچے کھڑے تھے۔ شوہر اور ملازم
کام میں مصروف تھے میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور جب خانساماں
میرا کھانا لایا تو میں نے اس سے پوچھا کہ بغل والے کمرے میں کون
لوگ اترے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کوئی انجینئر ہیں جو الہ آباد
کے رہنے والے ہیں۔ بیگم کچھ بیمار ہیں انھیں کا علاج کرانے آئے
ہیں اور کچھ دن لکھنؤ میں قیام کریں گے۔

دن بھر آگ برستی رہی۔ چھ بجے شام سے پہلے کوئی

کمرے سے باہر مُنہ نہ نکال سکا۔ جب کچھ ٹھنڈا ہوا تو لوگ اپنے اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں بیٹھے۔ میں بھی ایک کتاب لے کر باہر آیا۔ میری نگاہ بلاارادہ نوواردوں کی طرف اُٹھ گئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ دفعتاً میری ساری دُنیا پھر خواب میں تبدیل ہوگئی ہو یہ تو وہی ناہید تھی! تو کیا میں پھر وہی خواب دیکھ رہا تھا! اور اتنے دنوں کے بعد! میں نے مُنہ پھیر کر آنکھیں ملیں، پھر دیکھا وہ تو سچ مچ ناہید ہی تھی۔ سرِ مو فرق نہ تھا۔ وہی صورت، وہی قد، چہرہ میں وہی ایک فضائی کیفیت، سب کچھ وہی۔ اب میں کیا کروں؟ میرا جذبہ پرستش اُبھر آیا تھا اور جی چاہتا تھا دوڑ کر اس کے قدموں پر سر رکھ دوں، جب کسی طرح ضبط نہ کر سکا تو اُٹھ کر کمرے میں چلا آیا لیکن ناہید کی صورت آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو رہی تھی ساری رات جاگتا رہا اور کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ میرے دل کی حرکت تیز تھی اور کنپٹی میں محسوس ہو رہی تھی۔ میں اسلئے اور بھی برآمدے میں آتے ہوئے گھبراتا تھا کہ وہ بھی برآمدے ہی میں سوئی ہوئی تھی اور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔

میں اپنی حالت بیان نہیں کر سکتا۔ آنکھوں میں رات کاٹ دی۔ صبح سویرے جب مدرسے جانے لگا تو مجبور تھا کہ اس کے پاس سے ہو کر گزروں۔ سب سو رہے تھے وہ اُٹھ چکی تھی اور مُنہ ہاتھ دھو کر سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی نہ معلوم کس کے جگنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ چند قدم میں نے کس طرح طے کئے۔ بس قریب تھا کہ ہوش و حواس کھو دوں اور اس کے قدموں پر گر پڑوں۔

دوپہر کو واپس آیا تو خانساماں نے مجھ سے کہا کہ بغل کے کمرے میں جو صاحب ہیں انہوں نے کہا ہے کہ اگر آپ کو زحمت ہو تو وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا "ان کے کمرے میں جانا تو کہہ دینا کہ نا وقت ہو گیا تھا اس لئے نہیں آیا۔ شام کو حاضر ہوں گا"

سہ پہر میں خانساماں پھر پیغام لایا "بغل کے کمرے والے صاحب کہتے ہیں کہ اگر تکلیف نہ ہو تو آکر ہم لوگوں کے ساتھ ہی چائے پئیں" میں عذر کیا کرتا لیکن دل قابو میں نہیں تھا۔ خانساماں سے کہہ دیا "چلو آتا ہوں"۔

انجینیر صاحب نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا اور کہا "معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو تکلیف دی۔ مجھے آج صبح ہی ہوٹل کے منیجر اور ڈاکٹر صاحب سے جو میری بیوی کو دیکھنے آئے تھے معلوم ہوا کہ آپ کون ہیں۔ میں آپ سے غائبانہ واقف تھا اور مجھ سے زیادہ یہ واقف تھیں۔ میں تو خیر ٹھوس مادّی دنیا کا آدمی ہوں۔ لیکن یہ شعر و ادب ہی کی دُنیا میں رہتی ہیں اور آپ کی ہم پیشہ بھی ہیں۔ الٰہ آباد میں لڑکیوں کے ایک اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ آپ کی تصنیفات ایک ایک کر کے پڑھ چکی ہیں اور آپ کے نام اور آپ کے مرتبے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ کچھ عرصے سے بیمار رہتی ہیں۔ علاج کی غرض سے ان کو یہاں لایا ہوں۔ آج ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر نے دیکھا ہے اور دونوں کی رائے ہے کہ اگرچہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے پھر بھی کچھ دنوں تک یہاں ٹھہر کر علاج کرا لینا بہتر ہوگا۔ میں نے پندرہ روز کی چھٹی لی تھی، خیر رخصت بڑھوا لوں گا

...... مجھے بڑی خوشی ہے اور یہ بھی اس کو اپنی بڑی خوش نصیبی سمجھتی ہیں کہ آپ ہمارے پڑوسی ہیں"

بیگم (مگر یہ تو ناہید تھی!!) نے کہا "ایسے ادیب اور شاعر کو ہمسایہ پا کر کون اپنے کو خوش نصیب نہیں سمجھے گا؟"

حسام الدین نے کہا "مجھے اطمینان ہے کہ اب ان کا جی نہیں گھبرائے گا۔ باوجود آپ کی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کے آپ گھنٹہ آدھ گھنٹہ تو ملاقات رہا ہی کرے گی۔ سُنا ہے آپ کے

پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ ان کو کتابوں کے ساتھ عشق ہے امید ہے آپ ان کو کتابیں پڑھنے کے لئے دے دیا کریں گے۔"

میرا دل سنسنایا جا رہا تھا۔ میں آنکھ بھر اپنی خواب کی مخلوق کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میری زبان میں لغزش تھی۔ بڑی مشکل سے اپنی حالت کو سنبھال کر اتنا کہہ سکا "بسر و چشم۔ اس کے علاوہ بھی میرے لائق جو خدمت ہو بتائیے۔ میں اس کو انجام دینا اپنے لئے فخر اور مسرت کی بات سمجھوں گا۔"

اس کے بعد میں نے بچوں کی آٹے لی اور جتنی دیر بیٹھا رہا انھیں کے ساتھ مشغول رہا۔

وہ تاریخ ہے اور آج کا دن کہ مجھ پر نیند حرام ہے اور سر میں مستقل درد رہتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ میرے اعصاب ایک ہی وقت میں خواب اور واقعہ کی تاب نہیں لا سکتے۔ وہ یقیناً میرے خواب کی ناہید تھی اور اب میں اس کو ناہید ہی کہوں گا مگر خواب میں تو ناہید میری تھی! یہ کون سی دنیا تھی جہاں وہ دور کی تھی اور جہاں مل کر بھی ناہید مجھے نہیں ملی؟ ایسا معلوم ہوتا تھا میری ہستی درمیان سے پھٹ گئی ہے اور دونوں ٹکڑے دو سمتوں میں جا رہے ہیں۔

چند ہی دنوں میں ناہید، حسام الدین اور دونوں بچے مجھ سے بے انتہا بے تکلف ہو گئے۔ اب میری فرصت کے جتنے لمحے تھے وہ انھیں کے ساتھ گزرتے تھے۔ یا تو وہ لوگ میرے کمرے میں ہوتے تھے یا مجھے اپنے کمرے میں لے جاتے تھے۔ میرے لئے یہ گھڑیاں سخت آزمائش ہوتی تھیں۔ میری رگ رگ میں ایک تھکا دینے والا تلاطم برپا رہتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ میں باتیں بہت کم کر پاتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا نہایت کمزور اور دھیمی آواز میں کہتا تھا۔ ایک بار حسام الدین اور ناہید دونوں نے پوچھا "رمزی صاحب آپ باتیں بہت کم کرتے ہیں یا پھر ہم لوگوں کے سامنے چپ رہتے ہیں؟"

میں نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا مگر تلملا کر رہ گیا۔

ناہید بی۔ اے تھی اور بڑا رچا ہوا ادبی مذاق رکھتی تھی۔ شاعروں کے کلام کا بہترین حصہ اس کو زبانی یاد تھا۔ اس معاملے میں میں نے اس کو اپنا پورا حریف پایا۔ حسام الدین جیسا کہ بیچارے خود اعتراف کر چکے تھے۔ واجبی ہی سے آدمی تھے۔ لیکن بیوی کی خاطر جتنی دیر میں بیٹھا رہتا تھا شاعری اور فلسفے ہی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ میں اگرچہ اس صحبت میں کسی موضوع پر مفصل و مدلل گفتگو کرنے کی تاب اپنے اندر نہیں پاتا تھا تاہم جو کچھ بھی کہتا تھا ناہید اس کو بڑے غور سے سنتی تھی اور اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ میری بات کو وہ دلنشین اور معقول پاتی ہے۔

وہ مجھ سے کتابیں لے جایا کرتی تھی۔ اور بار بار کہتی تھی "رمزی صاحب آپ کی ملاقات میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے" اور میں اس سے کیا کہتا؟ جس ذہنی اور روحانی کرب سے گزر رہا تھا اس سے خدا دشمن کو بھی بچائے۔

کبھی کبھی اس کا موقع آ جاتا تھا کہ ناہید کو میں دوا پلاؤں ایسی حالت میں میرا اندرونی ہیجان میرے ہاتھوں کی لرزش سے ظاہر ہو جاتا تھا اور ناہید کو میرے کانپتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ کئی مرتبہ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "رمزی صاحب آپ کے سارے بدن میں ہر وقت ایک ہلکی سی لرزش کیوں رہتی ہے؟ شاید مسلسل محنت نے آپ کے

اعصاب ہلاکر رکھ دیئے ہیں۔ حالانکہ ان لوگوں کو مجھ سے کوئی تکلف باقی نہیں تھا اور مجھے جو تکلف تھا اس کو ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔

ناہید کو کوئی اندرونی بیماری تھی جو ایسی نہ تھی کہ اس کو پابند بستر کر دیتی، وہ چلتی پھرتی تھی اور شام کو کبھی کبھی نیچے جا کر تھوڑی دور ٹہل بھی آتی تھی۔ میں اس کی کوشش کرتا تھا کہ ایسے وقت میں اس کے ساتھ نہ ہوں۔

کبھی کبھی حسام الدین ناہید اور بچوں کو مجھ پر چھوڑ کر بازار یا کسی ملاقاتی سے ملنے چلے جاتے تھے۔ یہ میرے لئے سُولی کا وقت ہوتا تھا۔ خاص کر جب کبھی ناہید اکیلے میرے کمرے میں آ جاتی تھی۔ ناہید کے لئے میں شاید معمہ تھا۔ اکثر وہ مجھے سراپا استعجاب بن کر دیکھنے لگتی تھی۔ وہ مجھے "حسن کار" کہا کرتی تھی اور مجھ کو غیب کا آدمی سمجھتی تھی۔ میں اس سے کیا کہتا اور کس زبان میں کہ میں اس کو کہاں کی مخلوق سمجھتا ہوں؟

جو جذبہ مجھے اندر ہی اندر مٹائے ڈالتا تھا وہ یہ تھا کہ ایک بار کسی طرح ناہید کے قدموں پر سر رکھ دوں۔ یہ جذبہ مجھے جنوں کی طرح ستا رہا تھا۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ناہید میرے ساتھ اکیلی رہی ہے اور میں اس جذبہ پرستش سے اس طرح بے بس ہو گیا ہوں کہ اگر کوئی بہانہ کر کے اُٹھ نہ آتا تو شاید اپنے کو رسوا کر دیتا۔

ایک دن شام کو مغرب سے کچھ پہلے میں اپنے کمرے میں ماتھے پر ہاتھ دھرے بیٹھا اپنے سُونے مقدر پر غور کر رہا تھا۔ مجھے مطلق خبر نہ ہو سکی کہ ناہید کمرے میں کب آئی۔ مجھے اس کا ہوش اس وقت ہوا جب اس نے کہا "آپ کسی سوچ میں بیٹھے ہیں۔ میں نے شاید خلل ڈال دیا" میں نے چونک کر جلدی سے کہا "نہیں نہیں آئیے میں کوئی خاص بات نہیں سوچ رہا تھا"

ناہید نے کہا "میں آپ سے ڈاسٹفسکی کی سوانح عمری لینے آئی تھی۔ آپ نے اس دن کہا تھا کہ آپ کے پاس ایک بڑی قیمتی سوانح عمری ہے یہ شاید آخری کتاب ہوگی جو آپ سے لے کر پڑھ سکوں گی اس لئے کہ اب تو مشکل سے پندرہ روز یہاں ہماری"

میں نے کہا "جو آخری کتاب ہو اس کو میری حقیر یادگار سمجھ کر لیتی جائیے گا"

بعض وقت اس کے چہرے پر ایک اُداسی چھائی ہوتی تھی جس میں بڑا گہرا معنوی کیف ہوتا تھا اور جو مجھے ایک ایسے شعر سے مشابہ معلوم ہوتی تھی جو بیک وقت بلیغ اور لطیف ہو۔ آج بھی اس کے چہرے پر یہی اداسی تھی۔

میں نے اپنے کو بڑی کوشش سے سنبھالا اور اُٹھ کر الماری کھولی اور فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر نیچے کے خانے میں وہ کتاب تلاش کرنے لگا۔ ناہید بھی آ کر میری بغل میں کھڑی ہو گئی۔ میرے دل کی دھڑکن مہلک حد تک تیز ہو گئی اور میں کانپنے لگا۔ ناہید نے کہا "آپ کیا بیمار رہتے ہیں؟ آپ کا بدن آپ کے قابو میں نہیں رہتا" میں نے آواز کو سنبھال کر جواب دیا "نہیں شاید بے کل بیٹھا ہوا ہوں"

میں نے بڑی بڑی مشکل سے کتاب پائی حالانکہ بہت نمایاں کتاب تھی اور بالکل سامنے تھی۔ میری ناگفتہ بہ حالت کا اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ میں کتاب الماری سے باہر نکال کر اس پر سے گرد صاف کرنے لگا تو وہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور ناہید کے قدموں پر گر پڑی۔ میں نے اس کو اٹھانا چاہا تو بیساختہ میرا ہاتھ ناہید کے پاؤں سے چھو گیا۔ آناً فاناً

واقعہ کی دنیا تحلیل ہو کر فنا ہو گئی اور صرف میرے خواب کی دنیا
باقی رہ گئی۔ دوسرے لمحے میں میرا سر ناہید کے قدموں پر تھا۔ مجھے
پھر ہوش نہ آتا اگر میں یہ نہ دیکھتا کہ ناہید گھبرا کر مجھ سے دور جا کھڑی
ہوئی ہے اور وحشت بھری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہے
میں اٹھا لیکن پھر تھرتھراتا ہوا سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔ ناہید نے
مجھ سے جواب طلب کیا "اس کے کیا معنی تھے؟ آپ کا کیا مطلب
تھا؟" میں مشکل سے اتنا کہہ سکا "ناہید خدا کے لئے کتاب لو اور
جلدی سے چلی جاؤ........"

"ناہید؟" ناہید نے مجسم استفہام ہو کر کہا "ناہید
کون؟ آپ کہاں ہیں اور آپ کو کیا ہو گیا ہے؟........"

میں نے پھر ہاتھ جوڑ کر کہا "ناہید خدا کے لئے اس
وقت مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور چلی جاؤ ورنہ میرے دماغ
کی کوئی رگ پھٹ جائے گی"

ناہید میرے قریب آ گئی اور اپنی اس حالت کو دور کر کے
جس میں حیرت اور غصہ دونوں شامل تھے بڑی نرمی اور خلوص
کے ساتھ میرے شانے پر ہاتھ پھیر کر کہا "رمزی صاحب یہ آپ کا
کیا حال ہے؟ مجھے پہلے ہی دن سے آپ بیمار معلوم ہوتے تھے"

میں نے کہا "ناہید مجھے اللہ چھوڑ دو اور اپنے کمرہ میں جاؤ"

"یہ ناہید ناہید آپ کس کو کہہ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا

"تم کو۔ مگر خدا کے لئے اس وقت چلی جاؤ" میں نے تھرتھراتی
ہوئی آواز میں کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی جب تک آپ یہ نہ بتا دیں گے
کہ آپ کو کیا ہوا ہے" ناہید نے عازمانہ لہجے میں کہا اور بیٹھ گئی۔

میں نے کہا "اچھا ذرا دور ہٹ کر بیٹھو تو سنو" وہ میز کے
اس طرف کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔

میں اپنی اس حالت کو یوں بھی کبھی خاطر خواہ بیان نہیں
کر سکتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ناہید کو کیا بتاؤں اور اگر
بتاؤں تو وہ مجھے کیا سمجھے گی مگر وہ تو سننے پر تلی بیٹھی تھی
میں نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے جیسے بھی ہو سکا ٹوٹے
پھوٹے غیر مربوط جملوں میں اپنی روداد شروع سے آج کی تاریخ تک
بیان کر دی اور اپنی ظاہری اور باطنی دونوں زندگیوں کے حالات
اس کے سامنے رکھ دیے مجھے کچھ احساس نہیں کہ میں اس میں کہاں
تک کامیاب ہوا لیکن میں نے ناہید کو چپ پایا۔ بڑی دیر تک
مجھے سکتے کے عالم میں دیکھتی رہی جیسے کسی نے اس پر تنویم
(Hypnotism.) کا عمل کر دیا ہو۔

میں نے ہمت کر کے سر اوپر اٹھایا اور کہا "اب سن
لیا نا۔ اب بھاگ جاؤ۔ لیکن ایک مرتبہ مجھے اجازت دے دو کہ میں
تمہارے قدموں میں اپنے اس مہلک جذبے کو آسودہ کر لوں" میری
آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے ناہید اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس
آ گئی۔ میں نے چاہا کہ سر اس کے قدموں پر رکھوں لیکن اس نے
میرا سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور کہا "دیکھئے اب بس کیجئے۔ میں
آپ کو بڑی مقدس ہستی سمجھتی ہوں اور آپ کا احترام کرتی ہوں
ایسی ہستی کا سر........"

میں نے کہا "ناہید۔ بس مجھ کو روکو مت" ناہید
مجبور ہو گئی۔ میں نے اس کے قدموں پر سجدوں اور بوسوں کے
انبار لگا دیے۔ اس نے میرا سر پھر اٹھا لیا اور میری پیشانی
کو چوم لیا۔ اس کے بعد ہم دونوں بڑی دیر تک مبہوت بیٹھے
ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آخر کار میں نے کہا "ناہید
اب جاؤ۔ خدا تم کو خوش رکھے"

ناہید بیس روز اور ہوٹل میں رہی اتنے دنوں تک اس نے اپنا معمول بنالیا تھا کہ روز کسی نہ کسی وقت تنہائی میں مجھ سے مل لے اور میں بھی اسی طرح روز اس کو پوچھ لیتا تھا۔ مجھے وہ بے انتہا سوگوار نظر آرہی تھی۔ یہ سوگواری اس کی ہستی کا ایک ترکیبی عنصر معلوم ہوتی تھی جس کا رنگ میری وجہ سے کچھ اور گہرا ہوگیا تھا۔ میں اپنے حال میں ایسا مبتلا اور کھویا ہوا تھا کہ اس کا حال دریافت کرنے کا مجھے ہوش ہی نہیں تھا اور پھر وہ تو میری جانی پہچانی ہوئی ناہید تھی یہ سوگواری میرے خواب کے زمانے میں بھی اس پر چھائی رہتی تھی۔

آخر کار وہ گھڑی بھی آئی جس کے بعد ہم ایک دوسرے سے جاگتی دنیا میں پھر کبھی نہیں ملے۔ دوسرے روز دوپہر کو وہ جانے والی تھی۔ حسام الدین آج بہت مشغول تھے۔ رہ رہ کر باہر چلے جاتے تھے۔ کچھ دوستوں سے ملتے تھے کچھ خریداریاں کرتے تھے۔ ناہید آج کئی بار میرے کمرے میں آئی۔ میں نے آج کئی بار اس کے ہاتھ اور اس کے پاؤں چومے۔ آج اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے میں نے ایک مرتبہ پوچھا "ناہید یہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں" اس نے جواب دیا " میں سوچتی ہوں کہ کل میں جارہی ہوں اب آپ کا کیا حال ہوگا۔ مجھے آپ کی حالت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ ابھی سے آپ کے چہرے پر کسی دوسری دنیا کا رنگ پھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جب میں خیال کرتی ہوں کہ آج ڈیڑھ مہینے سے آپ نے پلک سے پلک نہیں لگائی ہے تو میرے حواس بجا نہیں رہتے۔ مصیبت یہ ہے کہ میں آپ کے ساتھ کچھ کر بھی نہیں سکتی یہ بھی تو نہیں کہہ سکتی کہ آپ گاہے ماہے آکر مجھ سے مل لیا کیجئے۔ اس سے زندگی میں روز بروز طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی جائیں گی۔ ہمارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ اس دنیا میں ہم ایک دوسرے سے دور رہیں اور اپنے اپنے غم میں گھلتے رہیں۔ لیکن میرا دل آپ کے ساتھ ہے اور آپ کے غم میں شریک ہے۔ مجھے بھی آپ سے ایک گہرا تعلق پیدا ہوگیا ہے۔ جس کو محبت کہہ سکتے ہیں اور یہ میری زندگی میں اپنی قسم کا پہلا تجربہ ہے۔ رمزی صاحب کاش میں آپ کا دُکھ بٹا سکتی!"

اس کی آنکھیں بدستور نم تھیں۔ میں نے کہا "ناہید!

نام کا ہے مرے وہ دُکھ جو کسی کو نہ ملا
کام میں ہے مرے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

جاؤ اور سکون کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرو۔ تم میری تخئیل ہو اور تم سے مجھے بہت کچھ ملا تم نے میرے خواب کو واقعہ بنایا اس سے زیادہ کی تو میں اس دنیا میں اُمید بھی نہیں کرسکتا تھا مجھے تو یہ بھی اُمید نہیں تھی کہ تمھارا وجود اس دنیا میں ہے"

ناہید نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کو چوم کر کہا "رمزی صاحب بس مجھے یہ اطمینان دلا دیجئے کہ آپ خوش نہیں تو زندہ رہنے کی کوشش ضرور کریں گے حالانکہ آپ مجھ سے پوچھ سکتے ہیں کہ اب جب ہم کو شاید پھر کبھی ملنا نہیں ہے تو مجھے آپ کے جینے نہ جینے سے کیا سروکار ہو سکتا ہے لیکن رمزی صاحب میری آرزو ہے کہ آپ زندہ رہیں" میں کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ حسام الدین آگئے اور سیدھے میرے کمرے میں چلے آئے۔ ناہید اُن کی آہٹ پاکر مجھ سے کہنے لگی "میں آپ کی کتاب واپس کرنے آئی تھی"

میں نے حسام الدین کی طرف دیکھ کر ناہید سے کہا "میری تمنا ہے کہ آپ اس کو میری یادگار سمجھ کے اپنے پاس رکھیں۔ لائیے میں اس پر لکھ دوں کہ یہ میرا ناچیز ہدیہ ہے"

میری راتیں بڑی بے کلی کے ساتھ بسر ہونے لگی تھیں

مشکل سے دو ایک گھنٹے بستر پر رہتا تھا اور جب سارا ہوٹل سو جاتا تھا تو آہستہ سے اُٹھتا تھا اور کمرے میں جاکر بیٹھ جاتا تھا آدھی رات کے بعد مجھے ساری کائنات پر ایک نیا رنگ بکھرتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور زمین و آسمان اپنے قالب بدل دیتے تھے میرے سامنے ایک نئی دنیا ہوتی تھی جس کی روحِ رواں ناہید ہوتی تھی۔ ناہید میری اتنے دنوں کی شب بیداری سے ناواقف نہیں تھی۔ وہ اپنے بستر پر پڑے پڑے دو چار دفعہ دیکھ بھی چکی تھی کہ میں اٹھ کر کمرے میں گیا۔ روشنی کی، پنکھا چلایا اور پھر وہیں رہ گیا۔

آج کی رات مجھ پر بے انتہا بھاری تھی۔ ناہید کل جانے والی تھی۔ میرے خواب کی دُنیا پھر درہم برہم ہو رہی تھی۔ میری رُوح سخت عذاب میں مبتلا تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے فردوس اور جہنم کے درمیان لٹکا دیئے جانے کا حکم ہو رہا ہے کوئی گیارہ بجے میں ناہید اور حسام الدین کو شب بخیر کہہ کر رخصت ہوا اور پھر کمرے سے باہر نہیں نکلا۔

مجھے کچھ ہوش نہیں کہ میں نے رات کیسے کاٹی اور کیا کیا سوچتا رہا بس ایک بے چینی تھی جو ریشے ریشے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں کبھی بیٹھ جاتا تھا اور کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتا تھا۔ میری آنکھوں کا عجیب عالم تھا۔ بجلی کی تیز روشنی میں بھی مجھے ہر چیز دُھندلی اور مٹتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

صبح کے کوئی تین بجے ہوں گے۔ دفعتاً میں نے دیکھا کہ ناہید دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی اور آہستہ سے کہا "رمزی صاحب اس طرح آپ کے دن زندہ رہیں گے؟"

میں نے جواب دیا "جب تک زندہ رہنا ہے"

ناہید نے کہا "اچھا روشنی گل کر دیجئے۔ میں آپ سے رخصت ہونے اور آپ کو الوداع کہنے آئی ہوں۔ پو پھٹ رہی ہے اور آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ یہ عبادت اور بندگی کا کتنا پُر تاثیر وقت ہوتا ہے آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے آپ تو "الصلوٰۃ خیر من النوم" کی مجسم تفسیر ہیں" یہ کہہ کر ناہید نے خود روشنی گل کر دی اور سوا ناہید کے ہر چیز پر ایک ہلکی سی نیستی طاری ہو گئی۔

ناہید مجھ سے لگ کر بیٹھ گئی اور میں نے اس کے پاؤں چھو کر اپنے ہاتھ چوم لئے۔ ناہید نے میرے دونوں ہاتھ تھام کر کہا "رمزی صاحب آج جی بھر کر اپنے خروشِ ناہید پرستی کو آسودہ کر لیجئے"

میں کرسی سے اُتر کر نیچے بیٹھ گیا اور چاہتا تھا کہ اس کے قدموں پر سر رکھ دوں لیکن اس نے میرا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا اور میری پیشانی، میرے بال، میری آنکھیں پاگلوں کی طرح چومنے لگی۔ اب مجھ سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور میں نے دیوانہ وار اس کے ہونٹ چوم لئے۔

ناہید نے مجھے اُٹھا کر اپنی بغل میں بٹھا لیا اور میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر مجھ سے لپٹ گئی۔ کچھ دیر ہم اسی فردوسی عالم میں رہے اس کے بعد ناہید نے کہا "رمزی صاحب میرا دل دھڑک رہا ہے خدا کے لئے مجھے بتا دیجئے میرے چلے جانے کے بعد آپ کیسے رہیں گے؟ دیکھئے اب ہم ایک دوسرے سے شاید ہی پھر کبھی مل سکیں۔ ہمارے درمیان خط کتابت بھی نہیں ہو سکتی اور اگر ہو بھی تو اس سے کیا فائدہ؟

آپ کا یہ سودا ایسا نہیں جو اس قسم کی جھوٹی باتوں سے تسکین پا سکے۔ پھر آپ کیا کریں گے؟ دو مہینے سے آپ کی جو حالت ہے اس کو دیکھ کر میرے دل میں طرح طرح کے وہم آ رہے ہیں

اور میں تھوڑا بہت اندازہ کر سکتی ہوں کہ اب اس کے بعد آپ کا کیا حال ہوگا۔ لیکن میرے رمزی صاحب آپ مجھ سے وعدہ کیجئے اور پھر اس وعدے کا خیال رکھئے کہ آپ اپنے اوپر کوئی تشدد نہیں کریں گے اور ضبط و تحمل کے ساتھ زندگی کے باقی دن گزاریں گے مجھ کو اور زینب کو ابھی آپ کی زندگی سے کچھ اُمیدیں ہیں جن کو پورا کرنا آپ کا فرض ہے۔"

میں نے دیکھا کہ ناہید فکرمند اور پریشان ہے اس لئے جلدی سے ایک مبہم وعدہ کر دیا اور اس کو اطمینان دلا دیا کہ میں کوئی نامعقول حرکت نہیں کروں گا۔ اور جیسے اب تک زندہ رہا اب بھی رہوں گا۔

پانچ بجے کے قریب میں نے ناہید کو آخری بار گلے لگا لیا۔ ناہید نے مجھے اس طرح بھینچ کر لپٹا یا جیسے میری ساری ہستی پر ہمیشہ کے لئے اپنا نقش چھوڑ جانا چاہتی ہو.... اور پھر اس کے بعد؟ میرے اور ناہید کے درمیان ایک اتھاہ تاریکی ایک بڑی خلا حائل ہو گئی...... —

دو تین دن تک تو میرے حواس کام نہ دے سکے اور میں بیماری کا بہانہ کر کے مدرسے سے چھٹی لئے رہا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ سب.. کیا ہوا؟ میں کہاں ہوں؟ ناہید کون تھی؟ کب آئی تھی اور کب گئی؟ کیا میں پھر خواب دیکھنے لگا تھا جس سے اب بیدار ہو رہا ہوں؟ لیکن نہیں! اُس کا دیا ہوا رومال سامنے میز پر پڑا ہوا تھا اور اس کی مہک میرے کمرے میں اب تک پھیلی ہوئی تھی اور پھر اگر میں نے خواب دیکھا تھا تو سارے ہوٹل نے تو نہیں خواب دیکھا تھا۔ ہوٹل والے بھی ناہید کو کسی نہ کسی بہانے سے یاد کرتے رہتے تھے۔ میرا سر چکرا رہا تھا اور دماغ میں کوئی بات بیٹھ نہیں رہی تھی۔ یکایک میرے دل میں ایک خیال آیا اور میرے اندر ایک نئی تحریک پیدا ہو گئی یہ ایک بالکل نیا جذبہ تھا جس کا اس سے پہلے مجھے کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس زمانے میں بھی نہیں جبکہ دن رات اپنے عالم رویا میں رہتا تھا اور نہ اس زمانے میں جو میری زندگی کا خالص جمالیاتی دَور تھا جبکہ میری تخلیقی قوت عروج پر تھی۔ مجھے اس سے پہلے ناہید کی تصویر کھینچنے کا کبھی خیال نہیں آیا تھا۔ نہ الفاظ میں نہ خطوط والوان میں —

آج مجھے آن کی آن میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب جب تک میں ناہید کی طرح ایک قدآدم تصویر نہ بنا لوں نہ مجھے چین ملے گا اور نہ میری زندگی سپھل ہو گی۔ یہ دُھن مجھ پر اس طرح مسلط ہوئی کہ میں فوراً جا کر مصوری کا پورا سامان خرید لایا اور سر شام ہی سے تصویر کھینچنے بیٹھ گیا.........

اور آج تین سال سے میں اپنی فرصت کا ایک ایک لمحہ اور اپنی زندگی کی ساری قوت ناہید کا نقش اتارنے میں صرف کر رہا ہوں۔ میرے قلم نے کیا کیا کمالات نہیں دکھائے! لیکن ناہید کو نہ پیدا کر سکا۔ اُف! اتنے عرصے میں میں نے کتنی صورتیں بنائیں اور بگاڑ دیں! مگر وہ شاہکار نہ پیدا کر سکا جس کو میں اپنا "حاصل عمر" سمجھتا۔

کوئی میرے اندر کے کمرے میں آئے اور دیکھے کہ ایک کونے میں قدآدم آئینے کے قسم کی ایک چیز دیوار سے لگی ہوئی کھڑی ہے جس پر ایک پردہ پڑا ہوا ہے یہ وہی ناہید ہے جس کو میں لکیروں اور رنگوں میں قید کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس کو چھپائے رہتا ہوں تاکہ میرے سوا کسی دوسرے کی نگاہ نہ پڑے! ناہید میرے قلم کی گرفت میں آ آ کر نکل جاتی ہے۔ جب

تصویر مکمل ہو چکی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اب اپنی مُراد پا گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ ناہید مجھے دھوکا دے کر دُور جا کر کھڑی ہوئی ہے اور تصویر کو دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ تصویر میں سب کچھ ٹھیک بنائے جاتا ہوں لیکن اس کے چہرے کو جب دیکھتا ہوں تو اس میں ایک کمی پاتا ہوں۔ ناہید کا ہر چیز کا ہو بہو نقشہ اُتر جاتا ہے لیکن اس کے چہرے میں ایک گمبھ[illegible] فضائی کیفیت ہے جو تصویر میں کسی طرح ظاہر نہیں ہو پاتی۔ اس کی [illegible] ماورائی تناسب اس کی آنکھوں کی وہ گہری معنویت اس کے ہونٹوں کا وہ پُراسرار تموج۔ یہ کیفیتیں تصویر کے چہرے میں کسی طرح منتقل نہیں ہوتیں۔ اور میں بنی بنائی تصویر قلمزد کر دیتا ہوں۔

تین سال سے میرے جنوں کی پرستش جاری ہے۔ میرے قلب و روح کا سا[illegible]ت کھنچ کر اسی میں صرف ہو چکا ہے۔ میری ساری ہستی گھ[illegible] مٹنے کے قریب آگئی ہے۔ مگر ابھی وہی پہلا دن ہے یا اللہ! اتنے دنوں سے کیسی مشقت کر رہا ہوں۔ جسم، قلب، دماغ، روح سب تھک کر بیکار ہو گئے اور حاصل کچھ نہیں سوا اس کے کہ اب محض زندہ رہنے کی قابلیت بھی مجھ سے رخصت ہو رہی ہے ....!

کوئی دو ہفتے تک میری سرگرمی اور میرے انہماک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن ایک رات کو خلافِ معمول پچھلے پہر کے قریب میری آنکھ جھپک گئی اور میں نے خواب دیکھا کہ ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہے اور ایک جنازہ قبرستان کی طرف جا رہا ہے میں نہ جانے کیوں بےچین ہو گیا اور بے اختیار بھیڑ کے ساتھ ہو لیا۔ جب جنازہ اپنی منزل پر پہنچا۔ اور لوگ اس کو قبر میں اُتارنے لگے تو میں وحشیوں کی طرح بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا اس کے قریب پہنچ گیا اور لوگ لاکھ مجھے پکڑ کر کھینچتے رہے میں نے زبردستی چہرے سے کفن سرکا دیا۔ یہ تو ناہید تھی! میں چلانے لگا "خدا کے لئے یہ کیا کر رہے ہو! ناہید مری نہیں ہے زندہ ہے!" لوگوں نے مجھے پاگل سمجھا اور دھکا دے کر ہٹانے لگے لیکن وہ مجھے روک نہ سکے اِدھر انھوں نے ناہید کا جنازہ اتارا اُدھر میں قبر میں کود پڑا اور ناہید کو اپنی آغوش میں لے کر لیٹ رہا لوگ مٹی ڈالنے لگے۔ میں ناہید کے ساتھ بالکل مٹی سے ڈھک گیا میں اب سانس نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے چلانا چاہا لیکن میری آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی آخر میرا دم اتنا گھٹا کہ آنکھ کھل گئی..... !

اس خواب نے میری رہی سہی تاب چھین لی۔ اب میں تصویر کے سامنے گھنٹوں قلم لئے بیٹھا رہتا مگر اس میں ایک لکیر بھی گھٹا بڑھا نہیں سکتا تھا جیسے کلاکاری کی قوت ہی مجھ سے سلب کر لی گئی ہو۔

اسی کے دو تین روز بعد بالکل خلاف توقع حسام الدین کا ایک مختصر خط ملا جس سے معلوم ہوا کہ دو تین روز ہوئے ناہید اس دنیا سے چل بسی اور مرتے وقت وصیت کر گئی ہے کہ مجھے اس کی موت کی خبر پہنچا دی جائے اس کے جس مرض کو ڈاکٹر معمولی نسوانی شکایت سمجھتے تھے اور کوئی خاص اہمیت نہیں دے رہے تھے وہ آخر کار معدے کا دِق نکلا اور چارہ گروں کو اس کا صحیح علم اس وقت ہوا جب مرض لاعلاج حد تک بڑھ گیا اور کسی کے کئے کچھ نہ ہو سکا۔

ڈاکٹروں نے آخر کار عاجز ہو کر صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میرے دماغ میں فتور آگیا ہے اور میں عنقریب پاگل ہو جاؤں گا۔ یہ دن رات کا جاگنا اور بےچین رہنا اسی کی علامت ہے مجھے دوسروں کی رائے کی کوئی پروا نہ ہوتی مگر خود میرے اندر سے ایک آواز پکار پکار یہی کہہ رہی ہے۔

دل کوئی دم میں خون ہووے گا
آج کل میں جنوں ہووے گا

اور ایسوں کا یہی حشر ہونا بھی چاہیئے۔ جب تخیل اور واقعہ خواب اور بیداری کے درمیان ایسی زمین آسمان کی بیگانگی ہو تو یہی ہوتا ہے۔

دنیا مجھے ایک قابل رشک ادیب اور ایک کامیاب معلم سمجھتی ہے میں ان خوش نصیبوں میں گنا جاتا ہوں جن کے نام جریدۂ عالم پر ہمیشہ ثبت رہیں گے لیکن مجھے اس سے کیا! میں جانتا ہوں کہ میں کیسا نامراد ہوں۔ یہ دنیا کی بے حسی ہے کہ اس نے میری زندگی کو اچھی طرح جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی میرا ایک خواب تھا جو بے تعبیر نکلا۔ میری ایک تخیل تھی جو بغیر پوری ہوئے مٹ رہی ہے میرے اندر ایک شاہکار تھا جو وجود میں نہ آسکا۔ اُف! ظاہر اور باطن میں کتنا فرق ہوتا ہے! جو زندگی میرے لئے ایک مستقل صلیب رہی ہے اس کو دنیا کامیاب کہتی ہے اور اس پر رشک کرتی ہے! ظاہر اور باطن میں جب یہ تصادم ہو تو اس کا لازمی نتیجہ جنون ہے۔

لیکن نہیں! میں اس کی نوبت ہی کیوں آنے دوں! وہ تیسری صورت کیوں نہ ہو جس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں؟ میرے اندر اگر جینے کی طاقت نہیں ہے تو مرنے کی طاقت تو ہے! یہ بھی ایک طاقت ہوتی ہے۔ میرے ارادے اور عمل کی قوت ابھی اس حد تک ضائع نہیں ہوئی ہے کہ مر بھی نہ سکوں۔

کسی کو خبر نہ ہو سکی اور میں بندوق چرا لایا۔ اب میں یہ حسرت نامہ لئے ہوئے اندر کے کمرے میں جاتا ہوں اور اس "آشنائے ناآشنا" پر ایک آخری نظر ڈالنا چاہتا ہوں جس کو کبھی پیدا نہ کر سکا ....

میں نے تصویر سے پردہ ہٹایا تو ایک لمحے کے لئے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ تصویر تو مکمل ہے اور میں نے ناہید کی ہو بہو شبیہ اتار دی ہے۔ پیشانی کا وہی ماورائی تناسب آنکھوں کی وہی بھرپور معنویت، ہونٹوں کا وہی پُراسرار تموّج! میں اپنے ارادے سے باز آنے والا تھا۔ میرے دل میں جینے کا ایک حوصلہ پیدا ہو گیا تھا جو اس سے پہلے کبھی نہیں پیدا ہوا تھا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں ناہید میرے سامنے سے غائب ہو گئی۔ تصویر پھر وہی بے حالی اور نامرادی کا مرقع ہے اور مجھے منہ چڑا رہی ہے۔

ناہید! میری زندگی کی مہم آخر کار سر ہو رہی ہے فتح قریب ہے! میرا فنکار ہاتھ اپنا آخری کمال دکھا رہا ہے میں تیری تصویر اتارنے کی آخری کوشش کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اب کے میں کامیاب ہوں گا۔ میں اب اسی دوسرے عالم میں آ رہا ہوں جہاں کی ساری بہار تیرے دم سے ہے ...... ! ناہید! میری دیوی! میں نے آخر کار تیری پیشانی کے ماورائی تناسب تیری آنکھوں کی گہری معنویت، تیرے ہونٹوں کے پُراسرار تموج کا راز پا لیا ..... !!

اعتذار

حضرت مجنوں گورکھپوری کا کمال فن "یاد ایام" اس مرتبہ نہیں دیا جاسکا امید ہے کہ قارئین "تنویر" ہمیں معاف کر دیں گے۔ خاص کر اس لئے کہ اُن کا تازہ شاہکار "نقش ناہید" اس کی تلافی کرے گا۔ —— یاد ایام کی ڈبل قسط —— دسمبر کی اشاعت میں شائع ہوگی —— (ادارہ)

علَمِ آزادی

رشحاتِ خامہ حضرت وش صدیقی مدظلہ

آؤ! لہرائیں شجاعو! علَمِ آزادی

پیکرِ خاک کی عظمت ہے تو آزادی ہے
جاوداں گر کوئی دولت ہے تو آزادی ہے
ابن آدم کی وراثت ہے تو آزادی ہے
دہر میں گر کوئی جنت ہے تو آزادی ہے

عشرتِ زیست ہے زیرِ قدمِ آزادی

عرش پیما، قدمِ خاک نشیں ہے اِس سے
جاوداں ہر نفسِ اہلِ یقیں ہے اِس سے
ذرہ، ہم قسمتِ خورشید مبیں ہے اِس سے
سلطنت بخش درم نانِ جویں ہے اِس سے

فضلِ یزداں سے سحابِ کرمِ آزادی

منزلِ صبر و رضا منزلِ آزادی سے
محفلِ صدق و صفا، محفلِ آزادی سے
خدمتِ خلقِ خدا، حاصلِ آزادی سے
دل جو بے سوز ہے، ناقابلِ آزادی سے

شعلۂ عشق ہے شمعِ حرمِ آزادی

سوزِ ایثار و حمیت کی قسم ہے تم کو!
آتشِ جذبۂ غیرت کی قسم ہے تم کو!
شعلۂ برقِ شجاعت کی قسم ہے تم کو!
خونِ مشرق کی حرارت کی قسم ہے تم کو!

نوجوانو! نہ جھکے اب علَمِ آزادی

حُرّیت ، اور اخوت کا زمانہ آئے
اب غریبوں کی حکومت کا زمانہ آئے
روحِ انساں کی جلالت کا زمانہ آئے
ظُلم مٹ جائے محبت کا زمانہ آئے

دلِ ہر فرد ہو اب محتشمِ آزادی

سرخوشی زینتِ کاشانۂ مزدور ہو پھر
زندگی جرعہ کشِ عشرتِ مسرور ہو پھر
دُور، ہر لعنتِ سرمایۂ مغرور ہو پھر
پرفشاں پرچمِ آزادیٔ جمہور ہو پھر

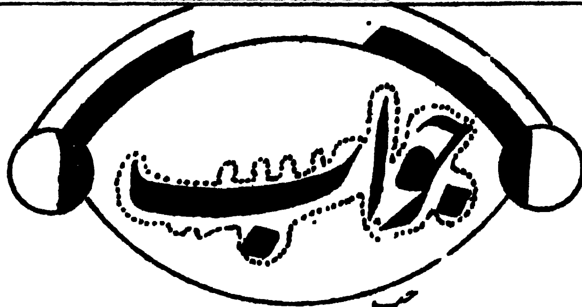
عام ہو خلق میں فیضِ اُممِ آزادی

یا خدا واسطۂ چاکِ گریبانِ وطن،
یا خدا واسطۂ سوزِ جوانانِ وطن،
یا خدا واسطۂ دردِ غریبانِ وطن،
یا خدا واسطۂ خونِ شہیدانِ وطن،

قسمتِ ہند ہو تیغ و عَلَمِ آزادی

قصرِ سرمایہ و بازارِ غلامی برباد !
صحن و بام و در و دیوارِ غلامی برباد !
طوق و زنجیرِ گراں بارِ غلامی برباد !
ظلمتِ غاشیہ بردارِ غلامی برباد !

ضوفشاں باد جلال و حشمِ آزادی !



(از جناب سراج احمد صاحب علوی ایم - اے - بی - ٹی)

اگر غریب نسرین مذہب اور سماج کے خلاف دو روحوں کی محبت اور ہوسناکیوں کے نتائج کی صورت میں پیدا ہوئی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا!

شاید اسی کمی کی تلافی اور سماجی "پاپ" کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے قدرت نے اسے حسن ظاہری کا زیادہ حصہ عطا کیا تھا۔ اونچا قد خوبصورت توانا اور متناسب اعضا گول سیمیں باہیں اور گلا جو معلوم ہوتا تھا کسی ہوشیار صناع نے ہاتھی دانت سے گڑھے ہیں سب مل کر اس میں ایک ملکوتی اور ماورائے انسانی حسن پیدا کر رہے تھے اس کی پیاری پیاری کالی چمکتی آنکھیں جن کے اوپر بھنویں ابرو سایہ کئے ہوئے تھے اس کے جذباتی کشمکش کی آئینہ دار تھیں ان کا انداز یہ بتاتا تھا کہ اس کی روح سماج کی اس زیادتی اور سخت گیری پر آمادہ جنگ ہے جو اس کی پیدائش سے متعلق ہے لیکن شیدا کے لئے ان آنکھوں میں در صدہا پیغام پنہاں تھے!

شیدا رشتہ میں نسرین کا دور کا بھائی ہوتا تھا اور دونوں قریب قریب ہمسن بھی تھے! ابتدائی تعلیم دونوں نے ایک ساتھ ایک ہی مدرسہ میں پائی تھی، جب اسکول کی تعلیم ختم کر کے شیدا ڈاکٹری تعلیم کے لئے چلا گیا اس وقت پہلی بار دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

خاندان بھر میں صرف شیدا ایسا تھا جسے نسرین کے ساتھ کچھ ہمدردی تھی۔ وہ علانیہ سماج کی اس بے رحمی اور ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا کرتا تھا جو نرگس کی پیدائش سے متعلق تھا غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی گرد و پیش کی تہذیب اور سماجی ماحول سے سخت متنفر تھا۔ لوگ اسے جھکی اور متلون مزاج کہہ کر اس کی دور اندیشی اور مفکر فطرت کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔

لیکن جب کبھی نسرین کو اس سے کسی مسئلہ پر گفتگو کرنے کی نوبت آتی تو وہ اس کی نظر میں ایک بڑا مفکر اور غیر معمولی دل و دماغ کا انسان نظر آتا تھا کیا وہ شیدا سے محبت کرتی تھی؟ شیدا کو اس کی خبر نہ تھی! اس کے مافی الضمیر سے شیدا اس وقت آگاہی ہوئی جب کہ وہ نسرین کو ایک دن جھیل دکھانے لے گیا۔ اور چاندنی رات میں کشتی چلاتے ہوئے نسرین نے دھیمی آواز میں محبت کا اقرار کیا،

شیدا کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

"نسرین تمہیں معلوم ہے کہ میں تم کو کس قدر چاہتا ہوں"!

"شیدا نے کہا "مگر!"

"کہنے کی ضرورت نہیں ہے میں خوب سمجھتی ہوں"

نسرین نے بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے اپنی پیدائشی حیثیت نہیں بھولنا چاہئے"!

"نسرین۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو، یہ سب تمہاری غلط" وہ چاہتا تھا کہ جو اس کے دل میں ہے۔ سب نسرین سے کہہ دے!

"شیدا کہنے کی ضرورت نہیں ہے" نسرین نے اس

اندازسے کہا گویا وہ شیدا کو کسی پریشانی میں نہیں رکھنا چاہتی اور اس کشمکش سے نجات دلانا چاہتی ہے "میرے لئے اس قدر جان لینا کافی ہے کہ تم میرے نہیں ہو سکتے"!

اس نے کشتی کنارے کی طرف گھمائی - شیدا عالم حیرت میں اسے دیکھ رہا تھا اسے تعجب یہ تھا کہ نسرین کے دل میں اس کی محبت کیوں پیدا ہو گئی، غالباً اسے نسرین سے یہ کہنے میں ذرا تامل نہ ہوتا کہ اس کی ہمدردی کے یہ معنی نہیں تھے کہ وہ اس کی نسبی کمزوری کو بھی نظر انداز کر دے گا - بفرض محال وہ اس حقیقت کو نظر انداز بھی کر دیتا تو بھی وہ اس کی ہم خیال نہ تھی اور مزاجوں میں بھی یکسانیت نہیں تھی۔

"نسرین کی عجیب ذہنیت نے اس کو اس تشریح کا موقعہ نہ دیا - نسرین عجیب و غریب ذہنیت کی عورت تھی۔

—(۲)—

اس واقعہ کے چار سال بعد ایک شام کو شیدا نہایت تیزی سے گھر جانے کے لئے اسباب باندھ رہا تھا وہ میڈیکل کالج کے چھ سال ختم کر کے گھر جا رہا تھا، یکایک اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ نسرین سے جو اب نئی زندگی میں داخل ہو چکی تھی چند گھنٹے راستے میں رُک کر ملتا جائے'۔ غالباً تین سال ہوئے جب یکایک نسرین نے احمد پور کے ایک مسن ڈاکٹر سے شادی کر کے تمام قصبے کو حیرت میں ڈال دیا تھا، ڈاکٹر کی اور اس کی عمر میں زمین آسمان کا فرق تھا، البتہ ڈاکٹر کے تموّل کے متعلق بہت چرچے تھے - شیدا کے لبوں پر اس خیال سے مسکراہٹ آئی کہ وہ اس نسرین سے ملنے جا رہا جو محبت اور رومان کو زندگی سے زیادہ بیش قیمت سمجھنے کی دعویدار تھی اور آج اپنے دادا کے عمر کے ڈاکٹر کی شریک حیات بنی ہوئی ہے ...."

شیدا کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اس لئے کہ نسرین میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی تھی - سوائے اس کے کہ وہ اب پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی تھی -

ڈاکٹر اگرچہ عمر میں اس سے بہت بڑا تھا لیکن اپنے قویٰ کے لحاظ سے کچھ ایسا زیادہ سن رسیدہ نظر نہیں آتا تھا -

شام کو جب ڈاکٹر کی لائبریری میں چائے نوشی کا انتظام ہوا - شیدا کی زندگی کا سب سے زیادہ دلفریب اور پر استعجاب واقعہ پیش آیا - ایک الماری کے پاس سے ایک حسینہ اور نازک اندام لڑکی شرمیلی انداز سے چائے کی میز کی طرف آہستہ آہستہ آئی شیدا کو اس حور آسمانی کو زمین پر دیکھنے کا شائبہ وگمان بھی نہ تھا اس کی عمر کا اندازہ اس کے قد و قامت سے ناممکن تھا سولہ یا اٹھارہ سال، ڈالی پر کھلے ہوئے سفید پھول کی طرح نازک، خوش رنگ اور دلآویز حسینہ، غزال کوہی کی طرح آہستہ آہستہ آ رہی تھی اس کی ندمہ بھری کالی کالی آنکھیں چشم آہو سے زیادہ حیات آفریں اور محبت افروز تھیں!

شیدا نے جو معیار حُسن اپنے دل میں بنا رکھا تھا وہ اس کے بالکل مطابق تھی - مگر اسے یہ اُمید نہ تھی کہ بیداری تو بیداری خواب میں بھی ایسی صورت نظر آئے گی

حسینہ نے اپنی سیاہ آنکھوں کے لبریز کا نذری جام جھکائے پلکوں میں ہلکی ہلکی ارتعاشی کیفیت تھی اس نے نگاہ بھر کے شیدا کی طرف دیکھا جس کا جواب ایک محبت بھری نگاہ سے ملا۔

بیک وقت دونوں نے محسوس کیا کہ قدرت نے ان دونوں کو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کا مقید کر دیا۔

نسرین بھی اس حقیقت کو بھانپ گئی:

"شیدا یہ ڈاکٹر صاحب کی لڑکی لیلیٰ ہے جو ان کی پہلی بی بی سے ہے

اور یہ میرے بھائی ہیں لیلیٰ" اس مختصر سے تعارف کے بعد وہ دونوں کو چھوڑ کر چلی گئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد جب وہ پھر لوٹ کر آئی تو اُس نے دونوں کو اسی طرح نئی محبت کی روانی سے سرشار پایا۔ ایک طعن آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہا "غریب چائے کی خبر لے لی ہوتی جو دیر سے ٹھنڈی ہو رہی ہے"۔ یہ کہہ کر وہ پھر وہاں سے غائب ہو گئی!

ادھر شیدا اور لیلیٰ اپنی باتوں میں مگن دنیا و مافیہا کو بھولے بیٹھے تھے اُدھر دوسرے کمرے میں ڈاکٹر اور اس کی بیوی مصروف گفتگو تھے۔

شیدا نے کئی بار اپنا اور لیلیٰ کا نام دوران گفتگو میں سُنا وہ کیا گفتگو کر رہے تھے؟ کیا یہ ممکن تھا؟ شیدا دل میں بیچین ہو رہا تھا۔ کیا اس کا خواب صحیح ہو سکتا ہے؟

رات کو کھانے کے بعد شیدا کو یہ معلوم ہوا کہ کبھی کبھی ناممکن اور محال باتیں بھی حیرت انگیز طور پر ممکن ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر ایک ذہین شخص تھا۔ وہ ذہین اور فہیم دماغ والوں کی قدر کرتا تھا۔ اس کی نظر میں نسبی اور سماجی پستی اور بلندی کی چنداں اہمیت نہ تھی۔ وہ شیدا کے ساتھ لیلیٰ کو منسوب کرنے کے لئے تیار تھا اور اس پر بھی تیار تھا کہ شادی کے بعد شیدا کو مزید تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیج دے گا۔ خوش قسمتی اس کا کیسا ساتھ دے رہی تھی!! وہ کیسی مُبارک ساعت تھی جب اس نے نسرین سے ملنے کا ارادہ کیا تھا! وہی عورت جس کی شرمندگی اور عاجزی سے لطف اٹھانے آیا تھا کس طرح یکایک اس کے لئے فرشتۂ رحمت بن گئی۔ کیا وہ کبھی اس کے اس احسان سے عہدہ برا ہو سکے گا ———— شیدا یہ خیالات لئے گھر لوٹا۔

———— ✻ ————

اس نے لیلیٰ کو پہلا خط بھیجا۔ اس کا جواب بھی آگیا۔ اس نے بار بار اسے پڑھا۔ ہر ہر لفظ پر غور کرتا رہا وہ خط ہاتھ میں لئے تعجب کے خاموش درخت کے کنجوں میں گھومتا اور ان کی شاخوں پر چہچہانے والی چڑیوں اور خوشبودار پھولوں سے سوال کرتا کہ کیا انھیں بھی اس کی سی خوشی نصیب ہے!

لیکن ایک ہفتہ کے بعد جب اس کے کئی خطوں کا کوئی جواب نہ ملا تو شیدا بہت گھبرایا۔ اس نے نہایت حسرت و یاس کے عالم میں لیلیٰ کو ایک خط لکھا۔ جس کے جواب میں اسے ڈاکٹر کی یہ تحریر ملی۔

"میں یہ چند سطریں اس غرض سے لکھ رہا ہوں کہ تم کو معلوم ہو جائے کہ میں نے چند در چند اسباب کی بناء پر اپنا ارادہ بدل دیا اور تم کو مطلع کرتا ہوں کہ آئندہ سے لیلیٰ کو خط نہ لکھنا۔ میں کسی حالت میں بھی تمھارے ساتھ اس کی وابستگی پسند نہیں کروں گا"

پھول جو اس کی مسرت دیکھ کر کھِل پڑتے تھے درخت جو چند روز پہلے اس کے ہیجان سے متاثر ہو کر اس کے کانوں میں از دارانہ پیغامات کہا کرتے تھے آج اس پر خندہ زن اور آوازے کستے نظر آرہے تھے۔ وہ اب بھی درختوں کے نیچے گھوما کرتا تھا لیکن ایک بے چین اور مصیبت زدہ روح کی طرح انسان قسمت کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے! اس نے نسرین کو کئی خط لکھے کہ اس انقلاب کا سبب بتائے لیکن اس کا جواب نسرین نے صرف یہ دیا کہ ایک ماہ بعد جب وہ اپنی ماں کو دیکھنے آئے گی اس وقت اس کا سبب بتائے گی۔

تیس دنوں کی طویل مدت، انتظار کی ناقابل برداشت گھڑیاں خدا خدا کر کے ختم ہوئیں

نسرین ایک مغرور اور فاتح ملکہ کی طرح نہایت زرق برق

لباس میں جواہرات سے لدی ہوئی آئی، اس نے ایک بار پھر اسی جھیل
کی سیر کرنے کی خواہش ظاہر کی، وہ پتوار ہاتھ میں لے کر کشتی کو کھے رہی
تھی۔ شیدا موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار اس کے سامنے بیٹھا تھا
"شیدا تم کیسے ہو،" نسرین نے یکبارگی پوچھا۔
"کس قدر مہمل سوال ہے؟" شیدا نے اپنے خیالات کی رَو سے
نکلتے ہوئے سوچا اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا "نسرین میں سخت
مصیبت میں ہوں"۔
"ایک نرم نرم گالوں اور چمکتی آنکھوں والی معمولی لڑکی نے تمہارے
ایسے آدمی کو اتنی جلد حال سے بے حال کر دیا؟"
"نسرین! آہ میں اس سے محبت کرتا ہوں!" اس نے نسرین کے
طنز کو محسوس نہ کرتے ہوئے کہا "آخر ڈاکٹر کو کیا اعتراض ہے۔"
"انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے بجز اس کے جو میں نے ان کے
سامنے پیش کیا" نسرین نے سرد مہری سے کہا
"تو تمہیں اعتراض ہے!" اس کے منہ سے تعجب اور شکایت ملی
ہوئی چیخ نکلی۔
"اور تمہیں تعجب ہے!" نسرین نے پتوار کشتی میں رکھتے ہوئے پوچھا،
وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بازو زور سے دبائے،
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک غمزدہ ملکہ اپنی حیات کی المیہ پر تسلط حاصل کر رہی
ہو، اس نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا ــــ
"کیا تمہارا یہ خیال تھا کہ ایک عورت انتقام نہیں لے سکتی، میرے اچھے
شیدا، سنو، اسی جھیل پر آج سے چار سال پہلے میں نے ایک عورت کا سب سے
بیش بہا تحفہ تم کو پیش کیا ــ یعنی دل ــ لیکن تم جو روحانی عظمت کے
دعویدار تھے۔ تم نے اسے شہرت، عزت، نسب اور دولت کی ترازو پر تولا!
تم نے میرا تحفہ ٹھکرا دیا ــ تم میری زندگی سے دور ہو گئے ــ تم میرے پاس
کیوں واپس آئے؟ کیا تم یہ دیکھنے آئے تھے کہ میرا شوہر ایک بدمعاش ہے اور
میں نے اس سے دولت کے لئے شادی کی، تو میرے نزدیک محبت کا پھول ایک بار اور صرف
ایک بار پھولتا ہے ــ ہو سکتا ہے کہ انتقام کی دیوی نے تمہیں میرے پاس بھیج دیا ہو!
جب میں نے تم کو لیلیٰ کی شرابِ حسن سے لطف اٹھاتے دیکھا اور اسے تمہارا پرستار
پایا۔ میں نے اپنے شوہر کو جو میرے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتا ہے اس بات پر اکسایا
کہ وہ لیلیٰ کو تمہارے ساتھ منسوب کردے، وہ اپنی زیرکی و ذہانت پر بہت نازاں ہے اور
اسی قسم کے خبط کے گرفتاروں کی [illegible] حماقت بھی ہے، میں نے جعلی خط حاصل کئے، جو بظاہر
تمہارے چال چلن کے متعلق میرے خطوط کے جواب تھے۔ شیدا ان میں سے بعض خط
دیکھو تو تمہیں حیرت ہوگی۔ یہ خطوط میں نے اپنے شوہر کو دکھلائے ان میں تم دنیا میں
سب سے زیادہ سیہ کار اور آوارہ نظر آئے گے اور اس نے میرا بہت شکریہ ادا کیا
کہ میں نے اس کی لڑکی کو بڑے خطرے سے بچا لیا اور تم کو وہ عبرتناک خط نصیب ہوا۔
اس نے فاتحانہ انداز میں ایک لمبی سانس لی، کچھ ٹھہر کر اور ایک زہر خند
کے بعد بولی "شیدا! یہ ہے انتقام ہے ــ ایک عورت کا انتقام، جسے
تم نے ٹھکرا دیا ـــــ۔"
طویل خاموشی چھا گئی جسکو شیدا کے مختصر سوال نے توڑا "لیکن غریب
لیلیٰ نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"
"ہوں! یہ اس کی تقدیر ہے جیسی میری اور تمہاری ہے" اس نے بیباکانہ
اور غیر متاسفانہ انداز میں کہا "اس آدمی کو دیکھو" اس نے ایک نیم برہنہ وحشی
مچھلی والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "قسمت اس کے مانند ہے، جو جال
کے ہوشیاری سے پھینکنے کے مانند کیا تم کہہ سکتے ہو کہ جو مچھلیاں جال میں پھنس جاتی ہیں مچھلیوں
کے مقابلے میں جو بچ کر نکل جاتی ہیں۔ زیادہ خراب یاداشت کی مستحق ہیں؟
کشتی دھارے پر بہتی چلی جا رہی تھی اور ہیبتناک خاموشی میں
شیدا اپنے دونوں [illegible] پانی کی چھپ چھپ کی آواز محسوس
کر رہا تھا۔

تجدید آرزو

شاعر کیف بار حضرت فراق گورکھپوری

کوئی نئی زمیں بھی، نیا آسماں بھی ہو
اے دل اب اس کے پاس چلیں وہ جہاں بھی ہو

افسردگیٔ عشق میں سوزِ نہاں بھی ہو
یعنی بجھے دلوں سے کچھ اٹھتا دھواں بھی ہو

کب تک یہ اختلاط، یہ کب تک مغائرت
تو میرے اور اپنے کبھی درمیاں بھی ہو

مٹ جائے گی یہ کاوشِ ہجر و وصال بھی
میرا کہیں پتہ کہیں تیرا نشاں بھی ہو

اس کی جفا پیامِ غمِ جاوداں نہیں
اے عشق نا امید کبھی شادماں بھی ہو

ہم اپنے غمگسارِ محبت نہ ہو سکے
تم تو ہمارے حال پہ کچھ مہرباں بھی ہو

تجھ کو سپردگی کی قسم، دل کے شوق پر
گر اعتماد ہے تو کبھی بدگماں بھی ہو

یوں کھو کہ تجھ کو لوگ کہیں وشناسِ خلق
تنہا جنونِ عشق ہو اک کارواں بھی ہو

بزمِ تصورات میں اے دوست یاد آ
اس محفلِ نشاط میں غم کا سماں بھی ہو

صیاد اس اسیر سے سن نغمۂ نشاط
جو فصلِ گل کی جان ہو رشکِ خزاں بھی ہو

عرفاں کی منزلیں ابد و لامکاں سہی
کچھ واقفِ رموزِ زمان و مکاں بھی ہو

اکثر مٹا ہے عشق حجاباتِ ہوش میں
لازم نہیں کہ جیبِ جنوں دھجیاں بھی ہو

پہلے سے عشق نذرِ شکیب و قرار ہے
چشمِ کرم کے اٹھنے کا کوئی گماں بھی ہو

یوں ہی سا رنگ و بو کے کرشموں کو شوخ کر
کچھ بیقرار صحبتِ روحانیاں بھی ہو

محبوب وہ کہ جس سے شکایت سی ہو فراق
وہ عشق ہے کہ حسن سے کچھ بدگماں بھی ہو۔

لارڈ بائرن عالم برزخ میں

ہربرٹ ایولنبرگ کا ایک تصور

از محترمہ رضیہ بیگم صاحبہ

۹ ر دسمبر سنہ ۱۹۰۰ء کو سب سے پہلی ملعون روح جو جہنم کے دروازے پر نمودار ہوئی وہ ساتوی کے مصنف آسکر وائلڈ کی جہنمی روح تھی۔ دربان نے دروازہ کھولا اور اسے ایک خاص تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ "یہاں لوگوں سے ملنے کے اوقات کیا ہیں؟" اس نے اپنے محافظ فرشتے سے دریافت کیا۔ اور وہ یہ سنکر بہت متعجب ہوا کہ یہاں بھی ملاقات کے اوقات وہی ہیں جو عالم خاکی میں، یعنی دوپہر میں ۱۲ سے ایک تک اور شام میں ۵ بجے کے بعد......

دوزخی شاعر مسکرایا اور آخری سکہ جو اس کی جیب میں تھا فرشتہ کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا: "میں سب سے پہلے لارڈ بائرن سے ملنا چاہتا ہوں کیا وہ یہاں سے بہت دور رہتے ہیں؟"

"نہیں جناب" فرشتہ نے بڑی خوش اخلاقی سے جواب دیا "وہ یہیں اس گلی کے نکڑ پر رہتے ہیں۔ وہ موسیقی کے بہت شائق ہیں اور اسی لئے ان کو ایک جرمن قیام گاہ میں رکھا گیا ہے!"

اس کے بعد آسکر وائلڈ اپنے تاریک تہہ خانے میں داخل ہوا اور عذاب کے مقررہ گھنٹے ختم کرنے کے بعد لارڈ بائرن سے ملاقات کی تیاری شروع کی...... ہاتھ اور پیر کے ناخن بڑی احتیاط اور اہتمام سے کاٹے اور پھر انہیں بوٹ کی پالش سے رنگا۔ کیونکہ یہاں سے صرف یہی ایک پالش دی گئی تھی اس کے بعد غسل کیا ـــــ اگرچہ پانی بہت سرد تھا۔ پھر پورا ایک گھنٹہ نکٹائی باندھنے میں صرف کر دیا۔ یہاں اسے صرف یہی ایک چیز پہننے کو دی گئی تھی کیونکہ جہنم میں ہر شخص کو وہی کپڑا پہننے کو دیا جاتا ہے، جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے......!

ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر ٹھیک ۱۲ بجے وہ بائرن کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا!... تہہ خانے کے دروازے پر ایک سیاہ کارڈ نظر پڑا جس پر اس کا نام اسی کے خون سے لکھا ہوا تھا۔ چلتے وقت اس نے فرشتہ کی نظر بچا کر چپکے سے اسے نکال لیا..... راہ میں اسے کیرف ملا جو "کیربرس" کو اپنے ساتھ تفریح کے لئے جا رہا تھا۔ موخر الذکر پاگل سمجھا جاتا تھا اور ہمیشہ ایک زنجیر سے بندھا رہتا تھا۔ آسکر وائلڈ کیرف سے بائرن کا پتہ پوچھ کر تنگ و تاریک گلیوں سے گزرتا ہوا بالآخر اس کی قیام گاہ تک پہنچ گیا۔ لارڈ بائرن کا کمرہ دوسرے کمروں کے مقابلہ میں بہت وسیع اور کشادہ معلوم ہوتا تھا۔ اور اس میں ایک کھڑکی بھی تھی...... وائلڈ پہلے آہستہ آہستہ کھڑکی کے قریب گیا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں پہلے ہی سے کوئی اور ملاقاتی موجود تھا۔ اور اس نے فوراً پہچان لیا کہ وہ شیلی تھا.... اس کے سر پر صرف ایک زنانہ ہیٹ تھی...... اور بائرن نے اپنے بدنما پیروں کو چھپانے کی خاطر بڑے بڑے بوٹ پہن رکھے تھے حالانکہ اسے اس کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ وہ دونوں ایک آبنوسی میز کے کنارے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ شیلی خاموشی کے ساتھ ایک پائپ سے سرخ دھواں اڑا رہا تھا اور بائرن کے قریب ایک بڑی سی صراحی رکھی تھی جس سے وہ برابر شراب انڈیل انڈیل کر پی رہا تھا اور مسلسل گفتگو کر رہا تھا.....

آسکر وائلڈ نے ان کی صحبت میں شریک ہونا مناسب نہ سمجھا اس لئے وہیں کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کر ان کی گفتگو سننے لگا۔

بائرن کہہ رہا تھا "تم کو اختیار ہے پرسی، جو چاہے سو کہو، مگر میں تو

یہی کہوں گا کہ خدا کی اس وسیع مملکت میں سب سے زیادہ اُجڈ اور وحشی قوم انگریزوں کی ہے"۔ اس کی آواز کچھ بیٹھی ہوئی سی تھی۔ "یہ شیطان کی قسم، انھوں نے ہمیں تنادق کیا تھا کہ میں ان کے ملک کے مقابلہ میں اس جگہ کو جنت سمجھتا اگر صرف یہاں اتنی شدید گرمی نہ ہوتی.....؛ وہ ساری دنیا سے دولت و زر سمیٹ کر جمع کرتے ہیں اور اس کا مصرف ان کے پاس کیا ہے ؟ صابن بنانا، پوڈر تیار کرنا، نئے نئے خوشبودار غازے تیار کرنا، عمدہ سے عمدہ کپڑا مہیا کرنا، مشین ایجاد کرنا۔ سب انہیں پر ان کی ساری دولت صرف ہوتی ہے۔ اور اسی پر ان کی تہذیب و شائستگی کا انحصار ہے، صورت حالات کچھ اس قدر بدتر ہوگئی ہے کہ مجھے تو اب ان رومی اور یونانی لوگوں سے سامنا کرتے شرم آتی ہے۔ کل "اوڈ" کلب میں اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہہ رہا تھا کہ تمھاری قوم تو اب اس سے بھی زیادہ امیر ہوگئی ہے جتنی کہ کبھی ہماری تھی، مجھے فوراً مانچسٹر کا خیال آ گیا اور میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

سچ جانو دوست، دولت کی فراوانی نے ہمیں انتہا درجہ کا بداطوار اور ذلیل بنا دیا ہے اور ہم بہت تیزی کے ساتھ تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور آخر میں جو کچھ ہمارے پاس باقی رہے گا وہ غالباً صرف شکسپیر ہوگا جس طرح کہ کارتھیج میں صرف "ہنی بال" کا نام باقی ہے مگر اب تو ہمارے میں آرٹ کی بھی قدر و قیمت گھٹتی جاتی ہے۔ لندن میں اب مصوروں سے صرف گھر کی صفائی اور آرائش کا کام لیا جاتا ہے اور شاعر اخبار نویسی کی خدمت پر معمور نظر آتے ہیں، تمھیں یاد ہوگا جب میری پہلی نظم شائع ہوئی تو تمام طبقۂ اُمرا میرا مخالف ہوگیا۔ اور مجھے ایک ذلیل کُتا سمجھنے لگے اور جب میرا پہلا ڈرامہ طبع ہوا تو ڈیوک آف ڈیوان شائر نے مجھے نصیحت کی کہ تمھیں اپنی غیر فانی روح کا خیال رکھنا چاہیئے حالانکہ اسی دن جرمنی سے مجھے گوئٹے کا خط ملا کہ "تم سے خط و کتابت کرنا میرے لئے ایک ایسی عزت ہے جسکی مسرت کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا، اور مجھے یقین ہے کہ تمھارے ڈرامہ کی شکسپیر کے ملک میں بہت تعریف و توصیف ہوگی۔..."

مگر بیٹر اب ایسی چیزوں کی پروا کب کرتے ہیں" بائرن ایک لمحہ کے لئے اپنا گلاس بھرنے کے لئے رُکا۔ اور پھر یوں کہنا شروع کیا "مصنوعی دھوپ، جھوٹے رنگین کوٹ، غیر فطری برف کے گالے، اب تو ان چیزوں کی قدر ہوتی ہے، ایک بار یاد ہے جب ہیملیٹ "اسی نور" کی بالکونی پر نمودار ہوا تھا چاروں طرف برف گر رہی تھی"۔ چاندنی بہت ہی دھندلی تھی اور اس لمحہ اس کی شخصیت بہت زیادہ اثر انگیز ہوگئی تھی، لیکن کھیل کے اختتام پر لوگ بجائے ہیملیٹ کی تعریف کرنے کے مصنوعی برف کی تعریف میں رطب اللسان تھے ...... اور جب ایک دوسرے موقعہ پر شہزادہ کی نعش آکسیجن کی سُرخ اور نیلی روشنی میں ایک عجیب دردناک منظر پیش کر رہی تھی تو اس وقت کسی کے منہ سے بھی کوئی تعریفی لفظ نہ نکلا ہاں البتہ فضا میں شکسپیر کے تین بار قبر میں کروٹ لینے کی آواز سنائی دی......!

اب تمام کھیل صرف رسم و رواج اور صلاح کی خاطر لکھے جاتے ہیں، اور جو کوئی ڈراما لکھتا ہے اُسے خود دو سال تک اداکاروں کو سکھلانے کا کام بھی انجام دینا پڑتا ہے...... اب انگلستان کے تمام شعرا اور ادیب دھوکہ باز، مکار، اور فریبی ہوگئے ہیں، خوشامد، شیخی، غرور یہ ان کے مایۂ ناز اوصاف ہیں، جوا، تاش، یہ ان کے بہترین مشاغل ہیں اور یہ گندم نما جو فروش جو اس وقت کھڑکی کے باہر کھڑا ہے۔ انہیں میں سے ایک ہے جس نے بجائے اس کے کہ دنیا میں کوئی کام کرتا خود کو جیل میں بند کر کے اپنے کو ایک مجہول ہستی بنا دیا" یہ کہتے ہوئے لارڈ بائرن اپنی جگہ سے اٹھا اور زور سے لات مار کر دروازہ کھولا اور خوفزدہ اسکر وائلڈ کو ٹانگ پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا ..... "ڈرتے کیوں ہو دوست" اس نے پھر اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے کہا میں نے تو تمھیں اسی وقت پہچان لیا تھا جب تمھارا سُرخ سایہ میرے دوست "گیرک" کی سامنے والی قیام گاہ پر پڑا، اور میں خوش ہوں کہ تم ہم سے ملاقات کے لئے آئے ہوئے، پرسی یہ ہی ایتھنز کا نوجوان ہے جس کی ایک کتاب سال گزشتہ یکم اپریل کو

میں نے تمھیں تحفۃً دی تھی" اس نے شبلی سے وائلڈ کا تعارف کراتے ہوئے کہا اور پھر آسکر وائلڈ سے مخاطب ہوا :-

"بیٹھ جاؤ دوست آسکر وائلڈ، سگار پینا پسند کروگے یا شراب؟ یہاں دونوں چیزیں موجود ہیں اور میرے خیال میں شراب تم پر اچھا اثر کرے گی" وہ جواب کا انتظار کئے بغیر برابر کہے جارہا تھا "مگر اوہ! شاید جیل کی زندگی نے تمھیں ہر اور پاکی کی طرف مائل کردیا ہے؟ خیر: آج شام میں تمھارے پاس آوں گا اور تمہیں "منافقین کلب" میں لے چلوں گا۔ وہاں تمھیں کئی ایک مسحور کن ہستیاں نظر آئیں گی مثلاً "بہرنیگر" "ہائین" "پو" "گولڈ سمتھ" وغیرہ وغیرہ ———

یہ کلب بڑی دلچسپ جگہ ہے۔ وہاں ہم ہر قسم کی گفتگو کرسکتے ہیں البتہ ہنس نہیں سکتے کیونکہ یہ جہنم کا خاص قانون ہے۔ اور اگر تم شکسپیر سے ملنا چاہو تو ہم جہنم کے سبزہ زاروں کی ایک گشت لگائیں گے آج کل وہ عموماً وہیں ہومر کے ساتھ تفریح کے لئے آتا ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے دوست کہ میں تمھیں ڈنر پر مدعو نہیں کرسکتا۔ آج میں بویریا کے بادشاہ لڈوک ثانی کے ہاں مدعو ہوں اور اس سے اپنی نظم کا سترہواں باب سنانے کا وعدہ کرچکا ہوں۔ یہ نظم میں نے یہیں لکھی ہے... اور ہاں وہاں جہنم کا مالک شیطان بھی قابیل کے بھیس میں آنیوالا ہے اور تم ابھی اس قسم کی صحبتوں میں شریک نہیں ہوسکتے۔ جب میری طرح ایک عرصہ تک جہنم میں رہ لوگے اور یہاں کے آئین و قوانین کو بھول جاؤگے تب البتہ میں تمھیں اپنے ساتھ اس قسم کی محفلوں میں لے جاسکونگا"

لارڈ بائرن نے گفتگو ختم کردی اور آسکر وائلڈ کو رخصت کردیا پھر شبلی کو انتہائی خوش اخلاقی سے خود دروازہ تک پہنچانے گیا۔

جب ملاقاتی چلے گئے اور وہ اپنے تہہ خانے میں تنہا رہ گیا تو حسب دستور اپنی تصانیف میں غلطیاں تلاش کرنے اور ان پر ماتم کرنے میں مصروف ہوگیا۔ کیونکہ وہ اب ان کی اصلاح نہ کرسکتا تھا۔

عورت

(از خامہ، "خان صاحب" حکیم محمود علیخاں ۔ ماہر اکبرآبادی)

وہ عورت جو ہے راحتِ جانِ عالم وہ عورت جو ہے روحِ مردانِ عالم
وہ عورت جسے کہئے جانانِ عالم وہ عورت کہ جس سے بڑھی شانِ عالم
وہ عورت کہ دنیا کے نبیوں کی ماں ہے
وہ عورت کہ رشیوں کی منیوں کی ماں ہے

ابھی ہے کہاں دل کو عرفانِ عورت بیاں کر سکے کیا کوئی شانِ عورت
زمانہ ہے ممنونِ احسانِ عورت پلا ہے جہاں زیرِ دامانِ عورت
جو عورت نہ ہوتی، جہاں بھی نہ ہوتا
یہ پھول اور یہ گلستاں بھی نہ ہوتا

وہ قوموں کو بیدار کر دینے والی وہ ملکوں کو ہشیار کر دینے والی
وہ صحرا کو گل بار کر دینے والی وہ دنیا کو گلزار کر دینے والی
وہ ہر فن کی موجد، وہ ہر گن کی بانی
ترقی کی خالق، تمدن کی بانی

وہ انسان کو جسم و جاں دینے والی وہ عالم کو روح و رواں دینے والی
وہ اقوام کو عز و شاں دینے والی وہ ملکوں کو تاب و تواں دینے والی
وہ ابرار کی ماں، وہ احرار کی ماں
وہ اک ملک کیا، سارے سنسار کی ماں

جو قرنوں سے محرومِ لطف و کرم ہے جو صدیوں سے پامالِ جور و ستم ہے
جو اب تک گرفتارِ دامِ الم ہے جو تا حال محبوسِ زندانِ غم ہے
ہمیں خون اپنا پلایا ہے جس نے
ہمیں آپ مر کر جلایا ہے جس نے

وہ ماں جو کہ ہے سر سے پا تک محبت — وہ ماں جو ہے سرچشمۂ مہر و الفت
وہ ماں جس کے قدموں کے نیچے ہے جنت — وہ ہے جس کی ہستی ہے رحمت ہی رحمت

ستم ہے جہاں اس پہ یوں قہر ڈھائے
غضب ہے وہ پاؤں تلے روندی جائے

وہ جس دن سے خلقت میں لائی گئی ہے — ہمیشہ مصیبت میں پالی گئی ہے
ہزاروں برس جو ستائی گئی ہے — ہزاروں برس جو رلائی گئی ہے

مگر جو ابھی مرد کی قید میں ہے
شیاطینِ بے درد کی قید میں ہے

سپوتو! یہ کیا غفلتِ بے کراں ہے — یہ مانا ابھی تک مخالف جہاں ہے
یہ مانا ابھی اس کا موقع کہاں ہے — مگر یہ تو سوچو کہ آخر وہ ماں ہے

اٹھو اور غمدیدہ کو شاد کر دو
بڑھو اور عورت کو آزاد کر دو

حسین مجسمہ

ایک حسینہ کا خوبصورت مجسمہ جیون منگ کی جھیل کے کنارے نصب ہے۔ سیکڑوں صدیاں آئیں اور بیت گئیں ہزاروں فضائیں آئیں اور گزر گئیں۔ نہ جانے غنچوں نے کتنی دفعہ شگفتہ پھولوں کا روپ لیا.... اور شگفتہ پھولوں کی پتیاں ایک ایک کر کے نہ جانے کتنی بار گریں۔ مگر مگر اس کے حسن و شباب میں ذرا فرق نہ آیا۔

چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی لہریں ہلکا ہلکا خفیف سا شور کرتی ہوئی دور سے آتی ہیں اور اس کے مرمریں قدموں کو بوسے دے کر واپس لوٹ جاتی ہیں۔

اس کے بال بادل کے ایک چھوٹے سے مضطرب ٹکڑے کی طرح پریشان ہیں۔ اس کے ابرو ہلال کی طرح خمیدہ ہیں اور اس کا مسکراتا

مرسلہ سلمیٰ احمد صاحبہ بیگم نثار حمید مدیر "پرواز"

ہوا چہرہ کنول کے نیم وا پھول کی مانند ہے۔

جنگل کے وحشی طیور اپنی تشنگی رفع کرنے کے لئے جب اس جھیل کے کنارے آتے ہیں تو اس حسین مجسمہ کے دست و بازو اور سینہ پر بیٹھ کر آرام پاتے ہیں۔

حسینہ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینوں پر حائل کئے ہوئے ہیں اور پانی کی طرف پر اسرار انداز سے جھکی ہوئی۔ جیسے بے حرکت جھیل کے شفاف آئینے میں اپنی صورت دیکھے جا رہی ہے۔ صدیوں پر صدیاں گزرتی جاتی ہیں۔ مگر مغرور حسینہ اپنے حسن میں کچھ اس قدر کھوئی ہوئی ہے کہ اس خود بینی سے سیر ہی نہیں ہوتی۔

(ترجمہ)



جناب مظہر فریدپوری

بسنت کا موسم - ہلکی ہلکی پُروَیا - کھیتوں میں ہری ہری فصل چڑیوں کے میٹھے میٹھے چہچہے - ہولی کا زمانہ - رنگ گلال اور عبیر سے نہائے ہوئے کسان - چاروں طرف خوشی ہی خوشی -

کیا آج اس دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو غمگین اور افسردہ ہوگا کیا کسی ایسے انسان کا ہونا بھی ممکن ہے جو اس مست موسم اور بدمست تیوہار سے متاثر نہ ہو، ناچ اور گانے میں حصّہ نہ لے رنگ اور گلال میں نہ نہائے - بھانگ اور شراب کے گلاسوں پر ٹوٹ نہ جائے نہیں کوئی ایسا نہیں ہو سکتا -

---

میں اسی ہولی کے زمانہ میں چند قومی کاموں کی بناء پر ایک چھوٹے سے گاؤں کے برہمن زمیندار کے گھر مہمان ٹھیرا ہوا ہوں -

ہولی کی صبح آئی ہے اور اپنی بدمستیوں سے تمام گاؤں کو بدمست کردیا - گاؤں کا گاؤں رنگ چنگ اور بھنگ میں ڈوب گیا - آج بچّے سویرے ہی سے دھول مٹی سے کھیلنے میں مصروف ہیں - بڑے بوڑھے ان بچّوں کی شوخیوں اور شرارتوں کے ڈر سے گھر میں چھپے شام کی سرمستیوں کا انتظام کر رہے ہیں - گھر میں عورتیں قسم قسم کے پکوان پکا رہی ہیں - حسین و نوجوان لڑکیاں گھر کے آنگنوں میں رنگ رلیاں کرنے میں مشغول ہیں - جوان مردوں اور جوان عورتوں کے درمیان مزے کی چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے - ان کی جوانی کے ولولے نکل رہے ہیں - آج تو گالی اور بھپکّی بکنا بھی جائز ہے -

---

صبح دن اور دن دوپہر میں بدل گیا ہے مگر ہولی کی مستیوں میں کوئی فرق نہ آیا - جیسے جیسے شام ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے گاؤں کی بدمستیاں بڑھتی جا رہی ہیں - اب دھول مٹی کی جگہ گلال عبیر نے قبضہ کر لیا ہے - صبح کی چیخ پکار کے بدلے اب گانوں اور ناچ کی آوازیں آ رہی ہیں - بھنگ گھولی اور شراب ڈھالی جانے لگی لوگ اپنے آپے باہر ہونے لگے - ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے رنگ چنگ اور بھنگ میں ڈوب کر دنیا ہمیشہ کے لئے دُکھ درد کو بھول جائیگی ——"

میرے میزبان کے یہاں سویرے سے اس مست بدمست سرمست شام کی تیاریاں ہو رہی تھیں - مزدور مکان کی صفائی میں لگے تھے اگرچہ وہ ایسے مست تیوہار پر اپنی خوشیوں کو چھپا نہیں سکتے - مگر مالک کے ڈر سے رنگ رلیاں منا بھی نہیں سکتے - وہ دن بھر کام کے بعد شام کو تھکے ہارے گھر چلے گئے -

میں یہ سارے تماشے صبح سے چپ چاپ بیٹھا دیکھ رہا ہوں - مزدوروں کی محنت اور جانفشانی نے میرے دل پر گہرا اثر کر رکھا تھا - آہ یہ بدنصیب - دھرم سماج اور سرمایہ داری کے ہاتھوں کچلے ہوئے انسان ایسے مست تیوہار کے دن بھی خوشی نہیں منا سکتے - صرف اس لئے کہ وہ ایک زمیندار کی رعایا اور غریب رعایا ہیں -

---

شام ہوتے ہی میرے میزبان کے گھر رنگ چنگ و بھنگ کی محفل شروع ہوئی ہے اور ہم سب اُس میں کچھ ایسے محو ہو گئے کہ دنیا کی خبر نہ رہی۔

ناچ کی محفل میں رنگ بندھ گیا اور جب وہ ہما ہمی پر تھی کہ یکایک ان مزدوروں میں سے چند مزدور آئے اور اپنے مالک اپنے زمیندار سے کہنے لگے "سرکار ہمیں کچھ اناج مل جائے" ایسے شبھ دن ایسی اشبھ بات" میرے میزبان نے اپنے پیادوں کو حکم دیا کہ ان بھوکوں کو نکال دو۔

مزدوروں نے ایک بار پھر اپنے مالک کے غصّے کو دیکھتے ہوئے کہا "سرکار آج تیوہار کے دن بھی ہمارے گھر کھانے کو کچھ نہیں ہے"

ناچ اور رنگ کی محفل میں جہاں بھانگ اور شراب چل رہی ہو، پان کے بیڑے چبائے جا رہے ہوں۔ سگرٹ اور بیڑی پھونکی جا رہی ہو۔ وہاں یہ کہنا کہ آج کے لیسے تیوہار کے دن کھانے کو نہیں کیا یہ سچ ہو سکتا ہے۔

پیادوں نے مارتے پیٹتے دھکا دیتے مزدوروں کو باہر نکال دیا

ہولی آئی اور چلی گئی۔ ناچ و رنگ کی محفل ختم ہو گئی اور میں جب دوسرے دن اُس گاؤں کو چھوڑ رہا تھا۔ تب گاؤں کے باہر جھونپڑوں میں ہوا کی سنسناہٹ اور بھوکے بچوں کی رونے کی آواز سُن کر بے اختیار کہہ اٹھا کہ:۔

یہ جھونپڑوں کی آواز کہہ رہی ہے کہ آج ہم غریبوں کو ہم جھونپڑے میں رہنے والوں کو ہم بھوکے پیاسوں ننگوں کو اور ہم گنواروں کو تیوہار کے دن بھی خوشی منانے کا کوئی حق نہیں ۔۔۔۔ ؟ ۔۔۔۔ کیا ۔۔۔۔ ہے ؟

ماں اور بچّہ

ترجمہ از فارسی

از شعلہ لکھنوی

کہتے ہیں کہ جب ماں نے مجھ کو جنا، تو سب سے پہلے مُنہ میں پستان لینا سکھایا وہ پہروں رات تک میرے پالنے کے پاس بیٹھی جاگا کی اور اس طرح مجھ کو سونا سکھایا اسنے مسکراتے ہوئے۔ لب میرے ہونٹوں سے پیوست کر دیئے اور اس طرح کلی کو کھلنا سکھایا ۔۔۔۔۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ کو پاؤں پاؤں چلایا اور اس ترکیب سے مجھ کو چلنے کا طریقہ سکھایا اس نے ایک ایک اور دو دو حرف کر کے میرے مُنہ پر الفاظ رکھے اور مجھ کو بولنا سکھایا۔ بس میرا وجود اس کی بدولت ہے۔ لہٰذا جب تک میں اور وہ بقید حیات ہیں میں اس کو دوست رکھوں گا ۔۔۔۔

(۲)

اُٹھ تیری ماں تجھ پر قربان ہو۔ اُٹھ! بس اب کافی سو چکا ہے۔ اُٹھ کہ اب تجھ پر سونا حرام ہو۔ اُٹھ! تیرا باپ آزادی کے راستہ میں مارا گیا اور اپنی جگہ تجھ کو سونپ گیا۔

اُٹھ! میرا دودھ تجھ کو حلال ہو میری جان تجھ پر قربان ہو۔ تو میرا لخت جگر ہے۔ تو اپنے باپ کی یادگار ہے۔ خواب غفلت سے بیدار ہو تاکہ میں تیرے باپ کی شمشیر تیری کمر میں باندھوں اور تجھ کو میدانِ جنگ کو روانہ کر دوں۔

بیدار ہو! دشمن دروازہ پر آگیا ہے۔ تجھ کو لازم ہے کہ اپنے باپ کی جگہ لے اور دشمن کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کر اٹھ! میری دونوں آنکھوں کی بینائی اٹھ۔

تیرے باپ کے بعد تیری ماں مجبور و لاچار ہے، بے فریاد رس ہے اور تیرے سوا کوئی آسرا اور پشت و پناہ نہیں رکھتی دشمن دروازہ تک آپہنچا ہے اُٹھ اور اپنی ماں کی عزت بچا۔

اُٹھ میرے دل کی روشنی! اپنی آنکھوں کو کھول تاکہ میں تیری نگاہوں میں اس غیرت و بہادری کا نشان دیکھوں جو تیرا باپ رکھتا تھا۔ آہ! تیری آنکھیں کس قدر تیرے باپ سے ملتی جلتی ہیں۔

نظام الاوقات

دُنیا سے عقبیٰ تک

از قبلہ حکیم آزاد انصاری

یارو اگر آزاد سے ملنا ہے تو ناوقت، صحرا میں ملے گا نہ گلستاں میں ملے گا

وہ مرد خدا پچھلے پہر، صبح سے پہلے محراب عبادت گہ یزداں میں ملے گا

اور صبح کو وہ شیفتۂ حسن مناظر طرفِ چمن و کوہ و بیاباں میں ملے گا

اور بعد سحر وہ بنی آدم کا بہی خواہ دار العملِ خدمت انساں میں ملے گا

اور دن کو وہ دیوانۂ علم وادب و شعر دربارِ ادیبان و حکیماں میں ملے گا

اور شام سے پہلے وہ مرادِ دلِ گلزار آغوشِ بہارِ گل ریحاں میں ملے گا

اور شام کو وہ بادۂ و ساغر کا پرستار طوفِ حرم بادہ فروشاں میں ملے گا

اور شب کو وہ دلدادۂ نغماتِ خوش آہنگ یارانِ خوش الحان و غزلخواں میں ملے گا

اور پھر وہ غلامِ کرم حضرتِ جاناں تا آخرِ شب خدمتِ جاناں میں ملے گا

اور ہو گا کوئی جبر تو وہ جوش کی مانند مردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملے گا

پھر اور جو کچھ دن یونہیں گزرے تو وہ کمبخت اِک روز کسی گورِ غریباں میں ملے گا

اور پھر جو ملیگا بھی تو بازحمتِ بسیار تاریخ کے اوراقِ پریشاں میں ملے گا

پھر اور کہیں اُس کے تجسس میں نہ جانا

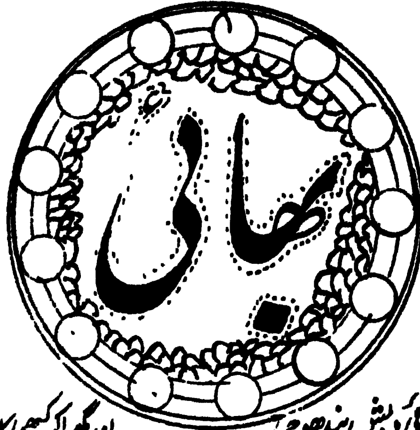
پھر تا بہ ابد روضۂ رضواں میں ملے گا

Miss Nadia



She is coming in Wadia's "Punjab Mail"





میں اس افسانے کو اپنے عزیز و محترم بھائی دیش بندھو جی کے نام معنون کرتی ہوں ۔ (سحر)

کانتا...... تم ! اور اس حالت میں ؟ اُف..... میں کیا دیکھ رہا ہوں ؟ پیاری بہن..... میری بہن..... جگدیش نے بے چینی کے عالم میں دُکھے ہوئے دل اور کراہتی ہوئی آواز میں کہا۔ اُس کی آواز میں قوت تھی ۔۔ الفاظ گلے میں اٹک رہے تھے ــــــــ

آؤ...... پرماتما کے لئے میرے ساتھ..... کملا اور ستیش کہاں پر ہیں ؟ ـــــ کہتے ہوئے وہ کانتا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کار کی طرف بڑھا۔

"ملاڈ میں " ـــ رُندھے ہوئے سُر میں کانتا صرف اتنا ہی کہہ سکی وہ پتھر کی مورتی بنی ہوئی تھی۔ اور سناٹے میں آگئی تھی کہ جگدیش یہاں کہاں سے آگیا ـــ اور دس سال بعد مجھے پہچان کیونکر گیا۔ جبکہ مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہوچکا ہے ـ "کس شدت کی بارش ہو رہی ہے ـ پھینک دو اس ٹوٹی چھتری کو۔ یہ تمہیں اس موسلادھار بارش سے کہاں بچا سکی ـ اُف تم تو ساری شرابور ہو ـ جلدی بیٹھو" ـ اُس نے موٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اور بہن کے پاؤں سے ٹوٹی اور بھیگی ہوئی چپلیں نکال کر باہر پھینک دیں۔

کانتا بھائی کے حکم کی تعمیل میں سمٹی سمٹائی موٹر میں بیٹھ گئی ـ جگدیش نے اپنی کشمیری ملائم سفید شال اُسے اُڑھا دی ـــ اب موٹر تیزی سے "ملاڈ" کی طرف جا رہی تھی

جگدیش کانتا کی اس خراب و خستہ حالت سے بہت دُکھی ہو رہا تھا اور گھبرا کر کبھی کانتا کے چہرے کی طرف دیکھتا ـــ اور کبھی اُس کے بوسیدہ کپڑوں کی طرف جو بھیگے ہوئے تھے کانتا کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں حلقے میں تھیں۔ رنگ زرد ہو رہا تھا۔ چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ ہونٹ کچھ سردی سے اور کچھ گھبراہٹ کی وجہ سے کبھی کبھی پھڑک جاتے تھے۔ ہاتھوں پر جھُریاں پڑی ہوئی تھیں۔ جگدیش بہن کے برف کی طرح ٹھنڈے اور بے جان ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر گرمی پہنچا رہا تھا کبھی مُنہ سے بھاپ دینے لگتا۔ اُس نے دیکھا کانتا کانپ رہی ہے۔ اب اُس سے نہ رہا گیا۔ اُس نے اپنے داہنے ہاتھ کے حلقے میں لے کر اُسے اپنے پہلو سے لپٹا لیا۔ اور کہا پیاری بہن ! بھائیوں کے ہوتے تمہاری یہ حالت ؟ مجھے بھی خبر نہ دی ـــــــ

کانتا کے صبر کا بند ٹوٹ گیا۔ بھائی کے سینے پر سر رکھ کر وہ سِسک سِسک کر رونے لگی۔ جگدیش میں اُسے چُپ کرانے کی تاب کہاں تھی اُس کی آنکھیں پہلے ہی ڈبڈبا رہی تھیں۔ آنسوؤں کے سیلاب میں زمانہ ماضی نے آکر اپنے رُخ سے نقاب اُلٹ دی۔ اب جگدیش آج سے ۲۰ سال قبل کی دنیا میں تھا ــــــ

جگدیش، ظفر، سود، حمید، ونود، ونودنی، تارا، سعیدہ، سمترا، قمر سب ایک ہی سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ ظفر بہت ہونہار طالب علم تھا۔ سعیدہ قمر کی بہن تھی۔ قمر کو میں پیار سے کانتا کہا کرتا تھا۔ میری بہن سمترا بھی اُس سے بہت محبت کرتی تھی۔ اور قمر مجھے بھی

بھائی سے کم نہ سمجھتی تھی۔ میرے اور قمر کے گھرانے سے بہت راہ و رسم تھی۔ بالکل رشتہ داروں کی طرح ــــ ہم مشترکہ تیوہار منایا کرتے۔ دیوالی اور عید میں ہمیں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا۔ ہندوستان بھر میں شاید یہ دو گھرانے ہی ایسے تھے جو دوہرے تیوہاروں کی خوشیاں لوٹتے۔ آہ بچپن کا زمانہ ــــ ساتھ اُٹھنا بیٹھنا۔ ساتھ کھانا پینا۔ ساتھ ہی کھیلنا کودنا ساتھ ہی لکھنا پڑھنا۔ اس کے بعد وہ وقت بھی آیا کہ ہم بچھڑ گئے اور علیحدہ علیحدہ سکولوں میں جانے لگے۔ یہ علیحدگی ہمارے لئے قیامت تھی مگر شام کو باغ میں ملاقات ہو ہی جاتی تھی ــــ

ــــ ــــ ــــ ــــ ــــ

قمر کی عمر کے دسویں سال میں اُس کی منگنی ظفر سے ہو گئی ہم لوگوں نے کس قدر خوشیاں منائی تھیں۔ چونکہ قمر کے لئے ظفر سے بہتر دولھا ہماری نظروں میں اور کوئی نہ تھا۔

اُف ہمارے بچپن میں ایک بُرا وقت بھی آیا تھا۔ وہ تھا ہندو مسلم فساد کا شہر میں برپا ہونا ــــ اس کا زہر یہاں تک پھیلا۔ کہ ہندو مسلمانوں کی بستیاں الگ الگ ہو گئیں ــــ اور ہم لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے مگر یہ بچھڑنا جنت میں فساد کا باعث ہوا ــــ ہم لوگوں کا باہر نکلنا بند ہو گیا اور ہم ایک دوسرے بنا ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے ــــ ایک دن قمر نے ضد کی کہ "یا تو ضرور جگدیش بھیا سے ملوں گی۔ مہینہ بھر سے میں نے اُس کی پیاری صورت نہیں دیکھی۔ ماں نے کہا ــــ "بیٹی ہندو مسلم فساد کا زمانہ ہے کیا تمہاری شامت آئی ہے۔ کہ گھر سے باہر نکلو گی" ــــ قمر نے کہا تو جگدیش اور سمترا کو یہیں بُلا دو۔

ماں نے جواب دیا۔ اُن کے ماں باپ اپنے بچوں کو یہاں کیوں بھیجنے لگے ــــ ادھر میں اور سمترا بھی ماتا جی اور پتا جی سے تقاضہ کر رہے تھے کہ قمر کے گھر چلو۔ ماتا جی مجھے سمجھا رہی تھیں کہ چاچی بول اُٹھیں۔ "یہ لڑکا تو آدھا مسلمان بن گیا ہے اور مسلمان بچوں میں کھیلنے دو! یہ ظالم ملیکش قوم نے کبھی وفا کی ہے؟ دیکھنا بھابھی تم پچھتاؤ گی اگر اسے نہ روکا ــــ چھی چھی ــــ مسلمانوں سے اتنا پریم؟ اِن ظالموں نے غریب ہندوؤں پر کیا ستم ڈھا رکھا ہے۔ ہر کس و ناکس کے چھرا بھونکنا ہی جانتے ہیں ــــ دَیا تو پاس نہیں پھٹکی ــــ رام رام ....

مجھے بہت بُرا لگا۔ میں نے کہا چاچی جی ــــ کیا فضول باتیں کرتی ہو مسلمان بُرے ہوتے ہیں۔ ہندو پرماتما کے پیارے ہیں مسلمان ملیچھ ہوتے ہیں ظالم ہیں چھرے بھونکنا اور انسانی خون بہانا جانتے ہیں ــــ تو کیا قمر بری ہے ہرگز نہیں ــــ وہ تو ہماری سمترا سے بھی اچھی ہے۔ اظہر کتنا پیارا دوست ہے۔ ظفر کیسا اچھا لڑکا ہے۔ سعیدہ کتنی پیاری ہے۔ یہ سب مسلمان ہی تو ہیں۔ مگر بُرے ہرگز نہیں۔ یہ سب تو ہندوؤں سے بھی اچھے ہیں یوں دیکھو تو ہندو کیا کم ظالم ہیں آخر خود تمہارے چاچا نے تم پر کیا کم ظلم کیا ہے سب جائداد چھین لی تمہارے بھائی کو وِش دے کر مروا ڈالا یہ بھی تو تم ہی کہتی ہو نا۔ ؟

اُدھر قمر کی ضد پر اُس کی ماں نے ڈانٹنا شروع کیا کہ بچپن کی اور بات تھی اب تو سیانی ہوئی ــــ خبردار جو اُس کافر بچے کا نام لیا۔ یہ ہندو قوم بڑی بگلا بھگت ہے۔ دَیا دَیا کا شور تو بہت مچاتے ہیں مگر ہم بیگناہ مسلمانوں کو کیسا بے دردی سے مارتے ہیں۔ ابھی پرسوں لکھنو نے بے چارے شیخ جی کو قتل کر ڈالا۔

قمر کہتی:ــــ ماں میں اور مسعود اور سعیدہ لڑتے ہیں ایک دوسرے کو مارتے ہیں تو تم رونے لگتی ہو اور کہتی ہو کہ بھائی بہن محبت اور پیار سے رہو۔ تو کیا ہندو مسلمان ایک خدا کے بندے اور ایک ہی مادر وطن کے بچے نہیں ہیں۔ جب یہ ایک دوسرے سے لڑتے ہوں گے تو کیا اللہ میاں کو رنج نہ ہوتا ہوگا اور غصہ نہ آتا ہوگا؟ مادر وطن خون کے آنسو نہ روتی ہوگی؟ کیا انہیں کوئی منع کرنے والا نہیں ــــ اتنے پیغمبر آئے۔ خود ہمارے پیغمبر اور ہندوؤں کے رشی منی یہ سب خدا کے برگزیدہ بندے تھے کیا اُنہوں نے اِس قسم کی خونریزی اور فساد کو منع نہیں کیا۔ اگر نہیں منع کیا تو

وہ پھر اس دنیا میں کس کام کے لئے آئے تھے؟ اور اگر منع کیا ہے تو یہ ہندو مسلمان اپنے بزرگوں اور خدا کے حکم کو کیوں نہیں مانتے کیا یہ سچے دل سے اُن کی عزت نہیں کرتے؟ ———

ماں اُسے جھڑک دیتی "ہم اچھے ہیں کیونکہ مسلمان ہیں۔ وہ بُرے ہیں کیونکہ وہ ہندو ہیں۔ یہ بے دلیل کا فلسفہ قمر کی سمجھ میں نہ آتا۔

شہر میں امن و امان قایم ہو چکا تھا۔ میں تین چار دن سے لگاتار باغ میں آ رہا تھا کہ قمر بھی آئے گی اور ملاقات ہو جائیگی۔ ایک دن میں افسردہ باغ کی ایک بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ سمترا اور سوشیلا کھیل رہی تھی ایک موٹر باغ میں آ کر رُکی اور یکایک سمترا "قمر بہن آ گئیں، آ گئیں" چلاتی ہوئی اُس طرف دوڑی ——— اُدھر قمر موٹر سے اُتری اور سمترا اور قمر دونوں لپٹ کر رونے لگیں۔ مجھ پر گویا شادیٔ مرگ سی طاری ہو گئی ——— مگر قمر کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ جگدیش دوڑ کر آئے گا اور ملے گا پھر ہم آپس میں بیٹھ کر جو نئی نئی باتیں ہندو مسلم سلسلے میں ہمیں معلوم ہوئی ہیں اُن کا تذکرہ کریں گے اور بحث و تمحیص کر کے اِن مفسدین کی عقلوں کا مضحکہ اڑائینگے اور ان پر لعنت بھیجیں گے۔

وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی آگے بڑھی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی "جگدیش بھیا" ——— میں نے کہا "قمر" ——— "میرا گلا رُندھ گیا اور میری آواز تھرتھرانے لگی۔

- - - - - - - - - -

ظفر سے قمر کی منگنی توڑ دی گئی چونکہ اہل مذاہب کی گمراہیاں اور تعصب سے متنفر ہو کر ظفر نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ وہ آج سے نہ ہندو ہے نہ مسلمان۔ اور اُس نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا کہ قوم پرست نوجوان مرد اور عورتیں ایک ایسی پارٹی بنائیں جو ان متعصب اور فرقہ پرست انسانوں کی سرکوبی کرے جو ہندوستانی قوم کے درمیان منافرت کا بیج بو رہے ہیں۔ اور ایک آزاد قوم نہیں بننے دیتے۔ آخر عیسائی اور یہودیوں میں تو ہندو مسلمانوں سے بڑھ کر اختلاف ہے اور مذہبی منافرت "اینٹ کُتے کے بیر" تک پہنچ چکی ہے مگر قومیت کے نام پر ایک یہودی ہندوستان کا وائسرائے بن سکتا ہے۔ اور بنا تو ہندو جن کی گھٹی میں دیا اور انسانیت ہے۔ اور مسلمان جن کا مذہب بنیادی طور پر مذہب کی تعظیم کی تعلیم دیتا ہے کیوں نہیں متفق ہو سکتے۔ اور ہم وطن ہونیکی حیثیت سے ایک ہندوستانی قوم کیوں نہیں بن سکتے۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ سب ہتھکنڈے غلامی کے ایجنٹوں کے ہیں لہذا سب سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مادۂ فاسد کا اخراج کیا جائے۔ وہ اُن پارٹیوں کے خلاف تھا جو حکومت کی دشمن تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے اپنے قومی جسم میں سے مادہ فاسد کو نیست و نابود کیا جائے۔ اور وہ اس طرح کہ ہندو نوجوان مفسد ہندوؤں کو سزا دیں اور مسلم نوجوان مفسد مسلمانوں کی خبر لیں۔ ہماری قوم غلام ہے اور آزاد قوموں کی حکومت کے ڈھانچے کی طرح تو ہے نہیں کہ کوئی جگہ خالی نہیں رہ پاتی فی الفور پوری کر دی جاتی ہے۔ بے چارے ظفر کو اپنے انھیں خیالات کی وجہ سے جیل کی ہوا کھانا پڑی ادھر منگنی بھی ٹوٹ گئی۔ اور قمر پر جو ظفر کی اس اولوالعزمی اور روشن خیالی کی وجہ سے اُس کی گرویدہ تھی ایک غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس نے فیصلہ کر رہا تھا کہ وہ کسی اور سے شادی ہرگز نہ کرے گی۔

مگر اُس کی شادی ٹھہرائی گئی ایک ایسے مفسد سے جو تعلیم تربیت اخلاق صورت شکل اور ہر طرح سے قمر کا منگی بننے کے بھی اہل نہ تھا۔ وہ تھا اُس کا چچا زاد بھائی غفور ———

قمر نے شادی سے کھلے طور پر انکار کر دیا۔ اس پر گھر میں کہرام مچ گیا کہ غضب ہے کنواری لڑکی اپنی شادی کے متعلق زبان کھولتی ہے۔ اُس نے اپنی جان دیدینا چاہی مگر وہ ناکام رہی۔ چونکہ اب سے مجھ سے پردہ کرنے کا حکم مل چکا تھا کوئی چھ ماہ سے ہم ایک دوسرے سے نہ مل سکے تھے۔ میں اُس کی حالت سُن سُنکر دل ہی دل میں تڑپ کر رہ جایا کرتا تھا سمترا کی معرفت کبھی کبھی خط و کتابت کا موقع ملتا۔ اُس کے خط بہت دردناک ہوتے۔ اُس کی حالت سے متاثر ہو کر میں بیمار ہو گیا۔ میری بیماری کی خبر سے وہ تڑپ اُٹھی

میری بہنی اندرا بھی اسے بہت چاہتی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں پسند کرتی کہ میں اسے اسقدر زیادہ چاہوں — اس لئے میری دلی تمنا ہے کہ کانتا کہیں شادی کرلے۔ پتاجی کے ملنے والے تم جانتے ہو کیسی کیسی پوزیشن کے مالک ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر پیغام کانتا کے لئے آئے اس میں لیڈر بھی تھے۔ ممبر اسمبلی بھی تھے بڑے بڑے سرکاری عہدے دار بھی تھے۔ مگر وہ تو شادی کے ذکر سے ہی اس قدر خفا ہو جاتی ہے کہ ہم سب کو ملکر اُسے منانے میں کئی دن لگ جاتے ہیں۔

میں نے جھیندر سے کہا تم بے فکر رہو۔ کانتا شادی کرلیگی۔

⁂ ⁂ ⁂

بڑی بڑی مشکلوں سے ہم نے ظفر کو تلاش کیا۔ جھیندر بابو اور میری دلی خوشی تھی کہ کانتا کی شادی دھوم دھام سے کریں۔ میری بیوی اور اندرا بھابھی کو ہم سے بھی زیادہ خوشی تھی مگر ہندو مُسلم کشمکش کا ڈر تھا۔ ظفر نہیں چاہتا تھا کہ اِن کی وجہ سے ملک کی فضا بگڑے۔ غرضکہ میں، سہاسنی، جھیندر، بھابھی اندرا، اور جھیندر کے پتاجی یعنی کُل پانچ آدمیوں کی موجودگی میں یہ شادی ہوئی۔ میری بیوی اور اندرا بھابھی نے دل کھول کر کانتا کو جہیز دیا۔ تاکہ اُس کے دل میں یہ خیال نہ آسکے کہ حقیقی بھائی اور بھاوجیں ہوتیں تو اس سے زیادہ دیتیں۔

میں نے اور جھیندر نے ظفر کو ایک ہزار روپیہ دیا کہ وہ تمر کو ساتھ لے کر ہنی مون منانے مسوری چلا جائے وہ دن اور آج کا دن اِن کی کچھ خبر نہ ملی کہ کہاں گئے، کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں آج سے چار سال قبل ایک تحریر کانتا کی ملی تھی کہ آپکی بھانجی پیدا ہوئی ہے مگر خط میں نام و پتہ موجود نہ تھا۔ میں صرف تڑپ کر رہ گیا ——

⁂ ⁂ ⁂

بھائی جی اُتریئے —— گھر آگیا۔ کانتا نے کہا۔ موٹر ٹھہر چکی تھی میں اپنے خیال کی دُنیا سے چونکا —— اُف! چند منٹوں میں میں نے اتنے برسوں کی سیر کرڈالی!" میں نے سوچا۔

آیئے —— کانتا مجھے بُلا رہی تھی۔ میں مدتوں کے بیمار کی طرح لڑکھڑاتا ہوا اس کے پیچھے ہولیا۔ پتلی سی میلی تنگ و تاریک گلی میں سے گزرتے ہوئے ہم ایک نہایت تنگ زینے پر پہنچے جو پُلصراط کی طرح تھا مشکل سے اُسے عبور کرکے ہم ایک کوٹھری کے پاس پہنچے۔ اُسی لمحے میں کراہتے ہوئی ایک آواز سُنائی دی۔ "ذرا دیکھنا بیٹی۔ کیا تیری ماں آئی ہے آہ...... اتنی دیر ہوگئی۔ بے چاری مصیبت کی ماری ابتک گھر نہیں پہنچی۔ آہ کانتا —— میں تیری مدد کرنے سے کس قدر معذور ہوں" جس وقت یہ دونوں بہن بھائی کوٹھری میں پہنچے ظفر کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے اور کملا تین برس کی معصوم جان سہمی ہوئی ایک طرف حیرت سے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

جگدیش نے کملا کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ اور ستیش کی طرف بڑھا (ظفر نے اپنا ایک نام ستیش بھی رکھا تھا) اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہی اُس کا رنگ فق ہوگیا۔ اُفوہ .... اس قدر شدید بخار! اس اثنا میں کانتا تھرمامیٹر لے آئی۔ ظفر کا ٹمپریچر ۵۔۱۰۵ تھا جگدیش گھبرا گیا۔ اور اُسی وقت بہن —— بہنوئی —— اور بھانجی کو کارلٹن ہوٹل جہاں وہ ٹھیرا ہوا تھا لے آیا ——

⁂ ⁂ ⁂

ظفر کا علاج ہو رہا تھا۔ اب اُسے آرام تھا۔ جگدیش کانتا سے گزشتہ دس سال کے حالات معلوم کرنے کو بے چین تھا۔

ایک روز دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کانتا نے کہنا شروع کیا: "بھیا، شادی کے بعد ہم مسوری جارہے تھے سہارنپور پر "ان" کی پارٹی کے چند لوگ ملے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ انھوں نے کہا کہ اترسوں تک دو ہزار روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔ ورنہ سخت نقصان ہوجائے گا۔ انھوں نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا جیسی آپکی مرضی

اور ایک دن اپنی مامی کے یہاں جانے کا بہانہ کر کے وہ میرے یہاں آئی۔ اُس زمانے میں میرے ماتا پتا کلکتہ گئے ہوئے تھے صرف میں اور سمترا مکان پر تھے۔ وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ کر رونے لگی، میں بھی بستر علالت پر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی "بھیا مجھے بچا لو۔ میں سوائے ظفر کے اور کسی کے ساتھ شادی نہ کروں گی۔" مجھے یہ لوگ جیتے جی ایک رنڈے کے حوالے کر رہے ہیں" سمترا کا سر میری گود میں تھا۔ اور میں اُس کی پیٹھ اور سر پر ہاتھ پھیر کر اُسے تسلی دے رہا تھا کہ قمر کے گھر والے غضب ناک حالت میں میرے کمرے میں گھس آئے سمترا بھی گھبرائی ہوئی چائے بنانا چھوڑ کر بھاگی آئی اور مجھ سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔ میں حیران تھا۔ قمر اُٹھ بیٹھی اُس کی آنکھیں لال اور چہرے پر گھبراہٹ کے آثار طاری تھے "اچھا یہاں یہ راز و نیاز ہو رہے تھے۔ تب ہی تو شادی کی مخالفت کی جاتی تھی" اُنھوں نے کہا "ہندوؤں سے عشق بازی۔ ۔۔۔ منہ سے بھائی بھائی اور بہن بہن اور یہ حرکتیں" ۔۔۔ غفور نے کہا۔ اور قمر نے تڑپ کر ایک زور سے طمانچہ اُس کے منہ پر رسید کیا اور کہا بد معاش! ۔۔۔ تم جو خالہ زاد اور چچازاد بہن سے شادی کر کے بیوی بنا سکتے ہو تمہاری نظر میں بہن بھائی کا رشتہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہوگا ۔۔۔ تم بہنوں سے عشق بازی کر سکتے ہو؟ یہ نہیں کر سکتا۔ غفور نے قمر کی چوٹی پکڑی اور دو تین تھپڑ مارے۔ میں نہ دیکھ سکا لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور غفور سے گتھم گتھا ہو گیا۔ اسی اثنا میں قمر کے ماموں اور بھائی مسعود آگئے۔ اُنھوں نے بیچ بچاؤ کیا اور قمر کو لے جانے لگے۔ مگر وہ نہ جاتی تھی۔ بھیا مجھے بچاؤ، بھیا مجھے بچاؤ" یہی آواز غشی کے عالم میں بھی میرے کانوں میں آتی رہی۔

* * * * * * *

عین شادی کے دن قمر گھر سے غائب ہو گئی ۔۔۔ پولیس نے ہمیں بھی بہت دق کیا۔ مگر سانچ کو آنچ کب ہے۔ وہ میرا کچھ بگاڑ نہ سکے۔

ظفر بھی اب جیل سے چھوٹ کر آگیا تھا۔ میں اور ظفر کامل دو سال تک قمر کو تلاش کرتے رہے مگر وہ نہ ملی۔ اب ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ پرماتما کے پاس پہنچ چکی ہے۔

میں کمبھ کے میلے پر گیا ہوا تھا۔ جوالاپور میں مہیندر اور بھابی اندرا کے ہمراہ کانتا کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ یہ کانتا ہی ہے۔ ایک منٹ تک ہم بغور ایک دوسرے کو سر سے پاؤں تک دیکھتے رہے کانتا "جگدیش بھیا" کہہ کر میری طرف دوڑی اور میں نے "پیاری بہن کانتا ۔۔۔ تم یہاں کہاں؟" کہہ کر اُسے لپٹا لیا۔

مہیندر نے مجھے بتایا کہ کس طرح اُس نے جمنا کی خوفناک لہروں میں سے اس لڑکی کو بچایا تھا زندگی تھی جو بچ گئی ۔۔۔ لڑکی مصیبت زدہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے بلک بلک کر التجا کی تھی کہ کسی کو اُس کا پتہ نہ دیا جائے ورنہ اُس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اسکی عمر چھوٹی تھی اس لئے ہم نے چاہا کہ شادی کر دیں مگر وہ شادی کے نام سے بدکتی تھی اس نے کہا کہ میں خادمہ بن کر تم لوگوں کی سیوا میں زندگی گزار دوں گی۔

اُس کے عادات و اخلاق گفتگو اور سلیقہ خیالات و تعلیم سے ہمیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ لڑکی بڑی شخصیت کی مالک ہے۔ پتا جی نے اسے اپنی لڑکی بنا لیا۔ چونکہ وہ ہمیشہ سے ہی ایسی شجاع ہستیوں کے قدرداں تھے جو ظالم سوسائٹیوں کے جابرانہ قوانین کو توڑ پھینکنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

اور میری تو بچپن سے ہی یہ تمنا تھی کہ بھگوان مجھے ایک چھوٹی بہن دیدے ۔۔۔ میری ابھلاشا پوری ہو گئی۔ کانتا مجھے بالکل حقیقی بہن معلوم ہوتی ہے اور حقیقی بہنوں سے زیادہ مجھے اس سے محبت ہے۔

— چنانچہ ہم بہار نپور میں اُتر پڑے۔ ایک ہزار نقد تھا اور تقریباً ڈیڑھ ہزار کا زیور تھا وہ اَونے پونے فروخت کر کے ہم نے اُنھیں دیدیا ہمارے پاس صرف ڈھائی سو روپیہ بچا۔ لہٰذا ان کی صلاح ہوئی کہ ہم مسوری نہ جائیں۔ یہ مجھے اپنے ماموں کے گھر لے گئے مگر انھوں نے ہمیں دروازے سے لوٹا دیا کہنا بھائی — تم بہت خطرناک قسم کے انسان ہو ہم پر کوئی مصیبت آجائیگی تو ہمارے بال بچوں کا کیا حال ہوگا۔ حالانکہ وہ بہت آزاد خیال آدمی تھے اور سارے رشتہ داروں سے بڑھ کر ان پر جان دیتے تھے پھر یہ اپنے دوستوں کے یہاں مجھے لے کر پہنچے اُن میں سے کچھ دوستوں نے آنا کانی کی اور بعضوں نے تو صاف کہہ دیا کہ تمھارا تو عہد تھا کہ "جب تک مادرِ وطن آزاد نہ ہوگی شادی نہ کروگے۔ اب شادی تو کر لی ہے، غلاموں کی تعداد بھی بڑھاؤ گے" ان کے دوسرے عزیزوں نے تو صاف کہہ دیا کہ "ظفر ہمارے لئے مر گیا۔ ایک ایسی لڑکی جو گھر سے بھاگی ہوئی ہے اُس سے شادی کر لی — غضب خدا کا — اِن کے باپ پہلے ہی اِن سے ناراض تھے چونکہ وہ گورنمنٹ پرست اور جی حضوری تھے اب جبکہ اِس نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لی جس کے ماں باپ نے اِن کے لڑکے کے ساتھ حقارت سے منگنی توڑ دی تھی اور پھر طرّہ یہ کہ وہ لڑکی ؟ ایسی آوارہ نکلی کہ گھر چھوڑ کر بھاگ گئی اُسے اس نے ہماری بہو بنایا۔ اس سے ہماری نسل چلے گی" یہ سوچ کر وہ اور بپھر گئے۔ اِن کے سوتیلے بڑے بھائیوں نے باپ کے اور کان بھرے اور انھیں بدنام کنندہ خاندان اور نافرمان ثابت کر کے عاق کرا دیا۔

غرضکہ ہم نے کنکھل کی ایک دھرم شالہ میں دس دن بمشکل تمام گزارے۔ یہی ہنی مون تھا۔

اس کے بعد ہم بمبئی آگئے — کہ قسمت آزمائی کریں۔ اِن کو کچھ ایسے تلخ تجربات ہوئے کہ دنیا سے اِن کا دل اُچاٹ ہو گیا انھوں نے کہا میرے لئے جو کچھ ہو تم ہو۔ میری دنیا عقبیٰ سب کچھ تمھیں ہو، میرا اب کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے لئے یہ ایک اور صدمہ تھا کہ میرا پتی اپنے آدرش سے ہٹ رہا تھا۔ میں نے بہت سمجھایا مگر یہ نہ مانے۔ میں نے کہا کہ ہم تم دونوں مجاہدانہ زندگی بسر کریں گے مگر یہ ناراض ہونے لگے۔ چونکہ انقلابی پارٹی کا کہنا تھا کہ "اِس لڑکی نے ظفر کو اپنے لئے دیوانہ بنا رکھا ہے اور اُسے آدرش سے گرا دیا"۔ کاش اُنھیں معلوم ہوتا کہ میں اِس شخص سے صرف اسی لئے محبت کرتی تھی کہ یہ باغی اور انقلابی ہے۔ بھیا تم جانتے ہو، میں شادی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی تم اور بھائی مہندر نے آٹھ دن تک میری کتنی منتیں کی تھیں کہ "بہن ساری عمر بھائیوں کے سہارے! دن نہ بسر ہو سکیں گے" "میں کتنا بُرا مانتی تھی کہ تم مجھ سے اُکتا گئے ہوئے اس لئے شادی کر کے اپنی بلا دوسرے کے سر ڈالنا چاہتے ہو"———

* * *

خیر تو اس کے بعد ہم یہاں آگئے۔ یہاں کے مسلمان میری لیاقت کے قائل تھے مگر چونکہ میں پردہ نہیں کرتی تھی اس لئے وہ مسلمان نہیں مانتے تھے اور مجھ سے نفرت کرتے تھے۔ ہندو میری فصیح گفتگو سے جلتے اور مجھے ملیچھ سمجھ کر ہندوؤں کی سوسائٹی میں کوئی جگہ دینے کو طیار نہ تھے۔ لامذہبی کا اعلان کرنا ظفر صاحب ہی کی ہمت تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں سوسائٹیوں میں ہمارا کوئی ہمدرد نہ تھا۔ لامذہبوں نے اب تک اپنے آپ کو منظم کر کے کوئی سوسائٹی نہیں بنائی———

جب تک اِن کے ہاتھ پاؤں چلے محنت مزدوری کر کے بُرے بھلے اپنا اور میرا پیٹ پالتے رہے۔ مگر ان کی طبیعت ہے، ذرا سخت۔ دوسرے دن سے تیسرا دن نہ ہوتا کہ جاہل لوگوں

اور سرمایہ داروں سے لڑ بھڑ کر کام چھوڑ آتے۔ ذہنی کوفت کی وجہ سے بالآخر یہ بیمار رہنے لگے ایک وقت ہم پر ایسا بھی آیا کہ یہ چار مہینے کا بخار لئے پڑے تھے۔ اور کبھا کو بھی تین ماہ سے بخار آتا تھا۔ مجھے کچھ مسلمان جان پہچان لوگوں نے بظاہر ترس کھا کر مگر مجھے ذلیل کرنے کو ایک میونسپل گرلز سکول میں بچوں کو الف، ب، پڑھانے کی پارٹ ٹائم کی نوکری بیس روپیہ ماہوار پر لگوا دی۔ یہ اسکول بہت گندی جگہ پر تھا اور اس کی ہیڈ مسٹریس کی لیاقت اتنی تھی کہ انھیں میں مزید دس سال تک پڑھا سکتی تھی —— وہ ہم جھوٹی استانیوں سے اکثر چپراسیہ کا کام بھی لیتیں کہ جاؤ بچوں کو بلا کر لاؤ"۔ بچوں کے ماں باپ جاہل —— اور اکھڑ —— وہ ہماری نرمی اور التجاؤں کے جواب میں گالیوں سے ہماری تواضع کرتے۔

چار ماہ میں نے یہ ذلت آمیز ملازمت کی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں سکول بند ہوئے اور پھر جب کھلے ہیں تو میں نے استعفا لکھ کر بھیج دیا۔ چونکہ اب مجھے ایک انگریز سہیلی کی مدد سے دو تین پرائیوٹ ٹیوشنز مل گئی تھیں۔ یہ یورپین لیڈی میری دلی رفیق تھی اور میں مرتے دم تک اس کی محبت، قدر دانی، ہمدردی، اور امداد کو فراموش نہ کروں گی۔ وہ مجھ سے اردو پڑھا کرتی تھی۔ وہ بھی باغی قسم کی عورت تھی۔ اس لئے مصیبت زدہ تھی ۸ ماہ بعد وہ ولایت چلی گئی —— اور میں پھر بے یار و مددگار رہ گئی۔

ظفر کبھی بیمار ہو جاتے اور کبھی ذرا افاقہ ہو جاتا۔ غرضیکہ بہت دنوں سے یونہی چل رہا تھا۔ میری ذاتی شرافت اور علمی قابلیت کی وجہ سے دو چار معزز مسلم گھرانوں میں مجھے اچھی ٹیوشنیں مل گئی تھیں۔ جن کے بچوں نے بہت کم وقت میں حیرت انگیز علمی استعداد حاصل کر لی اور وہ مجھ سے بہت خوش تھے۔ مگر جب ہمارے مخالفین نے جا کر انھیں ہماری کہانی سنائی تو انھوں نے کمال افسوس، مجبوری و عاجزی کے ساتھ مجھے موقوف کر دیا اور اس طرح ہمارے منہ سے ہماری ہی محنتوں کے نوالے چھنتے رہے۔

بھیا بہت سے دن ایسے بھی آئے کہ ہم تینوں شدید بخار میں دو دو دن بیہوش پڑے رہے۔ تینوں میں سے جسے پہلے ہوش آتا وہ گرتا پڑتا اٹھتا۔ اگر گھڑے میں پانی ہوتا تو خود پیتا اور لا کر دوسروں کے منہ میں بھی ٹپکاتا۔ کبھی بے ہوشی کے عالم میں ہم تینوں قے وغیرہ غلاظتوں میں لتھڑے ہوئے چار چار گھنٹے پڑے رہتے اور ایسے میں اگر ہم مر بھی جاتے تو ہماری لاشیں اسی وقت پھنکوائی جاتیں جب اُن میں تعفن پیدا ہو جاتا اور دوسروں کی صحت کے لئے خطرہ ہوتا۔

ہٹ ہٹ ہٹ ہٹ ہٹ ہٹ ہٹ ہٹ ہٹ ہٹ ہٹ

"بس کرو! —— کانتا —— ..... اُف! اب مجھ میں سننے کی تاب نہیں سر تھام کر جگدیش نے کہا اور سسک سسک کر رونے لگا۔

کانتا اس کے پاس آئی —— اور کہا "بھیا —— اب رنج نہ کرو۔ اب تو ہم سب اچھی طرح ہیں"!

"جاؤ میں تم سے نہیں بولتا۔ یہ یہ قیامتیں بیت گئیں اور تم نے مجھے خبر تک نہ دی" جگدیش نے منہ پھیر کر کہا —— اسی منہ سے مجھے بھائی کہتی ہو! ——

"میں نے سوچا کہ اب تم سب کو اپنی تکلیفیں سنا سنا کر رنجیدہ کیوں کروں۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ قسمت کا ساتھی کون ہو سکتا ہے بھیا" —— کانتا نے کہا

"ہم"! جب تک زندہ ہیں تمھیں تکلیف میں دیکھ نہیں سکتے —— جگدیش نے مضبوطی سے کہا —— اب تم سب کو میرے ساتھ چلنا ہوگا"۔ ظفر نے کانتا کی اور کانتا نے ظفر کی طرف دیکھا۔ "بھیا —— یہ نہ جائیں گے"۔ انھوں نے

اپنی آن کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا۔ بی۔ اے آنرز اور فلسفہ میں ایم۔ اے پھر ان کا مطالعہ بھی کتنا وسیع ہے۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے کیا نہیں کیا۔ قلی یہ بنے۔ پتھر انھوں نے ڈھوئے۔ لوگوں کو جوتے انھوں نے پہنائے۔ ذلیل سے ذلیل انسانوں کی موٹر ڈرائیوری انھوں نے کی۔ کارخانوں میں مزدوری انھوں نے کی۔

تو میں تمھیں اور کملا کو ضرور لے جاؤں گا۔ ایسی مصیبتوں میں ہرگز نہیں چھوڑ سکتا ——— جگدیش نے کہا۔

* * * * * * * * *

کانتا نے ہاتھ پاؤں جوڑ کر جگدیش سے یہاں رہنے کی اجازت لے لی تھی مگر جگدیش ہر تیوہار پر سو روپیہ کملا کے نام سے بھیجتے رہتے۔ اُن کی بیوی ہر آنے جانے والے کے ہاتھ گھی کے کنستر، چاولوں کی بوریاں، کپڑے کے تھان، کانسے کے برتن مٹھائیاں، ساڑھیاں، تحفتاً بھیجا کرتیں۔ ہولی ——— دیوالی ——— بھیّا دوج ——— رکشا بندھن پر اُس کے بھائی بھابی ایک عمدہ زیور کا تحفہ دیتے۔ غرضکہ اُن کا سارا خرچ نہایت شان کے ساتھ اس کا بھائی چلا رہا تھا اُس طریقے پر کہ وہ اس کے لینے سے انکار بھی نہ کر سکتے تھے۔ تحفہ اور بھینٹ کے نام کی وجہ سے۔

* * * * * * * * *

اب جگدیش نے اپنی مشہور و معروف فرم کی برانچ بمبئی میں کھول دی ہے۔ جس کا منیجر ظفر کو بنا دیا ہے۔ ڈھائی سو تنخواہ مقرر کر دی ہے۔ سال میں دو بار کانتا کو اپنے یہاں بُلاتے ہیں۔ اور واپسی پر اس کی بھابی، اس شان و شوکت سے وداع کرتی ہے گویا کوئی لڑکی پہلی بار میکے سے وداع ہو کر سسرال جا رہی ہو۔ کانتا کے کسی خط میں ذرا بھی افسردگی کا شائبہ پاتے ہی بھائی بے چین ہو جاتا ہے اور یا تو خود اُس کے پاس آجاتا یا اُسے لیسے ایسے بہانوں سے بلاتا کہ وہ جانے پر مجبور ہو جاتی۔ اور طرّہ یہ کہ اُس کی بھلائی تفریح اور آرام کی خاطر بلاتا ہے۔ اور احسانمند خود ہوتا ہے کہ "میری بہن کتنی اچھی ہے بھائی کا اتنا خیال رکھتی ہے"۔

* * * * * * * * *

ہندو اور مسلمان، جگدیش اور کانتا کو دیکھ کر حیران رہتے ہیں۔ ان کی محبت لوگوں کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ انھیں حقیقی بھائی بہن مان لیں۔ ایک ہی گھر میں دو دو ماہ ساتھ رہنا ساتھ کھانا پینا۔ ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ ساتھ سیر کرنا۔ کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ مگر کانتا کی گفتگو اور طور طریق سے صاف جھلکتا ہے کہ وہ مسلمان ہے اور جگدیش ہندو ہے۔ اور پھر یہ دونوں بھائی بہن بھی ہیں ———

جگدیش ایک مرتبہ شدید بیمار ہو گیا تھا ایسا کہ جاں بلب تھا۔ یہ وقت کانتا کی زندگی میں سب سے بُرا وقت تھا وہ جب جگدیش کے پاس ہوتی تو ضبط کئے رہتی اور ویسے پورے تین ماہ لوگوں نے اُس کے آنسوؤں کو تھمتے نہیں دیکھا۔ ایک بار تو اُس نے اپنے دو سالہ لڑکے کو اٹھا کر بھائی پر سے وار ڈالا کہ یہ مر جائے مگر میرا بھائی بچ جائے۔

تین بجے رات کو اٹھ کر وہ دعا مانگا کرتی کہ میں مر جاؤں میرے بچے مر جائیں مگر میری پیاری بھابی کا سہاگ قائم رہے۔

جب پہلی بار جگدیش کا ٹمپریچر نارمل ہوا ہے تو تھرما میٹر کو دیکھتے ہی کانتا خوشی سے اچھل پڑی۔ وہ فرط مسرت سے پاگل سی ہو گئی۔ وہ بڑی بھابی کو خوشخبری سنانے۔ اس پر سُہاسنی نے مسکرا کر کہا کہیں خوشی میں کوٹھے سے چھلانگ نہ لگا دینا۔ ———

" کانتا ــــ تو کیا تم سچ مچ چلی جاؤ گی" بڑے پُر درد لہجے میں جگدیش نے اسٹیشن پر بہن سے کہا ــــ کانتا ہنسنے لگی... اُس کی بھابھی بھی ہنس پڑی اور کہا کہ تمھیں کیا اب بھی شک ہے کہ کانتا نہیں جائے گی اور کل صبح بمبئی اسٹیشن پر ظفر جو اُسے لینے آئے گا ـ اُسے مایوس کرے گی ــــ

" اچھا جاؤ ــــ لڑکیاں پرایا دھن ہوتی ہیں" ــــ

جگدیش نے افسردگی سے کہا ــــ اُس کا مُنہ اُترا ہوا تھا ـ کانتا بھی غمگین ہو گئی ــــ گاڑی چھوٹنے والی تھی ــــ وہ بھابھی سے لپٹ کر آبدیدہ ہو گئی ـ اُس کی بھابھی نے اُسے چُوم کر رخصت کیا ـ گاڑی نے سیٹی دی ـ اور آہستہ آہستہ چلنے لگی ـ کانتا کی نظریں اپنے پیارے بھائی کے افسردہ چہرے پر تھیں ـ جو گاڑی کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہی ساتھ دُھندلا نظر آ رہا تھا اور جگدیش کی نظریں اُن دو بڑے بڑے گلاب کے پھولوں پر تھیں جو آج ہی چلتے وقت کوٹھی کے باغ میں سے اُس نے توڑ کر اپنی بہن کو ہدیتاً دیئے تھے جنھیں کانتا نے ساڑی کے بروچ کے ساتھ اٹکا لیا تھا ـ

* * * * * * * * *

" تم اس طرح میری پوجا کبھی نہیں کرتیں حالانکہ پتی کی پوجا کرنا چاہیئے ــــ ظفر نے کانتا سے کہا جبکہ وہ اپنی میز پر لگے ہوئے اپنے بھائی جگدیش کے فوٹو کو پھولوں سے سجا رہی تھی ـ

اُس نے جواب دیا ـ بھائی کی محبت آسمانی محبت ہے پاکیزگی اور لطافتوں سے پُر ــــ پتی کی محبت اس زمین کی محبت ہے اور نچلے درجے کی چونکہ اس میں نفس کا بھی دخل ہے اگر اس طرح پرستش کی خواہش تھی تو پھر شادی نہ کرنا چاہیئے تھی لوگوں نے ہمیشہ اس پاکیزہ جذبۂ محبت کو نفسانیت سے ملا کر گدلا کیا ہے ـ محبت جیسی پاک چیز کو لوگ نفسانیت کے آئینے میں ہی دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں ـ میاں بیوی یا عاشق و معشوق کی محبت کے سوائے دوسرے قسم کی محبت کو پنپنے کا موقعہ ہی نہیں دیا جاتا ـ مگر میرا خیال ہے کہ بھائی بہن کی محبت سے بڑھ کر اور کوئی محبت نہیں ہو سکتی ــــ

زندگی ــــ از محترمہ شہزادی بیگم صبا

میری حیرت و تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب میں سوچنے لگتی ہوں کہ آخر زندگی کیا چیز ہے ! فلسفی اس کا فلسفہ بیان کرتا ہے ! شاعر اُس کے راگ الاپتا ہے ! ادیب اس پر خیال آرائی اور صوفی اس پر ”رائے زنی“ کرتا ہے ـ

فلسفی کہتا ہے ! زندگی ایسا پھول ہے جو صبح کھلتا ہے اور شام کو مرجھا جاتا ہے ـ "زندگی ایک شمع ہے جو شب بھر جلتی ہے اور صبح ہوتے ہی بُجھ جاتی ہے" ـ شاعر کہتا ہے ! "زندگی ایک خواب پریشاں ہے جس کی تعبیر نہیں ـ زندگی ایک راز نہاں ہے جس کی تفسیر نہیں ـ زندگی اس باغ کے مانند ہے جس میں اگر قدم سنبھل سنبھل کر نہ رکھا جائے تو دامنِ حیات چاک چاک ہو جائے" ـ ادیب کہتا ہے زندگی ایک کلی ہے ایک غنچہ ہے جو بادِ فنا کے ایک تُند جھونکے سے منتشر ہو کر بکھر جاتی ہے ! صوفی صافی کہتا ہے زندگی ایک ایسا خوشنما پھول ہے جو اُس وقت تک نہیں مرجھاتا جب تک عبادتِ خداوندی سے اس کی آبیاری ہوتی رہے اس چندروزہ زندگی میں انسان کو چاہیئے کہ وہ نیکیاں فراہم کرلے ـ

میرے معبود ! آخر یہ زندگی وہ کونسا معمہ ہے جو آج تک کسی سے حل نہ ہو سکا ؟ میں ابھی تک انہیں خیالی راہوں میں مصروف تھی کہ یکایک میرے کانوں میں بلبلِ شیراز کی روح نغمہ سنج ہو نکلی اور ہاتفِ غیبی نے آواز دی کہ زندگی ایک سربستہ راز ہے جس کا انکشاف انسانی عقل سے ہنوز بعید از قیاس ہے ـ موت ہی کے ہاتھوں اس کی نقاب کشائی ہوتی ہے ـ

" وجود ما معمائیست حافظ کہ تحقیقش فسون ست و فسانہ !!! "

"تنویر" سے خطاب

از:- حضرت بدرؔ تسلیمی رامپوری

اے حسین و مہ جبین و حورِ عین و نازنین — اے گلِ باغِ جہاں اے فخرِ سکانِ زمین
مستیاں ہیں سارے عالم کی ترے انداز میں — سیکڑوں رعنائیاں ہیں چشمِ افسوں ساز میں
تیرے ماتھے کی شکن سے کانپ جاتے ہیں خیال — منفعل ہے شوخ چشمی سے تری چشمِ غزال
تیرے سر پر گیسوئے مشکیں ہیں تیرے لاجواب — چھا گیا موجِ نسیمِ صبح پر جیسے سحاب
ہائے یہ معصوم نظریں اور مژگاں کی قطار — لوٹتا دیکھا ہے کانٹوں پر یہ قیسِ دل فگار

تیرے رُخساروں کی سُرخی کہہ رہی ہے بے حجاب
ایک گل سے گلشنِ عالم میں ہوگا انقلاب

تو نے جانے کیوں اُلٹ دی رُوئے انور سے نقاب — ہو گئی جلووں سے شرمندہ ضیائے ماہتاب
حُسنِ طبعِ اہلِ فن ہے مخزنِ علم و ہُنر — مرکزِ اہلِ نظر ہے خوبیٔ کلکِ سحر
کہہ رہے ہیں آج یہ بیگانۂ علم و ادب — ہند میں تنویر ہے افسانۂ علم و ادب
قدر اربابِ ادب کرتے ہیں تیرے کام کی — طول و عرضِ ہند میں شہرت ہے تیرے نام کی
گھٹ نہیں سکتا گھٹائے سے ترا جوش و خروش — معنوی فرزند تیرے ہیں سبھی اربابِ ہوش
ہوتا جاتا ہے جہاں واقف تری توقیر سے — تیرا رتبہ کم نہیں تنویرِ عالمگیر سے
بمبئی کو آگرہ کا تو نے ہمسر کر دیا — آگرہ کیا ہند کو تو نے منوّر کر دیا

بدرؔ خوشگو کی دعا ہے اس لئے شام و سحر
حشر تک یونہی رہے تو زینتِ دستِ سحر

لڑکیوں کی قربانیاں

شریمتی ستیا دیوی صاحبہ

ایک مرتبہ مجھ سے ایک پچاس سالہ سرحدی پٹھان نے کہا کہ وہ ابھی تک ناکتخدا ہے کیونکہ اسے اپنی محبوبہ سے شادی کرنے میں ۳۰۰ روپیہ خرچ کرنا پڑیں گے۔ اس کے قبیلے میں یہ رواج ہے کہ ہر شخص کو اپنی ہونیوالی بیوی کے لئے کچھ جمع کرنا پڑتا ہے گو اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہو چکی ہے لیکن اب بھی اس کا خیال ہے کہ اس سے شادی کرے گا جس سے وہ محبت کرتا ہے اور اسی لئے ہر روز اپنی آمدنی کا کچھ حصہ ایک چھوٹے سے بکس میں رکھ دیا کرتا ہے۔

ہندو سماج میں ایک انوکھا رواج ہے۔ لڑکی کے والدین لڑکے کے ماں باپ کو جہیز کی صورت میں کچھ روپے دیتے ہیں۔ جو انکی اپنی ملک ہوتی ہے۔ اسے وہ جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ یہ رواج لڑکیوں کے والدین کے لئے سخت تکلیف دہ اور موجب دقت ہو رہا ہے۔ اگلے زمانے میں جاہل والدین لڑکی کے پیدا ہوتے ہی اسے مار ڈالتے تھے۔ (اگرچہ اب بچہ کشی جرم قرار دے دیا گیا ہے) اب بھی ایسے جاہل اور لالچی والدین بافراط پائے جاتے ہیں جو اس جہیز کے ذریعے طرح طرح سے روپے کما رہے ہیں اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ والدین اپنے لڑکے کی منگنی اس شرط پر کرتے ہیں کہ لڑکی کے والدین اپنے داماد کو اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیجیں۔ خوش حال والدین اس پر بھی راضی ہو جاتے ہیں لیکن جب وہ لڑکا وہاں سے واپس آتا ہے تو وہ پہلی منگنی توڑ کر کسی دوسری جگہ شادی کر دیتے ہیں۔

ایک پنجابی ہندو نے اپنی لڑکی کی منگنی ایک نوجوان سے کی اور اس کو تحفہ کے طور پر ایک موٹر اور دو لاکھ روپے دیئے۔ وہ نوجوان روپیہ اور موٹر تو ہڑپ کر گیا لیکن لڑکی اب تک باپ ہی کے گھر ہے۔ شمالی ہند کے ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ اس نے کس طرح ایک نوجوان کو گرفتار کرایا جس نے جہیز کے ذریعہ روپیہ حاصل کرنا اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔

"بے بس لڑکیاں"

جہیز، خواہ وہ کسی صورت میں ہو ایک لعنت ہے۔ اکثر لالچی لڑکے کمزور اور بیمار لڑکیوں سے محض اس لئے شادی کر لیتے ہیں کہ انہیں اپنے دولت مند خسر سے کافی رقم ملنے کی اُمید ہوتی ہے ہماری سماج میں اب تک لڑکیوں سے ناروا اور ظالمانہ سلوک جائز ہے۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ ان کا مذہب صرف ماں باپ اور ظالم شوہر کے مظالم کو خاموشی سے برداشت کرنا ہے۔ لوگ جس چیز کو شادی کہتے ہیں وہ ایک طرح سے بے بس لڑکیوں کو سجا کر بینڈ باجے کے ساتھ مذبح میں لے جانے کے مترادف ہے۔

تعلیم یافتہ لڑکیاں

یہ بات موجب اطمینان ہے کہ اب کچھ تعلیم یافتہ لڑکیاں اس یکطرفہ اقتصادی لوٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہی ہیں۔ اس طرح عورتوں کے حقوق پر چھاپہ مارا جا رہا ہے۔ ہندو رواج

کے مطابق شادی کے بعد تمام چیزیں خاوند کی مِلک ہو جاتی ہیں۔ اس رواج کے خلاف پروٹسٹ کے طور پر ۱۹۳۲ء میں چار بنگالی لڑکیوں نے خودکشی کر لی۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اور انھوں نے اپنے پیچھے جو کچھ لکھ چھوڑا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"وہ اس لئے خودکشی کر رہی ہیں کہ ان کے والدین کو اعلیٰ خاندان کا لڑکا تلاش کرنے میں بہت سا روپیہ جمع کرنے کی دقت نہ ہو اور وہ ان اعلیٰ خاندان کے لڑکوں کو کل روپے دیکر اپنے دوسرے بچوں کی حق تلفی نہ کریں۔ اس لئے اگر ہندوستان میں شادی کے مسئلے میں کچھ اصلاح ہو جائے تو اس سے لڑکی اور لڑکا دونوں کے والدین کا فائدہ ہو سکتا ہے۔ شادی کے موجودہ رواج میں دو اصلاحوں کی سخت ضرورت ہے۔

ایک یہ کہ جہیز کے طور پر جو روپیہ دیا جائے وہ لڑکے اور لڑکی دونوں کے صحت کی حفاظت اور ان کے دیگر دنیاوی ضروریات پر خرچ کیا جائے نیز اس کے لئے سنٹرل اسمبلی میں ایک بل پیش کیا جائے جس کی رو سے جہیز صرف لڑکے کی مِلک قرار نہ دی جائے۔ اس طرح لڑکا اور لڑکی ان لالچی والدین کے ظلم کے چنگل سے نکل جائیں گے جو اپنے لڑکوں کی شادی صرف جہیز کے لئے کرتے ہیں۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ لڑکیوں کے والدین اپنی حیات میں کچھ نہ دیں بلکہ جب وہ مرنے لگیں تو ان کے لئے کچھ روپیوں کی وصیت کر جائیں اگر یہ قانون بنجائے تو تو کوئی خاوند اپنی بیوی کا روپیہ نہ اڑا سکے گا۔ اور بیویوں کو بھی اطمینان رہے گا کہ اگر کسی وجہ سے اس کا خاوند اسے طلاق دے دے تو وہ اپنے باپ کے جمع کئے ہوئے روپوں سے گزارہ کر سکتی ہے۔ یورپ میں یہی رواج ہے اور اگر ہندوستان میں بھی اس رسم کو اختیار کیا جائے اور یہ قانون بن جائے تو یقیناً بہت فائدہ رہے گا۔

مترجمہ:۔ ملک عزیز احمد ارکوئی
از علی گڑھ

رباعی

نہ حاکم کی حکومت پر نہ اسکی تمکنت پر جا
نہ بزدل بن نہ ڈر ہو کر جو کرنا ہی تجھے کر جا
حمیت اور خودداری نہ ہو تو حیف ہی جینا
جو غیرت ہو تو خود اپنے لہو میں ڈوب کر مر جا

شارق دہلوی

رباعی

ارباب جنگ سے ہمیں پیکار بھی نہیں
سوراج مانگنے سے ہمیں عار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

شارق دہلوی

سماج کی مجرم

از جناب قیصر امراوتی

دن کے ۱/۲ ۱۰ بجے ہوں گے کہ لیڈی ڈفرن شفاخانہ کلکتہ کے سامنے سڑک پر خلقت کا غیر معمولی ہجوم ہونے لگا شہر کے پڑھے لکھے ان پڑھ، جوان بوڑھے اور بچوں کا تانتا بندھا ہوا تھا تماشائیوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ شفاخانہ کی سڑک پر کھوے سے کھوا چھل رہا تھا انسانوں کے اس بحر ذخار میں جگہ جگہ لوگ چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بٹے ہوئے اپنی اپنی اطلاعات کی صحت کے دعویدار ہو کر اس ہیجان انگیز واقعہ کے متعلق پیشگوئیاں کر رہے تھے۔ جس نے سارے شہر میں سنسنی پھیلادی تھی حالانکہ اصل حقیقت ابھی تک پردۂ راز ہی میں تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ ایسی بیرحمی اور سنگدلی کا مرتکب ایک تعلیم یافتہ دولتمند نوجوان کن حالات اور واقعات کے تحت میں ہوا ہوگا۔

ٹھیک ۱۱ بجے مسٹر داراب جی این ڈونشا مجسٹریٹ درجۂ اول کی موٹر شفاخانہ کے پھاٹک کے سامنے آکر ٹھیری۔ مجسٹریٹ موصوف خان بہادر عبدالوحید خاں اور خان صاحب فرخ حسین کی معیت میں موٹر سے اُتر کر شفاخانہ کے احاطہ میں داخل ہوئے۔ پھاٹک کے اندر برآمدے میں ملزم خلیل حسن ایک بنچ پر پولیس کی زیر حراست بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی گرفتاری کے بعد نہیں معلوم کیوں خلیل حسن نے ضمانت داخل کر کے رہا ہونے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔

دو تین منٹ کے انتظار کے بعد لیڈی ڈاکٹر مسز براؤن کی اجازت ملنے پر یہ جماعت ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئی کمرے کے وسط میں ایک میز کی دونوں طرف کرسیاں بچھی ہوئی تھیں سامنے ایک آہنی پلنگ پر ایک خاتون جس کی عمر بمشکل ۱۹ یا ۲۰ سال ہوگی پشت گردن اور پہلوؤں میں نرم نرم تکیوں کے سہارے نیم دراز لیٹی ہوئی تھی صرف چہرہ کھلا ہوا تھا' پیشانی۔ ناک اور رخساروں پر پٹیاں چڑھی ہوئی تھیں ان پٹیوں کی لپیٹ میں خاتون کے تمام خدوخال چھپ گئے تھے اور چہرہ بھیانک نظر آرہا تھا مگر اُس کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ گلاب کی پتیوں کی طرح نرم و نازک ہونٹ جو خشک ہو رہے تھے چہرہ کا سُرخ و سپید رنگ جو زرد ہو کر اور نکھر گیا تھا۔ اور اس کے لانبے لانبے سیاہ بال اس کے غیر معمولی حسین ہونے کا ثبوت پیش کر رہے تھے ۔

مریضہ کے پلنگ سے لگی ہوئی کرسی پر مسز براؤن بیٹھی ہوئی مریضہ سے مسکرا مسکرا کر گفتگو کر رہی تھی۔ پاس ہی چھوٹی سی میز پر چند دواؤں کی شیشیاں گلاس' چمچ اور ٹائم پیس رکھی ہوئی تھی جس کی مسلسل ٹک ٹک کمرے کے سکوت میں مخل ہو رہی تھی۔

مسٹر داراب نے کمرہ میں داخل ہو کر رسم تعظیم ادا کی اور مریضہ سے اظہار ہمدردی کے بعد مسز براؤن سے یہ معلوم ہونے پر کہ مریضہ کی حالت ابھی اس قابل ہے کہ اُس کا بیان لیا جاسکے کرسی پر بیٹھ گئے اور ملزم کو طلب کیا۔

ملزم خلیل حسن خاں سیٹھ انوار حسن خاں مرحوم کی لاکھوں روپیہ کی جائداد کا تنہا وارث ایک چوبیس سالہ جوان تھا۔ اس کا جسم چھریرا۔ چہرہ بیضاوی اور رنگ گندمی تھا۔ گھنی بھویں، لانبی پلکیں اور بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ جن کے ڈھیلے باہر نکلے پڑتے تھے۔ کنپٹی اور رُخساروں میں گڑھے پڑ گئے تھے پیشانی کسی قدر تنگ تھی اور ایک ہفتے سے ڈاڑھی مونچھ نہ بنوانے کے سبب سر اور ڈاڑھی مونچھوں کے بال اس طرح بڑھ گئے تھے کہ چہرہ سے وحشت برس رہی تھی۔

خلیل حسن خاں نے انٹرنس تک تعلیم پائی تھی' انٹرنس پاس کرنے کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ کپڑے کی تجارت میں چار سال

تک مصروف رہا۔ سیٹھ انوار حسن خاں مرحوم کی زندگی میں وہ ایک جوان تھا مگر باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کی زندگی میں یکایک حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو گیا۔ جوانی، خود مختاری، اور دولت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ خود غرض اور مطلب پرست دوستوں کی کثرت اور ان کی بیجا و بیجا ستائش اور خوشامد نے نوجوان میسر کو بہت جلد گمراہ کر دیا اور آخر کار اُسے آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا جس کی خاندان انوار حسن خاں مرحوم کے کسی فرد سے ہرگز توقع نہ ہو سکتی تھی ——

سپاہی جب اُسے کمرہ میں لائے تو مریضہ کے پلنگ کی پائنتی اور میز کی داہنی طرف اسے دیوار سے کھڑا کیا گیا۔ اور اب مجسٹریٹ مسٹر داراب کے استفسار پر نوجوان خاتون نے پہلے خلیل حسن کی طرف ایسی نظروں سے جنہیں حسرت، ندامت اور محبت کی سیکڑوں نیائیں پنہاں تھیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ایک لمبی سانس لینے کے بعد اس نے اس طرح بیان لکھوانا شروع کر دیا۔

میرا نام جمیلہ ہے اور میں زمیندار صدیق حسن خاں صاحب کی اکلوتی لڑکی ہوں، میں اردو لکھ پڑھ سکتی ہوں دو سال ہوتے ہیں کہ میری شادی ان کے ساتھ (خلیل حسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ہوئی شادی کے بعد ایک سال تک کوئی ناگوار واقعہ یا غیر معمولی بات پیش نہیں آئی۔ مگر میرے خسر سیٹھ انوار حسن خاں صاحب کے انتقال کے دو مہینہ بعد ہی سے میرے شوہر اکثر راتوں کو غیر حاضر رہنے لگے یا آدھی آدھی رات کے بعد گھر واپس ہونے لگے۔ میں جو ان کی منتظر رہا کرتی اور ان کی آمد پر دریافت حال کے لئے ان کی خواب گاہ میں پہنچتی تو یہ کوئی نہ کوئی عذر کر کے ٹال دیا کرتے۔ صبح ناشتہ کے بعد ہی دکان پر چلے جاتے اور پھر [illegible] کی واپسی کا کوئی [illegible] مقرر نہ تھا۔ [illegible] طرح مہینوں گزر گئے اور سیٹھ نے مجھے کبھی موقع ہی نہیں دیا کہ میں ان [illegible] بیٹھ کر دریافت حال کر سکتی۔ ایک صبح جبکہ سیٹھ ابھی ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ میں نے مکان پر دیر سویر سے آنے جانے کے متعلق تذکرہ چھیڑ دیا۔ سیٹھ برہم ہو کر کہنے لگے کہ تم کیا جانو میں کن پریشانیوں میں مبتلا ہوں، والد کے انتقال کے بعد سے مالی مشکلات روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں مرحوم دکان مقروض چھوڑ گئے ہیں اگر کاروبار سے لاپروائی برتی گئی اور معاملات نہ سنبھالے گئے تو بہت جلد دیوالیہ ہو جانے کا اندیشہ ہے خدا کے واسطے تم میرے گھر آنے نہ آنے کے معاملے میں پریشان نہ ہوا کرو، اپنے گھر کے انتظامات سنبھالے رہو۔ میں بہت جلد ان مشکلات پر قابو پا لوں گا۔

میں یہ سُن کر خاموش ہو گئی۔ اُس دن مجھے پہلی مرتبہ یہ علم ہوا کہ دکان مقروض ہے اور صورت اس قدر نازک ہے کہ ہمارے دیوالیہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ میں شب و روز اپنے شوہر کی پریشانیوں کے دور ہو جانے کے لئے دعائیں مانگا کرتی۔ میں نے نمازیں پڑھیں روزے رکھے منتیں مانیں۔ شب بیداریاں کیں اور ....

یہاں جمیلہ کی روشن اور چمکدار آنکھیں جنہیں شرافت، نیکی اور معصومیت آنسوؤں میں نہا رہی تھی پھوٹ نکلیں اور وہ سسکیاں لے لے کر بچوں کی طرح رو پڑی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ [illegible] حافظہ وہ تمام تکلیفیں اور ریاضتیں جو اس نے اپنے [illegible] کی پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے اٹھائی تھیں اُسے ایک [illegible] یاد دلا رہا ہے اور اُس کا دل خون ہو کر بہا جا رہا ہے ——

لیڈی ڈاکٹر مسز براؤن کا اشارہ پاتے ہی نرس نے گلاس میں ایک عرق کے چند قطرے ٹپکائے اور تھوڑا سا پانی ملا کر مریضہ کو پلا دیا۔ دوا پیتے ہی مریضہ نے آنکھیں بند کر لیں اور خاموش ہو گئی کمرے کے در و دیوار پر کامل سکوت [illegible] تھا گھڑی کی ٹک ٹک اور مریضہ کے تنفس کی دھیمی [illegible] کے علاوہ ہر چیز ساکت اور خاموش تھی۔ یہ سکوت لحظہ بہ لحظہ [illegible] ہوتا جا رہا تھا [illegible] براؤن نے مریضہ کی نبض دیکھی اور اطمینان ہو جانے پر کہ کوئی اندیشہ نہیں

مریضہ سے آہستہ آہستہ اپنا بیان لکھوانے کے لئے کہا۔ مریضہ نے آنکھیں کھول دیں اور خلیل کی طرف دیکھ کر پھر رو پڑی۔ خلیل اپنی آنکھیں نیچی کئے ہوئے پیکرِ تصویر بنا ہوا کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹ دانتوں میں دبے ہوئے تھے شاید اس طرح وہ اپنے ضمیر کی بے پناہ سرزنش برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مریضہ نے کہا یہ غلط تھا۔ بالکل غلط تھا کہ تجارتی معاملات خراب ہو رہے تھے اور دکان مقروض تھی میرے خسر کافی سرمایہ چھوڑ کر مرے تھے۔ سیٹھ نے مجھ سے غلط کہا تھا کہ دیوالیہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ حالانکہ اس دن تک بنک میں ۵ لاکھ روپیہ ہمارا جمع تھا یہ سب کچھ مجھے جلد معلوم ہو گیا ——

جب سے سیٹھ نے مجھے اپنی پریشانیوں کا حال بتلایا تھا میں نے کبھی سیٹھ کی آمد و رفت کے متعلق پوچھ گچھ نہیں کی اور نہ اپنے دل میں کسی قسم کی بدگمانی ہی پیدا ہونے دی۔ مگر ایک رات جب کہ میں اتفاقاً سیٹھ کی خوابگاہ میں پہنچی تو کمرہ کو شراب کی تیز بدبو سے مہکتا ہوا پایا خادمہ قالین پر سے قے کی ہوئی غلاظت صاف کر رہی تھی میرا سر چکرانے لگا اور میں کمرہ سے نکل آئی۔ بوڑھی خادمہ سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک عرصہ سے شراب پینے لگے ہیں اور اکثر کمرہ کی یہی حالت ہوا کرتی ہے مگر سیٹھ کی سخت تاکید تھی کہ آپ کو خبر نہ ہونے پائے اس لئے میں نے آج تک آپ سے ذکر نہیں کیا ——

میں صبح تک اپنے بستر پر پڑی روتی رہی سیکڑوں خیالات آئے سیکڑوں بدگمانیاں پیدا ہوئیں مگر میں نے خود ہی اس طرح اپنے دل کو تسلی دے لی کہ سیٹھ نے شاید اپنا غم غلط کرنے کے لئے شراب شروع کر دی ہے اور اس طرح گو اپنے ہاتھوں آپ دوسری تباہیوں کا شکار ہو رہے ہیں مگر میں جب ان کے قدموں پر سر رکھ کر درخواست کروں گی کہ میرے سرتاج شرابی ہو کر جینے کے مقابلے میں دیوالیہ ہو کر زندہ رہنا کہیں بہتر ہے تو وہ ضرور مان جائیں گے۔ اپنی اس مقصد برآری کے لئے میں نے اس روز صبح ناشتہ ہی پر سیٹھ صاحب سے ملنا چاہا مگر وہ بلا ناشتہ کئے چلے گئے۔

مجھ سے ناشتہ نہیں ہو سکا۔ دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ میں سراپا انتظار رہی تھی کہ دکان کا ایک ملازم خبر لایا کہ سیٹھ ایک ضروری کام کے لئے بمبئی جا رہے ہیں اور جلد واپس آ جائیں گے ....

مریضہ کو پیاس معلوم ہوئی اشارہ پانے پر نرس نے سرد پانی کا گلاس مریضہ کے ہونٹوں سے لگا دیا مجسٹریٹ مسٹر داراب نے اپنی عینک آنکھوں سے اتار کر رومال سے شیشے صاف کرتے ہوئے خلیل پر حقارت آمیز نظر ڈالی جو ابھی تک فرش پر نظریں گاڑے ہوئے کھڑا تھا۔ ملزم کا وکیل نریمان جس کے دل میں جمیلہ سے ہمدردی اور اپنے موکل کی طرف سے نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو رہے تھے بار بار بے چینی سے کرسی پر پہلو بدل رہا تھا

کمرہ کا سکوت بھیانک سناٹے میں تبدیل ہو گیا تھا اور ہر شخص کی نظریں خلیل کے چہرے پر لعنت ملامت کے تیر برسا رہی تھیں۔

جمیلہ کسی قدر سستا چکی تو اس نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہنے لگی۔

سیٹھ چار مہینے بمبئی رہے مگر مجھے کوئی خط نہیں لکھا۔ دکان کے کارندوں نے میرے کئی خطوط رجسٹری روانہ کئے جن کی رسیدیں ملتی رہیں مگر سیٹھ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا سیٹھ کی غیر حاضری میں مجھے ان کی ایک سال کی زندگی کی کہ وہ تمام حالات حرف بحرف معلوم ہو گئے جن سے میں قطعی بے خبر رکھی گئی تھی —— اب میری نیندیں اچاٹ ہو گئیں تھیں میری بھوک مر گئی تھی میرا سینہ بوجھل ہوتا گیا اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ بجائے دل کسی نے میرے سینہ میں بھاری سل رکھ دی ہے۔ سیٹھ اور سیٹھ کے ساتھ ہی اپنا مستقبل بھی مجھے تاریک نظر آنے لگا مگر میں مجبور تھی بے بس تھی اس سے زیادہ کسی چیز پر میرا بس ہی نہیں تھا کہ گھر کے کسی کونے میں ٹھیکرا لیا کروں اور تمام رات کانٹوں کے بستر پر کروٹیں لیکر گزار دیا کروں۔

میری ہر شام شامِ مصیبت اور ہر صبح صبحِ قیامت سے کم نہیں تھی دن اسی طرح گذرتے گئے۔ راتیں اسی طرح روتے روتے بسر ہوتی رہیں میری آنکھیں متورم ہو گئیں مگر میرے آنسو نہ تھمے۔ میرا دل زندگی سے اُچاٹ ہو گیا اور موت مجھے جان سے زیادہ عزیز معلوم ہونے لگی چار سوا چار مہینے اسی طرح گزر گئے کہ ایک روز صبح مُنیم جی نے اطلاع کرائی کہ سیٹھ کا تار آیا ہے اور وہ میل سے پہنچنے والے ہیں۔

اس خبر نے میرے جسم میں برقی رَو دوڑا دی میری تاریک اور ویران دنیا میں اُمید کی کرنوں نے اُجالا کر دیا مجھے اپنے گزشتہ پُر مسرت ایام دوبارہ واپس ہوتے ہوئے معلوم ہونے مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے جو کچھ کھو دیا تھا۔ اسے ضرور پالوں گی اور اب یہ غمناک اور اداس دن اور یہ سوگوار راتیں مجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے والی ہیں ۔۔۔ ملازموں کو کوٹھی کی صفائی کے لئے تاکید کی سیٹھ کی خوابگاہ کو خود آراستہ کیا۔ چار سوا چار مہینے کے بعد آئینہ خانہ میں پہنچی جب میں نے آئینہ میں اپنا سراپا دیکھا تو مجھے آپ ہی اپنی حالت زار پر رحم آگیا۔ میرا شباب ڈھلا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے، میرے رخسار مرجھا گئے تھے میرے ہونٹوں پر بجائے سُرخی کے ہلکی ہلکی سیاہی نمودار ہو چلی تھی، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی سی نظر آ رہی تھیں خفیف حرارت نے میرے رنگ و روغن کو جھلس کر رکھ دیا تھا۔ اور میں ایک دق میں مبتلا مریضہ سے بدتر نظر آ رہی تھی ۔۔۔ مگر میں خوش تھی اس خیال سے کہ میری قابل رحم حالت سیٹھ کو ضرور میری طرف متوجہ کرے گی اور وہ ۔۔۔

یہاں پھر جمیلہ کے آنسو ڈھلک پڑے اور وہ ایک لمبی سانس لے کر خاموش ہو گئی اس کے آنسوؤں کے قطرے زخم کی پٹیوں کو نم کر رہے تھے۔ دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ اس نے بےچین ہو کر اپنے سینہ پر سے چادر سرکائی تو پیشانی اور رخساروں کی طرح سینہ اور بازوؤں پر بھی [illegible] پٹیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ [illegible] نے کسی قدر [illegible] اٹھانا [illegible] اور کہنا شروع کیا ۔۔۔

[illegible] کے بعد بھی سیٹھ صاحب کے برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا [illegible] دو بجے کوٹھی پر واپس ہونا۔ وہ مجھے گفتگو کا موقع نہ دیتے ہوئے دکان پر چلے جانا [illegible] کوشش کی کہ جس طرح سیٹھ کے قدموں سے لپٹ کر [illegible] مگر یہ سعادت میری قسمت ہی میں نہ تھی [illegible] سیٹھ نے [illegible] موقع دیا۔ دو ڈھائی مہینے اسی حالت گزر گئے۔ اور آخر مجھ سے وہ گناہ سرزد ہو ہی گیا جس کی پاداش [illegible] بھگت رہی ہوں جمیلہ نے ایک ٹھنڈی سانس [illegible] نے دوا کا گلاس ہونٹوں سے لگا دیا۔ دوا پی کر وہ چپ ہو گئی۔

ڈاکٹر [illegible] لکھتے لکھتے رک گئے۔ ثریان ملزمہ کا [illegible] کی طرف سے ہمدردی کے جذبات موجزن تھے [illegible] کامیاب وکیل تھا بلحاظ پیشہ اس کا فرض تھا کہ وہ [illegible] کے لئے انتہائی کوشش کرے اور [illegible] بڑی بات جو [illegible] کے [illegible] مگر تاجلے ابھی تک ثریان کو قطعی [illegible] اپنے موکل خلیل سے متنفر ہو چلا تھا اور [illegible] کوئی ہمدردی نہیں ہی تھی مگر اب وہ [illegible] ارتکاب جرم کا سبب [illegible] تھوڑی دیر خاموش [illegible] ۔۔۔

[illegible] کی رات کو سیٹھ خلاف معمول جلد کوٹھی

گھر آگئے۔ خادمہ نے مجھے اطلاع دی، میں خوش ہوگئی اس خیال
سے کہ شاید آج مجھے اپنی دیرینہ تمناؤں کے بر آنے کا کوئی لمحہ میسر آجائے
اور میں اپنے روٹھے ہوئے شوہر کو منالوں گی۔ مجھے مایوس ہی ہونا
پڑا کیونکہ مجھے خادمہ سے معلوم ہوا کہ آج بھی سیٹھ نشہ میں مست سرشار
ہوکر گرتے پڑتے آئے ہیں۔ خواب گاہ کا دروازہ بند کر لیا ہے اور
سخت تاکید کر گئے ہیں کہ کوئی سیٹھ کو جگانے نہ پائے ———

میرے صبر کا پیمانہ جو لبریز ہو چکا تھا۔ چھلک پڑا۔ میں نے فوراً
اپنے بوڑھے ملازم کریم کو آواز دی کہ وہ بگھی تیار کروائے۔ اپنے ساتھ
اپنی خادمہ کو لیا اور بگھی میں سوار ہوکر کوچوان کو [illegible] شہر کی مشہور
طوائف بسنتی جان کے مکان پر ہمیں پہنچائے۔ کوئی [illegible] کے بعد
کوچوان نے ایک سہ منزلہ حویلی کے سامنے بگھی روک دی۔ کریم کے بار
بار دستک دینے پر دوسری منزل پر ایک بوڑھا نظر آیا جو شاید بسنتی
کا ملازم معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے کہا کہ بائی جی اس وقت کسی سے
ملاقات نہیں کرسکتیں۔ مگر کریم کے اصرار کرنے پر اور میری التجا
پر کہ بائی جی سے کہو کہ ملاقات کرنے والی ایک عورت ہے جو
دس منٹ سے زیادہ آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرے گی۔ وہ اوپر
چلا گیا اور خبر دی کہ بائی صاحبہ یاد فرما رہی ہیں۔

میں تیزی سے بگھی سے اتری جلدی جلدی زینہ کی سیڑھیاں
طے کرنے کے بعد جیسے ہی بغلی کمرہ تک پہنچی۔ میرا دل دھڑکنے لگا
میرے پیر ڈھیلے ہو گئے میں بت کی طرح کھڑی رہ گئی۔ یہاں میں
عجیب کشمکش میں مبتلا ہوگئی۔ کبھی خیال ہوتا کہ اپنے شوہر کی بلا اجازت
اس کی مرضی کے خلاف ایک ایسے مکان میں جو عصمت فروشی کی دکان
ہے۔ رات کو تنہا آنے کا مجھ کو کوئی حق نہیں تھا کبھی یہ خیال آتا
کہ جو کچھ میں کرنا چاہتی ہوں، بلا تامل کے چلی جاؤں اور مجھے پس و پیش
نہ ہونا چاہیے۔ ابھی میں کوئی قطعی فیصلہ کرنے بھی نہ پائی تھی کہ بوڑھے
کی آواز نے مجھے چونکا دیا کہ چلئے بائی صاحبہ منتظر ہیں۔ میں نے قدم اٹھایا
ہی تھا کہ اندر سے کسی مرد کے قہقہہ کی آواز سنائی دی میں رک گئی اور
اپنی خادمہ سے کہا کہ وہ جاکر بسنتی بائی سے میری طرف سے درخواست کرے
کہ میں ان سے تنہائی میں ملنا چاہتی ہوں ذرا وہ اسی کمرہ میں تشریف
لے آئیں بوڑھی خادمہ گئی اور خبر لائی کہ بائی صاحبہ اسی کمرہ میں تشریف
لاتی ہیں۔ ذرا ٹھہرئیے خادمہ نے یہ بھی بتلایا کہ بسنتی اس وقت ایک
نوجوان کے بغل میں بیٹھی ہوئی شراب گٹک رہی ہے میں یہ سنکر
کانپ گئی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور میں نے بسنتی سے
ملے بغیر ہی واپس ہو جانے کا فیصلہ کر لیا ابھی میں سنبھلنے بھی نہ پائی تھی
کہ بسنتی جھومتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی اور کہنے لگی تم کون ہو اور مجھ
سے کیا چاہتی ہو کمرہ شراب کی تیز بدبو سے بھبک گیا میرا سر چکرانے
لگا مگر میں اپنے دلی تقاضہ سے مجبور ہوکر بسنتی کے قدموں پر گر پڑی
میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں نے روتے ہوئے
کہنا شروع کیا۔ بسنتی بائی میں سیٹھ خلیل حسن کی بیوی جمیلہ ہوں
اور تمہارے پاس اپنی جان کے مالک اور سر کے تاج کی بھیک مانگنے آئی
ہوں بسنتی بائی تم بھی عورت ہو۔ تمہارے سینے میں بھی عورت ہی کا دل
ہے۔ خدا کے لئے سوچو تو سہی کہ ڈیڑھ سال سے تم نے میرے جانِ
دل کے مالک کو مجھ سے چھین لیا۔ میرا گھر ویران اور میرا کھانا پینا
حرام ہوگیا۔ تمہاری صحبت میں وہ شراب کے عادی ہوگئے چار مہینے
تک تم اُن کو بمبئی، رنگون، کراچی اور خدا جانے کہاں کہاں لئے پھریں
برسات کا موسم وہ ولولہ انگیز موسم جس میں سوکھے کھیت ہرے ہو جاتے
ہیں، ویران زمین لہلہانے لگتی ہے، درختوں میں نئی کونپلیں نکلنے
اور دلوں میں فرحت و انبساط کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں اس پر بہار
موسم میں تم نے میری راحت کی کھیتی میں آگ دے کر اسے اجاڑ دیا
ڈیڑھ سال ہوتا ہے بسنتی بائی میرا بستر جو پھولوں کی سیج تھا انگاروں کا

بچھونا ہو گیا ہے میرا گھر جس میں فردوس کی ہوائیں اور جنت کی مسرتیں کھیلا کرتی تھیں، جہنم کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ اپنے پیشے کے لحاظ سے تم کچھ ہی ہو مگر میری ہی طرح ایک عورت ہو۔ تمہارے سینے میں بھی عورت ہی کا دل ہے، سر میں عورت ہی کا دماغ ہے اور جسم میں عورت ہی کی لطیف روح۔ تم بسنتی بائی صرف تم ہی میری مصیبتوں اور میرے دکھوں کا صحیح اندازہ کر سکتی ہو۔

میں روتی جا رہی تھی اور اپنے دل کی بھڑاس نکالے جا رہی تھی خدا جانے میں نے اور کیا کیا کہا مگر اتنا احساس مجھے ضرور ہوا کہ میں نے اپنا سینہ چیر کر اپنا مجروح دل بسنتی کو ضرور دکھا دیا ہے۔ میرے آنسو میری التجائیں بیکار نہیں گئیں۔ اس نے مجھے اپنے قدموں پر سے اٹھایا۔ میں نے اسے مہربان پایا تو اٹھ کر اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال کر اور سر سینہ پر رکھ کر روئی اور خوب روئی یہاں تک کہ بسنتی کی ریشمی ساری اور عنابی قمیص دونوں تر ہو گئے ـــ

بسنتی نے میرے گالوں کو تھپک تھپک کر کہنا شروع کیا۔ جمیلہ خاتون سچ کہتی ہو۔ میں بھی تمہاری ہی طرح عورت ہوں اور مجھے بھی ایک ویسا ہی دل، ایسا ہی دماغ اور ایسی ہی روح ملی تھی جیسی کہ تمہارے حصے میں آئی تھی ـــ میں تمہاری ممنون ہوں کہ تم نے مجھے ایک بار پھر یاد دلا دیا ہے کہ میں عورت ہوں اور مجھے عورت ہی کی سی زندگی گزارنا چاہئے۔ جمیلہ خاتون! بسنتی اقرار کرتی ہے کہ وہ تمہیں اب کسی شکایت کا موقع نہ دے گی۔ جمیلہ خاتون میں تمہاری دعاؤں کی محتاج ہوں۔ جاؤ اور میرے حق میں دعا کرتی رہو کہ میں اپنے اقرار پر مضبوطی سے قائم رہوں اور خدا مجھے بھی تمہاری ہی جیسی عورتوں کی سی زندگی گزارنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے ـــ

بسنتی رو رہی تھی۔ میں نے اپنے دوپٹے کے آنچل سے بسنتی کے آنسو پونچھے مگر اس کے آنسوؤں کی جھڑی نہ تھمی۔ ایک مرتبہ اور بسنتی سے گلے مل کر رخصت ہوئی۔ وہ مجھے نیچے تک پہنچانے آئی اور بگھی میں سوار ہوتے وقت سہارا دیا۔ اس وقت بسنتی عصمت فروش نہ تھی۔ میرے راحت و آرام کی ڈاکٹر۔ میری نظروں میں نیکی کا فرشتہ اور شرافت کی ایسی دیوی تھی جس نے میری زندگی کی ناؤ کو بھنور میں سے نکالنے کے لئے خود کو گرداب میں ڈال دیا تھا ـــ

بگھی میں سوار ہوتے ہی میرا بوجھل سینہ ہلکا معلوم ہونے لگا۔ میرے دل میں مسرت کی لہریں اٹھنے لگیں۔ میرا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ رات کے پچھلے پہر تک میں اپنے آپ کو مسرت و انبساط کی لہروں میں تیرتی ہوئی پاتی رہی۔ سوئی تو صبح تک دل خوش کن خواب دیکھتی رہی۔ جاگی تو اپنے آپ میں نمایاں تغیر محسوس کیا۔ یہ صبح میرے لئے صبح عید کی طرح آئی تھی جو عرصہ ڈیڑھ سال سے خواب و خیال ہو گئی تھی ـــ

مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ ہماری زندگی کے لمحات مسرت اکثر و بیشتر ہماری آنے والی مصیبتوں اور آفتوں کا پیش خیمہ ہوا کرتے ہیں۔

مسز براؤن نے مریضہ کو آرام دینے اور سستانے کے لئے کہا۔ جمیلہ خاموش ہو گئی مگر زخموں کی تکلیف اور سوزش سے بے چین ہو کر بار بار کراہنے لگی ـــ

مسٹر براؤن نے قلم رکھ دیا ـــ اور میز پر دونوں کہنیوں کو ٹیک کر اپنی ہتھیلیوں پر اپنے رخسار رکھ کر جمیلہ کے چہرے کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ ان کی شگفتہ آنکھوں اور پرتبسم چہرہ سے وہ مسرت پنہاں اور جذبۂ احترام ٹپک رہا تھا جو مریضہ کی آہ و زاری پر ان کے دل میں پیدا ہو رہا تھا ـــ

نریمان جو ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا اپنے موکل خلیل پر نفرت آمیز نظر ڈالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور کمرہ سے نکل گیا ـــ

خان بہادر عبدالحمید دلدار جو معمولی پڑھے لکھے انسان تھے اور دنیا میں صرف ایک ہی خوبی کے مالک تھے کہ زر و زمین کی جائداد [illegible]

روپیہ سالانہ کی آمدنی ہو جایا کرتی تھی اپنے پندار میں مرلیفیہ کی اس جسارت کو مسلمانوں کی سماجی زندگی کے قوانین کے خلاف ورزی سمجھ کر چیں بہ جبیں ہو رہے تھے ان کی نظروں میں جمیلہ نے ایک ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا جس کی سزا اُسے ہر طرح ملنی ہی چاہیئے تھی۔

— ۵ — منٹ کے وقفے کے بعد مسٹر دارا نے بیان لکھنا شروع کیا — جمیلہ نے کہا دن بخوبی گزر گیا — شام کو سیٹھ جلد گھر آگئے — رات کو قریب ۹-۱/۲ بجے مجھے طلب کیا میں بے تحاشا دوڑی ہوئی پہنچی — پہلو میں رکھی ہوئی انگیٹھی پر اسٹو سلگ رہا تھا — اور اس پر — آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، کمرے میں قدم رکھتے ہی سیٹھ نے مجھے گھور کر دیکھا — ان کی آنکھوں سے خون برس رہا تھا ان کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ میں نے دوڑ کر سیٹھ کے قدموں پر سر رکھ دیا — مگر انھوں نے میری چوٹی کے بال پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے اٹھا کر پوچھا تو بستی کے گھر گئی تھی؟ میں نے عرض کیا میرے سرتاج مجھ سے یہ خطا ضرور ہوئی مگر میں ....

سیٹھ نے گرج کر کہا — بس میں اب اور کچھ سننا نہیں چاہتا اور مجھے گھسیٹتے ہوئے اسٹو کے پاس لے گئے وہ غصے سے دیوانے ہو رہے تھے شرارے نے آگ پر تیل کا کام کیا تھا انھوں نے مجھے گالیاں دیتے ہوئے لوہے کی گرم سلاخ سے چہرے کو داغنا شروع کیے۔ میں چیخی، چلائی تڑپی، گڑگڑائی اور رحم و کرم کی درخواستیں کرتی رہی مگر شرارۂ غصہ نے ان کے دل میں رحم و کرم کا گزر ہی نہ ہونے دیا — آخر ناقابل برداشت سوزش اور شدت درد و کرب سے تھا بے ہوش ہوگئی — جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو شفا خانہ میں پلنگ پر پڑا ہوا پایا — بستی میری پائینتی بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی ——

خلیل جو سر سے پیر تک پسینے میں شرابور گردن جھکائے دیوار کے سہارے کھڑا ہوا تھا۔ بستی کا نام سن کر چونک پڑا اور کانپنے لگا مسٹر دارا کے اشارہ پر سپاہیوں نے اُسے فرش پر بٹھا دیا۔

جمیلہ نے جو ابھی تک درد و کرب کی شدت کو بڑے ضبط و استقلال سے برداشت کیے ہوئے تھی۔ اُٹھ بیٹھنے کی کوشش کی مگر ضعف و نقاہت نے اُسے اُٹھنے نہ دیا اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اس کی آنکھوں میں روشنی اور چمک پیدا ہو گئی تھی۔ ایسی روشنی اور چمک جس کا پہلا نشان ہی نہیں تھا وہ کروٹ بدلنا چاہتی تھی مگر بازوؤں اور پہلو کے زخموں کے سبب کروٹ بھی نہ بدل سکی اور اُسی طرح اپنی داستانِ درد شروع کر دی بستی سے مجھے معلوم ہوا کہ متواتر تین روز تک میں بے خبری کے عالم میں پڑی رہی منٹ دو منٹ آنکھیں کھولنے کے بعد مجھ پر بار بار غنودگی اور نیم بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی۔ چوتھے روز میں اس قابل ہوئی کہ آہستہ آہستہ گفتگو کر سکوں، میں نے بستی سے سیٹھ کے بابت پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اس واقعہ کے بعد کہیں چلے گئے ہیں۔ بستی اپنے آپ کو میری مصیبتوں اور تکلیفوں کا ذمہ دار قرار دے کر مجھ سے معافی مانگتی رہی۔ اُسی سے مجھے معلوم ہوا کہ جس رات میں بستی سے مل کر واپس ہوئی اس کے دوسرے دن شام کو اس نے سیٹھ خلیل حسن سے بیزاری کا اظہار کیا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ آئندہ ان سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھے گی۔ باتوں باتوں میں اس نے سیٹھ پر یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ میں اس کے مکان پر پہنچی تھی اور میں نے ہی اُسے اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ اپنی پرمعصیت زندگی سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر چکی ہے ——

جمیلہ نے کھانستے ہوئے کہا کہ میں نے بستی کو یقین دلا دیا کہ اس کا کوئی قصور نہیں میں آج بھی اُسے اپنی محسنہ سمجھتی ہوں۔ جمیلہ اپنا

ہاتھ پیر دبا رہا تھا اور اسے دبانی جا رہی تھی۔ مسز براؤن نے یہ حالت دیکھی تو اسے مزید بیان دینے سے روکنا چاہا مگر اُس نے کہا میں چراغ سحری ہو رہی ہوں اور صرف گھڑی دو گھڑی کی مہمان ہوں۔ مجھے آج ہی اپنی خطاؤں اور گناہوں کا اقرار کر لینے دو۔ تاکہ میرے دل سے بوجھ اتر جائے اور میں طمانیت اور سکون کی موت مر سکوں۔ اس نے کہنا شروع کیا ۔۔۔۔

میں اپنے موجودہ مصائب کی آپ ذمہ دار ہوں اور سیٹھ قطعی بے قصور ہیں۔ میں نے سیٹھ کے ذاتی معاملات میں مداخلت کی ان کی بلا اجازت ایک ایسی جگہ رات کو چلی گئی جہاں کوئی شریف خاتون جانا گوارا نہیں کریگی میں نے سنتی طوائف کے قدموں پر سر رکھ کر اپنے شوہر کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔ میری ان قابلِ ملامت حرکات نے سیٹھ کو مشتعل کر دیا اور وہ غصہ سے دیوانے ہو کر آپے سے باہر ہو گئے میں اپنے شوہر کو اس حالت میں بھی منا لیتی مگر میری بدقسمتی کہ وہ اس رات کو بھی شراب کے نشہ میں چور ہو رہے تھے۔ خدا کے لئے میری ایک درخواست قبول فرمایئے اور مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے شوہر کے قدموں پر سر رکھ کر اپنی خطائیں اور اپنے قصور معاف کرا لوں۔"

مسٹر دارا نے اجازت دی تو سپاہی خلیل کو جمیلہ کے پلنگ کے پاس لے آئے ابھی خلیل پلنگ پر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ جمیلہ نے اپنے دونوں ہاتھ خلیل کی گردن میں حمائل کر دیئے اور رونے لگی۔ ۔۔۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میرے سرتاج اپنی کنیز جمیلہ مرنے والی جمیلہ کی آخری درخواست قبول فرمایئے اور اس کی خطائیں اس کے قصور اس کے گناہ بخش دیجئے تاکہ قبر میں اس کے جسم کو چین اور عالم بالا میں اس کی روح کو اطمینان نصیب ہو سکے۔

خلیل تڑپ اٹھا اور کہنے لگا جمیلہ معصوم مظلوم مجسمہ نیکی و شرافت، تیرا یہ عیاش۔ شرابی۔ ظالم بے رحم اور قاتل شوہر ان تمام مصائب کا تنہا ذمہ دار ہے جس میں تم ہمہ گرفتہ رہیں۔ میں وہ تمام سخت سزائیں بھگتنے کے لئے تیار ہوں جن سے انسان کی روح کانپ اٹھتی ہے اور میں اس کا مستحق ہوں کہ مجھ پر مطلق رحم نہ کیا جائے جمیلہ پیاری جمیلہ میں کس منہ سے کہوں کہ تم میری خطائیں بخش دو میرے گناہ معاف کر دو۔ شرابی، عیاش، ناعاقبت اندیش خلیل کے گناہ۔ اس کی ناقابلِ درگزر خطائیں

جمیلہ نے سنا تو شدت کے ساتھ رونے لگی خلیل خود بھی چیخیں مار مار کر رو رہا تھا۔ کمرہ ان رونے والوں کے شور سے گونج اٹھا۔ کمرہ میں بیٹھنے والے آبدیدہ ہو گئے اور کسی کو یہ خیال نہ رہا کہ مریضہ کے لئے یہ صورت حال مہلک ثابت ہو رہی ہے۔ یکایک مریضہ کا تنفس تیز ہو گیا۔ لب خشک ہو گئے اور ہچکیوں کا تار بندھ گیا مسز براؤن نے بمشکل دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا مگر اب وہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا جس کی جمیلہ کو حسرت تھی۔ اور جس کے لئے اس کے ہڈیوں کے ڈھانچے میں چند سانسیں آ جا رہی تھیں اس کا شوہر خلیل اس کے سامنے اپنی ندامت، شرمساری کا اظہار اور اپنی ناقابل معافی خطاؤں کا اقرار کر چکا تھا ۔۔۔

نرس نے دوا کے چند قطرے حلق میں ٹپکائے جمیلہ نے آنکھیں کھول دیں پانی طلب کیا اور حسرت بھری نظروں سے خلیل کی طرف تکتی رہی۔ ابھی پانی کے دو چار گھونٹ بھی حلق سے اترنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک زور کی ہچکی نے تمام جسم کی رگیں کھینچ کر مریضہ کے جسم کو ایک زور کا جھٹکا دیا۔ گردن نڈھال ہو کر ایک طرف لڑھک گئی۔ ۔۔۔ آنکھیں نیم وا ہو کر رہ گئیں اور دو ایک مبہم ہچکیوں کے ساتھ جمیلہ کی مقدس روح نے اس جسم فانی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا ۔۔۔

جب اس پیکر وفا اور مجسمہ شرافت کی روح پاک نے

اعمال حسنہ کا مہکتا ہوا سہرا زیب سر کئے عالم قدس میں داخل ہوئی تو حوریں آب حیات کے جام رنگیں لئے ہوئے دوڑیں، رضوان نے گلشن فردوس کے پھولوں سے گندھے ہوئے ہار پہنائے اور ساکنانِ عرش کی آنکھیں اس نسوانی عظمت و تقدس کے آگے جھک گئیں ــــ

یہاں اس تفصیل کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ خلیل کے مقدمہ میں عدالت نے کیا کیا قانونی کارروائیاں اختیار کیں۔ مختصرہ یہ کہ خلیل کے اقبالِ جرم کے بعد وہ ایک طویل میعاد قید کاٹنے کے لئے جیل کی آہنی چار دیواری میں بند کر دیا گیا جہاں وہ اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے ــــ شہر میں یہ داستان ابھی تازہ ہے جس کا جا بجا تذکرہ ہوتا رہتا ہے خصوصاً خان عبدالوحید خاں اور خانصاحب فرخ حسین کے دولتکدوں پر جب ان کے ہم خیال احباب کا جمگھٹا ہوا کرتا ہے تو کسی نہ کسی پہلو سے جمیلہ اور خلیل کے مقدمہ کے حالات پر گفتگو ہو ہی جاتی ہے یہ دونوں بزرگ آج تک جمیلہ کی مذمت باز نہیں آئے اور سمجھتے ہیں کہ جمیلہ اسی سلوک کی مستحق تھی جو خلیل نے اس کے ساتھ روا رکھا ــــ

تجلیاتِ اُفق

از مصورِ حقیقت حضرت میر اُفق کاظمی امروہی

جمال اور تمھارا جمال کیا کہنا جلال اور تمھارا جلال کیا کہنا
تصور اور تمھارا تصور رنگیں خیال اور تمھارا خیال کیا کہنا
فروغ اور تمھارا فروغ حسن فروز کمال اور تمھارا کمال کیا کہنا
تقرب اور تمھارا تقرب دائم وصال اور تمھارا وصال کیا کہنا
اشارہ اور تمھارا اشارۂ مبہم سوال اور تمھارا سوال کیا کہنا
سلوک اور تمھارا سلوک جذب نواز یہ حال اور تمھارا یہ حال کیا کہنا
نوازش اور تمھاری نوازش پیہم نوال اور تمھارا نوال کیا کہنا
شکایت اور تمھاری شکایت ہمہ ناز ملال اور تمھارا ملال کیا کہنا
مباحث اور تمھارے مباحث پرپیچ جدال اور تمھارا جدال کیا کہنا

کلام اور تمھارا کلام میر اُفق
مقال اور تمھارا مقال کیا کہنا

آجکل

اثرِ خامہ جناب منظر صدیقی صاحب اکبرآبادی مدیر "نوائے ایشیا" آگرہ

اِک ماہِ نو "اُمید کا عنواں ہے آجکل
تقدیر میری صفحۂ تاباں ہے آجکل

جو چیز ہے جمال بداماں ہے آجکل
تا حدِ چشم شوق چراغاں ہے آجکل

کس کا خیال روح میں مہماں ہے آجکل
پروازِ زیست تا بہ کہکشاں ہے آجکل

قسمت مری شریکِ بہاراں ہے آجکل
سر پھوڑ دیکھ کر مجھے خنداں ہے آجکل

فطرت جنوں کی سر بہ گریباں ہے آجکل
دستِ طلب بہ حسن کا داماں ہے آجکل

کل تک غریبِ عشق کا دل تھا اسیرِ غم
غم آشنائے کاکلِ پیچاں ہے آجکل

خود چُن رہی ہے خار دلِ نامراد سے
فطرت ادا شناسِ رگِ جاں ہے آجکل

خود کر رہا ہے عشق مری رہنمائیاں
جو کام تھا محال وہ آساں ہے آجکل

ہے تیرگیٔ بخت سے اک جنگ ان دنوں
تدبیرِ عشق مشعلِ تاباں ہے آجکل

ہوں ان دنوں تمام حوادث سے بے نیاز
دل سے وداعِ ہر غمِ دوراں ہے آجکل

پھر دل میں اک اُمنگ سی پیدا ہے ان دنوں
"اللہ کرے" یہ سرا پُرساں ہے آجکل

مستقبلِ حیاتِ محبت ہوا شروع
پیشِ نظر نئی ادا درخشاں ہے آجکل

میں آج کل ہوں صرف خیالِ جمالِ دوست
میرا خیال عرش بداماں ہے آجکل

آ اے حیاتِ تازہ بڑھا کیفِ زندگی
پھر تجھ سے ربط و ضبط کا ارماں ہے آجکل

گل بانگِ عیش سے ہے شگفتہ نفس نفس
اک نغمہ زار سازِ رگِ جاں ہے آجکل

رگ رگ میں دوڑنے لگی روحِ گل و سمن
ہر سانس نکہتِ موجِ گلستاں ہے آجکل

اللہ رے یہ سلسلہ جنبائیٔ خیال
حد سے سوا تصور جاناں ہے آجکل

جگنو ہیں اور پھول ہیں تارے ہیں اور چاند
ان سب کے ساتھ روح غزل خواں ہے آجکل

وا ہو چکا ہے میرے لئے باب آرزو
"مستقبل حیات درخشاں ہے" آجکل

میں وجد میں ہوں کیف تصورات لئے ہوں
اور کائنات دل ہے کہ رقصاں ہے آجکل

اے شام عشق کسب ضیائے جمال کر
"ماہ تمام حسن" درخشاں ہے آجکل

انداز نو سے چھیڑ رہا ہے رباب عشق
منظر حریف بزم سخنداں ہے آجکل

نکات

تنویر کیلئے

(از محترمہ زیب عثمانیہ صاحبہ گولڈ میڈلسٹ)

یہ کس کی خودی ضرب کف پا سے ہوئی چور
سرمایہ و افلاس میں ہیں جنگ کے آثار

مرعوب گل بخیہ! تجھے کیا نہیں معلوم
خار و خس و خاشاک بھی ہیں شامل دیوار

اس قوم کی عظمت کا زمانہ ہے ابھی دور
جس قوم کا شاعر نہیں دانندۂ اسرار

صیاد کے کھٹکے سے ہی آہو کا لہو خشک
قوموں کے بھی ہیں ضعف خودی کے یہی آثار

عیسیٰ کی زباں طاقت اعجاز کی مظہر
موسیٰ کا عصا قوت بازو کا ادا کار

جمہوریت اس دور کی لاحاصل و بے سود
جس دور کے جمہور نہیں فارغ و خود دار

اے زیب خدا مست ہے خوش بختی ہی فطرت
اس فضل کے ملا و برہمن نہیں حق دار

ایک عورت کا خواب

مترجمہ جناب تمنائی

(۱)

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں بہشت میں خدا کے تخت کے سامنے کھڑی تھی اور خدا نے مجھ سے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے کہا "میں اپنے بھائی مرد پر نالش کرنے آئی ہوں۔"

خدا نے پوچھا: "اس نے کیا کیا ہے؟"

میں نے کہا: "اس نے میری بہن عورت کو لے لیا ہے اور اسے مارا ہے، زخمی کیا اور باہر سڑک پر نکال دیا ہے۔ وہ اوندھے منہ وہاں پڑی ہے۔ اس کے (مرد کے) ہاتھ خون سے لال ہیں۔ میں یہاں فریاد کرنے آئی ہوں کہ اس سے حکومت چھین لی جائے کیونکہ وہ اس کے قابل نہیں۔ اور مجھے دے دی جائے۔ میرے ہاتھ بے داغ ہیں"

میں نے اپنے ہاتھ دکھائے۔

خدا نے کہا: "تیرے ہاتھ بے داغ ہیں — اپنا دامن اٹھا"

میں نے اٹھایا۔ میرے پیر لال تھے، خون ا خون! جیسے کہ میں شراب میں چل کر آئی ہوں!

خدا نے کہا: "یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا: "پیارے آقا! زمین کی سڑکیں کیچڑ سے بھری ہیں۔ اگر میں ان پر سے ہو کے آتی تو میرے کپڑوں پر دھبے آجاتے تو دیکھتا ہے یہ کیسے سفید ہیں! اس لئے مجھے راستہ تلاش کرنا پڑا۔"

خدا نے کہا: "کس چیز پر سے؟"

میں خاموش رہی اور دامن گرا دیا۔ میں نے اپنا لبادہ لپیٹ لیا اور آہستہ سے باہر نکل گئی۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں فرشتے مجھے دیکھ نہ لیں۔

(۲)

ایک مرتبہ پھر میں بہشت کے دروازہ پر کھڑی تھی — میں اور ایک اور۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے تھے۔ ہم بہت تھکے ہوئے تھے۔ ہم نے بڑے پھاٹکوں کو دیکھا۔ فرشتوں نے انھیں کھولا اور ہم اندر گئے۔ کیچڑ ہمارے کپڑوں پر تھی......

ہم سنگ مرمر کی گچ پر سے چلتے ہوئے تخت تک پہنچے۔ تب فرشتوں نے ہمیں جدا کر دیا۔ "اسے انھوں نے سب سے اوپر والی سیڑھی پر پہنچا دیا لیکن مجھے سب سے نیچے والی پر، کیونکہ وہ بولے! "اس مرتبہ جب یہ عورت آئی تھی تو اس نے گچ پر قدموں کے لال نشان چھوڑے تھے اور ہمیں اپنے آنسوؤں سے دھونا پڑا تھا۔ اسے اوپر نہیں جانے دینا چاہئے"

تب اس نے جس کے ساتھ میں آئی تھی پیچھے مڑ کر دیکھا اور میری طرف اپنے ہاتھ پھیلائے۔ اور میں دوڑ گئی اور اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اور فرشتے (وہ نوری ہستیاں جو کبھی گناہ نہیں کرتیں اور نہ دکھ سہتی ہیں) ہمارے پاس پاس ادھر ادھر ٹہل رہے تھے میرا خیال ہے کہ اگر ہم دونوں نہ ہوتے تو تنہائی محسوس کرتے کیونکہ فرشتے اتنے روشن اور پُر نور تھے۔

خدا نے پوچھا کہ میں کیوں آئی تھی۔ میں نے اپنی بہن کو تھوڑا اور آگے کر لیا کہ خدا اسے دیکھ لے۔

خدا نے کہا: "آج تم دونوں یہاں ایک ساتھ کیسے آئیں؟"

میں نے کہا: وہ سڑک پر گری ہوئی تھی اور لوگ اس کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ میں اس کے ساتھ لیٹ رہی اور اس نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور اس طرح میں نے اسے اٹھایا اور ہم دونوں ساتھ ساتھ آئے۔"

خدا نے پوچھا: "اب تم کس کے خلاف فریاد کرنے آئی ہو؟"

میں نے کہا: "کسی کے بھی نہیں۔"

اور خدا نے آگے کی طرف جھک کے کہا: "میرے بچو۔ تمہیں کیا چاہیئے؟"

اور اس نے جو میرے ساتھ تھی میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ میں دونوں کی طرف سے بولوں۔

میں نے کہا: "ہم یہ کہنے آئی ہیں کہ تو ہمارے بھائی مرد سے گفتگو کرے اور ہمیں اس کے لئے ایک پیام دے جسے وہ سمجھ سکے اور وہ ـــــ"

خدا نے کہا: "جاؤ، اس کے پاس میرا پیام لے جاؤ!"

میں نے کہا: "لیکن وہ پیام کیا ہے؟"

خدا نے کہا: "وہ تمہارے دلوں پر لکھا ہے۔ اسے اس کے پاس لے جاؤ"

اور ہم جانے کے لئے مڑے۔ فرشتے ہمارے ساتھ دروازہ تک آئے۔ انہوں نے ہمیں دیکھا اور ایک نے کہا:

"آہ! لیکن ان کے لباس کتنے خوبصورت ہیں!"

اور دوسرے نے کہا: "جب وہ اندر آئی تھیں تو میں نے خیال کیا کہ ان پر کیچڑ پڑی ہے۔ لیکن یہ تو ایک سونے کے ہیں!"

لیکن تیسرے نے کہا: "ہونہہ! یہ ان کے چہروں کا نور ہے!"

اور ہم اس (مرد) کے پاس واپس گئے! (اولیو شرینر)

غزل

از جناب سردار غلزئی صاحب

قسمت نے جو دیا ہے وہ ساماں نہ پوچھئے
کچھ بے کسی میں حال پریشاں نہ پوچھئے

دیوانہ ہو گیا ہوں کسی مست ناز کا
کیوں پھر رہا ہوں سر بہ گریباں نہ پوچھئے

دھوکا دیا ہے ایک حسیں کی نگاہ نے
اب زندگی ہے کیف بداماں نہ پوچھئے

ہے بیخودی میں ان کے تصور سے گفتگو
دیوانگی میں کیف کے ساماں نہ پوچھئے

سجدے ہیں بار بار کسی پائے ناز پر
میرے مذاقِ عشق کا ساماں نہ پوچھئے

ڈر ہے خدا سے دور نہ ہو جاؤں میں کہیں
کیا شے ہے مجھ سے جلوۂ جاناں نہ پوچھئے

تشریح کر رہا ہوں محبت کی غلزئی
اب آپ مجھ سے معنیٔ قرآں نہ پوچھئے





واڈیا ریلیز

سنڈر مووی ٹون کا حیرت خیز اسٹنٹ پکچر

جس کے متعلق یہ خیال ہے کہ ایسے خطرناک حسن و عشق کے پس منظر اب تک کسی فلم نے پیش نہیں کئے۔

سال رواں کے اسٹنٹ فلموں میں "طوفان ایکسپریس" کی رفتار سب سے زیادہ ثابت ہوگی۔

طوفان ایکسپریس

ڈائرکٹر چنی لال پاریکھ

خاص اداکار

جال مرچنٹ

راجکماری (چترا فیم)

آغا۔ نظیرہ۔ گلشن

شہزادی۔ ماسٹر محمد

چندر شیکھر۔ مینو دی سٹک وغیرہ

افسانہ و مکالمہ ساحل بلگرامی

۱۷ گھنٹے تک ہتھکڑی لگا کر پانی کے اندر رہنے والے نوجوان مسٹر گھوش کے ٹریبیے سے بمبئی تک ۱۲ میل پانی کے اندر ہی اندر آنے کا فوٹو پبلک لیمنگٹن میں دیکھے

طوفان ایکسپریس کے گانوں کے ریکارڈز ٹوئین کمپنی سے خریدیئے

F. T. 5802

F. T. 5803

F. T. 5804

اوقات روزانہ

۵ ½ - ۸ - اور ۱۰ ¾ بجے شب کو

جمعہ، سنیچر اتوار و تعطیل کے دن ۲ ½ بجے دن کو زائد کھیل

لیمنگٹن ٹاکیز اور سوریہ ٹاکیز

لیمنگٹن روڈ ۔۔۔ پر کھیل رہی ہیں



حسرتوں، ارمانوں، تمناؤں اور یاس و اُمید سے ہی زندگی مزین ہے

آرزوئیں کس طرح پوری ہوتی ہیں۔ یاس کس طرح آنکھیں دکھاتی ہے

اُمید کس طرح تھام لیتی ہے۔ یہ سب کچھ آپ اس فلم میں دیکھیں گے جو ساگر کا تازہ شاہکار ہے۔

اداکار کمار۔ مایا۔ ببّو۔ یعقوب۔ ہریش۔ پانڈے۔ بڈھوا ڈوانی وغیرہ

امپیریل سنیما بمبئی میں ۵ نومبر سے شروع ہے

فلمی خبریں

رنجیت مووی ٹون کا تازہ شاہکار "سکریٹری" جس کو ڈسٹرکٹ چتر بھج دوشی نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ ۲۱ راکتوبر ۱۹۴۳ء سے ویسٹ اینڈ ٹاکیز میں نہایت شان و شوکت سے چل رہا ہے۔ اس فلم میں مس مادھری مسٹر بیگ، ترلوک کپور، نے خوب کام کیا ہے۔ کمیانی کے بہت مقبول ہو رہے ہیں۔

ساگر مووی ٹون کا فلم "گراموفون سنگر" ہفتوں سے نہایت کامیابی کے ساتھ امپیریل سینما میں چل رہا ہے۔ اس کمپنی کا تازہ ترین شاہکار "پوسٹمین" گراموفون سنگر کے بعد اسی سینما میں پیش کیا جائے گا جس میں ستارہ اور مس مایا بنرجی نے اداکاری کے کمالات دکھائے ہیں۔

پربھات فلم کمپنی کا "گوپال کرشنا" سنٹرل ٹاکیز میں بدستور شان و شوکت سے اب تک چل رہا ہے۔

کمپنی کا نہایت زوردار فلم "میرا لڑکا" بالکل تیار ہے فیلم اپنی طرز کا پہلا فلم ہوگا جو پبلک سے خراج تحسین حاصل کرے گا۔

منروا مووی ٹون کا "وسنتی" بہت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ نسیم، یاکوب اور صادق علی کے کام کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ پکچر قابل دید ہے۔

واڈیا مووی ٹون میں چار چار پکچروں کی شوٹنگ زور و شور سے جاری ہے۔ "طوفان ایکسپریس" کے بعد زبردست فلم "پنجاب میل" آرہا ہے۔

نیو تھیٹرز کا جدید پکچر "او میکار" جس کو ڈسٹری بیوٹرز سیزر پکچرز لمیٹڈ ہیں اس فلم کا افتتاح راکسی ٹاکیز میں ۲۱ راکتوبر کو کیا گیا۔ اس پکچر کو مسٹر بروا نے ڈائرکٹ کیا ہے اور نیو تھیٹرز کے معیار کو قائم رکھا ہے۔ فلم قابل تعریف ہے۔

اس کے بعد نیو تھیٹرز کی ۳ فلمیں ریلیز ہو رہی ہیں

بڑی دیدی، پیٹرا۔ دشمن جو قابل دید ہوں گی۔

سرسوتی سینے ٹون پونا کا پکچر "سچ" ہے بالکل تیار ہے۔ عنقریب ہی نمائش کے لئے پیش کیا جائے گا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فلم لاجواب ہوگا۔

بمبئی ٹاکیز کا "چن" بمبئی میں ۹ ہفتے چلا۔ ہندوستان کی بہترین اداکارہ لیلا چٹنس اور اشوک کمار اور بیم سنگ اور سجن کا کام بہت خوب تھے۔ فوٹوگرافی اور صدابندی کے لحاظ سے بھی فلم بہت اچھا تھا خاص کر چاندنی کی گیتوں کے گانے بہت پسند کیے گئے تھے۔ حیدرآباد اور شملہ میں ٹکٹ گھر پر بے پناہ ہجوم دیکھ کر اسپیشل اندازہ ہوا کیونکہ آمدنی کے اعتبار سے فیلم ریکارڈ قائم کر دیا۔ مجموعی طور پر فیلم کامیاب ہوا اور سال رواں کے چیدہ فلموں میں سے ہے۔

احمدآباد، کراچی، پونا، دہلی، لاہور، حیدرآباد، بریلی، کانپور، گورکھپور، آجین ان تمام مقامات پر ہفتوں سے چل رہا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس فلم نے ہندوستان بھر میں درجہ مقبولیت حاصل کر لیا ہے۔

بمبئی ٹاکیز کا آنے والا فلم "بھابی" ہوگا۔

ہندوستان کی مایہ ناز پربھات فلم کمپنی کا انوکھا بہترین شاہکار

بہت جلد آرہا ہے

ڈائرکٹر :- کے . نارائن کالے







نوجوانی کے خون کا جوش ۔ ملکی خدمت کرنا ہمارا فرض اولین ہے ۔ ملک کو آزاد کرانا نوجوانوں کا سب سے پہلا کام ہے

اداکاران :- شانتا بائی ہبلیکر ۔ مایا بھٹ ۔ وسنت ٹھینگڈی

الہاس ۔ چھوٹو شانتا ۔ موزمدار ۔

بوا صاحب ۔ وتسلا جوشی ۔ بالکرام وغیرہ

MAYA BANERJEE



See her in Sagar's wonderful ...
P... man at Imperial

RAJKUMARI



See her in Sunder Movitone's "Toofan Express" at Lamington Talkies

SAIGAL



See him in "Street Singer"
New Theatre's latest



MADHURI Starring in Ranjit's ... the latest social picture running at West End Talkies Bombay

Printed at the Lakshmi Art Printing Works Sankli Street Byculla Bombay


ماہنامہ
تنویر
بمبئی
The TANVIR
MONTHLY
BOMBAY, 8
DECEMBER
1938.
مُدیرہ :-
”سحر“
Editress
SAHAR

SAJJAD HYDER AFRIDI
(Son of Josh Malihabadi)



A Young Member of 'Tanvir' Family

سالانہ ۸ ؎
ششماہی ۴/۸
فی پرچہ ۱۲/
مقامی ۳/



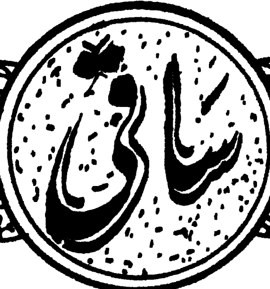
ماہنامہ تنویر
ہر انگریزی مہینے
کی ۷ ر تاریخ کو
شائع ہوتا ہے

نائب مدیرہ:۔ انوری خانم
مدیرہ:۔ سحر

جلد ۴ — فہرست مضامین — ماہ دسمبر ۱۹۳۸ء — شمارہ ۱۲

سحر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی سے چھپوا کر دفتر رسالہ تنویر کھتر و سانکلی اسٹریٹ بمبئی نمبر ۸ سے شائع کیا





از جناب ادیب مالیگانوی

کب تلک غم کا نہ اُلٹے گا ورق اے ساقی
دے زمانے کو محبت کا سبق اے ساقی

گرد باطل سے ہے، آئینۂ عالم دھندلا
کسی گوشہ سے دکھا، جلوۂ حق اے ساقی

ذکر تن کا نہیں، ویران ہے من کی دنیا
سینۂ اہل نظر کیوں نہ ہو شق اے ساقی

انجمن ہو گئی جب ربط و کشش سے محروم
غیر ممکن، کہ رہے نظم و نسق اے ساقی

ہائے یہ بزم امارت کے چھلکتے ہوئے جام
اُف، یہ پیشانیٔ غربت کا عرق اے ساقی

عقل سے ہو نہ سکا تشنگیٔ دل کا علاج
روئے تہذیب ہے اس شرم سے فق اے ساقی

دامنِ عشق میں پنہاں ہے سکونِ آدم
عشق ہے چارۂ اندوہ و قلق اے ساقی

دہر میں خونِ مشقت سے ہے تزئینِ چمن
آج بے پردہ ہے یہ راز ادق اے ساقی

کتنی صورت سے برستا ہے تباہی کا غبار
کتنے چہروں پہ شگفتہ ہے شفق اے ساقی

دے وہ اک ساغرِ معمورِ تجلی مجھ کو
جس سے روشن ہو دل سادہ ورق اے ساقی

تو وہ خاک اس انسان کو سمجھتا ہے ادیب
جس کے سینے میں ہو وسعتِ عمق اے ساقی

لمعات

باز پرس

ہمارے چند خریداروں اور ہمدرد اصحاب نے ہم سے باز پرس کی ہے کہ تنویر کانگریس کا حامی کیوں ہے" تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان باز پرس کرنے والوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ "کانگریس مکمل آزادی کی طالب نہیں — وہ برطانیہ کی دوست ہے اور ہندوؤں کی خیر خواہ"

تنویر کے پہلے پرچے سے لیکر آج تک کے پرچے پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہیں۔ کیا کسی بھی پرچے میں کوئی ایسا مقالہ یا نوٹ دکھایا جا سکتا ہے جو غیر ملکی حکومت کی حمایت یا خیر خواہی میں لکھا گیا ہو؟

تنویر شروع سے کہ اس وقت تک مکمل آزادی کا نعرہ بلند کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا آزادی کا نعرہ بلند کرنا گناہ ہے؟

اور اگر کانگریس بھی مکمل آزادی کی خواستگار ہے تو کیا محض اس کی مخالفت کو فرض سمجھ کر ضد میں آکر غلامی کی حمایت کرنا چاہیئے؟

اور اگر بقول مسلم لیگی صاحبان "کانگریس مکمل آزادی کی طالب نہیں ہے" تو پھر یہ حضرات کس بناء پر تنویر کو کانگریسی رسالہ کہتے ہیں؟ جبکہ تنویر مکمل آزادی کا حامی ہے۔ مشترکہ قومیت پر اس کا اعتقاد ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے۔ جبکہ مسلم لیگی اور مہا سبھائی ذہنیتیں جو دراصل بلکہ توام بہنیں اور غلامی کی پٹیاں ہیں۔ ان کا وجود مٹا دیا جائے۔ آج اگر کانگریس بنیادی طور پر مہا سبھا کی حمایت کرے یا مسلم لیگ کی مددگار بن جائے۔ تو سب سے پہلے قوم پرست طبقہ کا یہ فرض ہوگا کہ وہ کانگریس کے اس زہریلے حصہ کا آپریشن کر ڈالے۔ پھر اگر کانگریس ہندوستانیوں کے لئے حصول آزادی کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا مطمح نظر ہندوستان کی آزادی ہے اور تنویر بھی صرف اس معاملے میں اس کا ہمنوا ہے تو اس میں برائی کیا ہے؟ اور تنویر کون سا بڑا گناہ کر رہا ہے؟

بالفرض تمہارا مخالف اگر سچ کو اپنا شعار بنائے اور راہ راست پر چلے تو کیا تم کو جھوٹ اور کج روی اختیار کر لینا چاہیئے؟

ہمارے ایک مہربان حضرت نے لکھا تھا اور وہ بھی مفت کا نوٹ پڑھ کر کہ کانگریس کا بٹوا تنویر کی مدد کر رہا ہے۔ ہم ایسے ہی خیالات رکھنے والے تمام حضرات کو چیلنج کرتے ہیں کہ اگر وہ یہ ثابت کر دیں کہ کانگریس کی طرف سے ایک پائی کی بھی تنویر کو مدد ملی ہو تو جو سزا وہ ہمارے لئے تجویز کریں، ہم بخوشی منظور کریں گے۔

الحمد للہ اس وقت تک سوائے ملک کے گرامی قدر شعراء اور سحر طراز ادیبوں کے تنویر اور کسی کا کوئی بار احسان اپنے سر نہیں رکھتا۔

اہل قلم حضرات کی قلمی امداد، ہمدردی اور حمایت تنویر کو شروع سے ہی حاصل رہی ہے اور وہ اپنے معاصرین میں سر بلند ہے۔ ہندوستان کے Top writers نے اسے اپنایا۔ اور صرف ان کا احسان تنویر پر ہے۔

مالی امداد کی ذلت کو قبول کرنا تنویر جیسے غیور رسالے سے قطعی ناممکن ہے۔

پھر کس بناء پر اسے کانگریس (یعنی ہندو نواز) کا آرگن کہا جاتا ہے؟ ہم کانگریس کے حامی کیوں ہیں۔ اس کا جواب ذرا ان لوگوں کے لئے تلخ ہوگا جو اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہی کو وطنیت و قومیت کا معیار سمجھے بیٹھے ہیں۔ اگر سننا ہی چاہتے ہیں تو سنیں!

کانگریس کے سوائے دوسری کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جو کانگریس جیسی مضبوط و مستحکم اور ہندوستانی باشندوں کے لئے مشترکہ قومی انجمن کی حیثیت رکھتی ہو یا کم از کم رکھنے کا دعویٰ کرتی ہو۔

مسلم لیگ ہندو مہاسبھا وغیرہ کے نام ہی فساد کی جڑ اور متحدہ قومیت کے منافی ہیں مذہبی جماعتیں وغیرہ تو خارج از بحث ہیں چونکہ غلاموں کا کوئی مذہب نہیں ہو سکتا۔ اُن کا مذہب صرف غلامی کی حمایت کرنا ہی ہوتا ہے۔

غرضکہ کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جو دنیا کو ہندوستانی قوم کی زندگی غیرت اور آزادی کی آواز سنا سکے۔ جو ہماری قومی زندگی کا ابتدائی ثبوت دے سکے۔ اس لئے برتری ہے یا بھلی کانگریس ہی اس وقت ایک ایسی جماعت ہے۔ جو غیر ملک میں ہماری عزت و آبرو سنبھالے ہوئے ہے اور ہندوستانیوں کے ہاتھ میں یہ ایک ہی ہتھیار ہے جس سے وہ اپنی قومیت کی حفاظت کر سکتے ہیں مگر ہتھیار چھین جانے پر بھی زندہ رہنے والے مرد؟ ہنستے ہوکر بھی اہل مذہب ہونے کا دعویٰ کرنے والے غلام! اس آخری ہتھیار کو بھی پھینک دینا ہی مذہب کا حکم سمجھ رہے ہیں۔ اور چنانچہ غیروں سے زیادہ انھوں نے اس ہتھیار کو کُند و بیکار کرنے کی کوشش کی ہے مگر ہم اس آخری ہتھیار کو اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتے جب تک کے کوئی دوسرا ہتھیار اس سے بڑھ کر ہمیں نہ مل جائے۔

چونکہ ہم جسمانی طور پر غلام مزدور ہیں مگر ہماری رُوح اس غلامی سے بغاوت پر تُلی ہوئی ہے ہم اس ہتھیار سے خودکشی تو کر سکتے ہیں مگر غیر ملکی حکومت کا غلام بن کر بھیک میں ملی ہوئی غلام زندگی ہمیں ناپسند ہے۔

کانگریس اور مزدور

پچھلے دنوں بمبئی اسمبلی میں مزدوروں اور سرمایہ داروں کی چپقلش کو دور کرنے کیلئے ایک بل پیش کیا گیا تھا۔ مزدور خلاف تھے۔ اور حکومت اسکی حامی تھی۔ یہ کشاکش اس درجہ بڑھی کہ مزدوروں نے ہڑتال کی۔ ہڑتال کامیاب رہی۔

شروع میں پولیس حسب ہدایت وزیر قانون آنریبل مسٹر منشی اچھی طرح انتظام کرتی رہی اور حوصلے اور ہمت سے تمام بدعنوانیاں بھی برداشت کرتی رہی اور اُسے ایسا کرنا ہی چاہئے تھا۔ چونکہ بالآخر برائے نام سہی حکومت اپنی تھی لیکن بعد میں افسوسناک خبر ملی کہ کچھ مزدور ناسمجھی سے تشدد پر آمادہ ہوگئے اور پولیس کو گولی چلانا پڑی۔

ہمارے خیال میں کانگریسی حکومت اور مزدوروں دونوں کی برابر برابر خطا ہے۔ کانگریس کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اُسے جو آج یہ پوزیشن حاصل ہے۔ وہ انہیں مزدوروں کی امداد و حمایت کی بدولت حاصل ہوئی اور مزدوروں کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ کانگریس ہی ہندوستان کی لاج کو بچائے ہوئے ہے۔ اور تمہیں جو بھی حقوق ملے ہیں! جو بھی بیداری اور دلیری تم میں پیدا ہوئی ہے اُس کا سہرا کانگریس کے ہی سر ہے۔

ہر وہ قوم جو مدتوں بعد برسر حکومت آئے شروع شروع میں بے عیب حکومت نہیں کر سکتی۔ غلطیاں لازمی ہیں۔ تم اُن کی اصلاح کرو نہ کہ اعتراض و مخالفت۔ ورنہ تم ہی حکومت کے ناقابل قرار دیئے جاؤ گے اور دنیا میں جگ ہنسائی ہوگی۔

ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کانگریس کے عقیدے میں تو عدم تشدد داخل ہے۔ پھر کانگریسی حکومت نے مزدوروں کے تشدد کے سامنے عدم تشدد کے ہتھیار کو کیوں نہیں استعمال کیا؟ اور گولی کیوں چلائی؟ کیا اس کا جواب مہاتما گاندھی اور ولبھ بھائی پٹیل دیں گے؟؟

کمال اتاترک



جدید ٹرکی کا بانی — یورپ کے "مرد بیمار" کو "مرد میدان" بنانے والا مسیحا! شمعِ آزادی کے پروانوں کے لئے ایک زبردست مثال — وطن پرستوں کا دیوتا — دنیا بھر کے مسلمانوں کی عزت کا علمبردار — دلیری اور شجاعت کا ایک نادر نمونہ، غازی مصطفیٰ کمال پاشا گو اس دنیا سے منہ موڑ گیا۔ مگر وہ پیدا ہوا تھا ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے وہ زندہ ہے اور اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک ٹرکی زندہ اور آزاد ہے۔ اُس کی زندگی کے کارنامے ہمیں بتاتے ہیں کہ اُس نے جس بات کو قوم کے لئے مفید سمجھا اُسے اختیار کر لیا۔ اور جس چیز کو قوم کے لئے نقصان اور مُضر سمجھا اُسے بغیر پس و پیش کے اُڑا دیا۔ اور کسی کی پروا نہیں کی۔ اُس نے اپنی زندگی میں سب سے بڑا کام یہ کیا کہ خلافت کے بُت کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔ ہر چند ہندوستانی مسلمانوں نے اُس پر کفر کے فتوے لگائے مگر وہ کب سنتا تھا اُس کے نزدیک غلاموں کی باتیں، اور فتوے کیا حقیقت رکھتے تھے۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ عیش پرست، بے روح، و بزدل اور نا اہل و نکمّے خلیفہ کس طرح مذہب کے نام پر اسلام اور مسلمانوں کو پستی میں ڈھکیلتے چلے جا رہے ہیں۔ اور بجائے فائدے کے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ رسمی خلافت کو اُڑا کر بھی سب کو اُس نے بتا دیا کہ عملاً ہر مسلمان کو سچے معنوں میں نائبِ خدا اور خلیفۃ الرسول کس طرح بننا چاہئے — اور اسی عملی و عقلی زندگی کی بدولت آج ٹرکی اقوامِ عالم میں سر بلند نظر آتا ہے۔

آج ہر ہندوستانی نوجوان مرد اور عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ زندہ جاوید کمال اتاترک کی زندگی اور کارناموں کو اپنے سامنے رکھ کر اُس پر عمل پیرا ہو۔

یہی ایک "نذرِ عقیدت" اور "خراجِ تحسین" ہے محمد غازی عالم

کی مقدس روح کی خدمت میں ہم پیش کر سکتے ہیں اور جو قبول کی جائے گی۔

ورنہ وہ نہ ہم جیسے غلاموں اور مُردوں کی دعائے مغفرت کا محتاج ہے۔ نہ اظہار ماتم کا۔

نوجوانو! اگر تمہیں بطل حریت غازی کمال اتاترک سے سچی محبت ہے تو تمام ایسی چیزوں کے پیچھے اڑا دو جو تمہاری ترقی، آزادی، قومی بالیدگی اور زندگی میں حائل ہو رہی ہیں اور جنہوں نے اپنے گھناؤنے جسموں کو مقدس لباسوں میں چھپا رکھا ہے اور مقدس ناموں کی ڈھالیں استعمال کر کر کے تمہیں دھوکا دے رہی ہیں۔ تم دھوکے میں نہ آؤ۔ اٹھو اور غلام ہندوستان کو آزاد ٹرکی بنا دو۔

بھی اس موقع پر موجود تھے آپ نے اس جوڑے کی خوش بختی کے لئے دعا کی سنا جاتا ہے کہ مسلم لیگی حضرات پر اس شادی نے ناگوار اثر ڈالا اور لوگوں نے مسٹر جناح پر مداخلت کے لئے بہت زور ڈالا مگر مسٹر جناح نے مداخلت کرنا پسند نہیں کیا۔

معاصر حقیقت لکھنؤ رقمطراز ہے کہ :-

"مس جناح کی شادی کے بعد مسلمانوں کو مسٹر جناح سے یہ مطالبہ البتہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنی جائداد قوم کے نام وقف کر دیں کیونکہ مسٹر جناح کے اور کوئی اولاد نہیں ہے اور ان کے بعد ان کی کل جائداد ان کی صاحبزادی ہی کو ملے گی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مسلمان کی جائداد عیسائی کے پاس چلی جائیگی۔ ہماری رائے میں اس موقع پر مسٹر جناح کے لئے یہی مناسب ہوگا کہ وہ اس شادی کے سلسلہ میں اپنا ایک بیان شائع کر کے اس امر کا اعلان کر دیں کہ وہ اپنے بعد اپنی کل جائداد کو قوم کے حوالے کرتے ہیں اور اس کے لئے ایک ٹرسٹ بھی قائم کر دیں اس طرح مس جناح کی شادی سے مسلمانوں کو جو کچھ بھی ملال اور شکایت مسٹر جناح سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اسکی تلافی ہو جائے گی اور کم از کم یہ خطرہ نہیں رہیگا کہ مسٹر جناح کی لاکھوں روپیہ کی جائداد ایک عیسائی خاندان کے قبضہ میں چلی جائے گی۔"

مسٹر واڈیا و مس جناح

مسٹر جناح کی لڑکی

نے ایک پارسی نوجوان نیولی ینس واڈیا سے شادی کر لی۔ مسٹر جناح کے یہ پارسی داماد بمبئی کے مشہور مل کے مالک ہیں۔ شادی کی رسم آل سینٹس چرچ اگریبا: مالابار ہل میں عیسائی مذہب کے مطابق پادری خادر سائرل پیدو ررتھ نے ادا کی۔

شادی کی رسوم کی ادائیگی کے دوران میں مس جناح کی رشتہ دار عورتیں پارسی، اور یورپین لیڈیوں کے ہمراہ گرجا میں موجود تھیں سب کے چہرے خوشی و مسرت سے دمک رہے تھے بمبئی کے لارڈ بشپ

ہندو مسلم کشمکش پر ایک نظر

از قلم محترمہ فاطمہ ہاشم اسمٰعیل صاحبہ (افریقہ)

کچھ وہ کھچے کھچے رہے کچھ ہم تنے تنے
اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا!

دنیا بھی ایک عجیب فساد کا گھر ہے۔ کہیں ملک کا جھگڑا کہیں پلک پر لڑائی۔ ان دنوں مسئلہ تعصب نے ہندوستانی دنیا میں ایک نہایت ہی پیچیدہ فضا پیدا کر دی ہے اور اس کا نتیجہ ایک ناموزوں اور ناقابل برداشت کشمکش کی شکل میں نمایاں ہے۔ یوں تو اس فساد کے مختلف وجوہات بیان کئے جاتے ہیں مگر غور سے دیکھا جائے تو اس کی اصلی بنا کونسلوں کے انتخابات، میونسپلٹی کی ممبری اور سرکاری ملازمت ہے۔ کوئی یہ پوچھے کہ بھلا کونسلوں کے داخلے اور میونسپلٹی کی ممبری سے ساری قوم کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ مان لیا جائے کہ کچھ لوگوں کو سرکاری نوکریاں مل جائیں گی۔ مگر اس سے ساری قوم یعنی آٹھ کروڑ مسلمانوں کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی بھرتی گورنمنٹ اور میونسپلٹی کے دفتروں میں تو ہو نہیں سکتی۔ آخر وہ کسان۔ مزدور۔ کاریگر و تجارت پیشہ لوگ جنکی تعداد کم از کم چھ کروڑ ہوگی اور جن کی روزی ہندو سرمایہ داروں سے وابستہ ہے۔ ان کا اس کشمکش میں کیا حشر ہوگا؟ اس کا لازمی نتیجہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ وہ بیچارے وہاں سے نکالے جائیں گے اور بھیانک کس مپرسی کا منظر پیدا ہوگا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر تری محفل سے ہم نکلے۔

کیا میرے مسلمان بھائی اس خطرہ کو نظر انداز کر سکتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی تجارت و زمینداری اس قدر وسیع ہے کہ اس بیکار شدہ جم غفیر کو ملازمت و مزدوری کا وسیلہ بہم پہنچا کر انکی پرورش کر سکے؟ اجتماعی حیثیت سے اس مسئلہ کا حل کرنا ناممکن ہے لہذا اس گناہ عظیم کا مرتکب کون ہوگا اور یہ سیلاب فنا کس کے گھر جائے گا؟ کیا مسلمان لیڈر ز اور قوم کے نمایندے اس کے ذمہ وار نہیں ہیں؟ بھائیو برائے خدا ذرا دور اندیشی سے کام لو۔ اور اپنی خود غرضی اور لیڈری کے لئے قوم کی تباہی نہ کرو اپنے غریب بھائیوں اور بہنوں کو جو اس وقت بھی افلاس و مصائب کے شکار ہیں۔ روٹیوں کے محتاج نہ کرو۔ در بدر نہ پھراؤ۔

لطف تو یہ ہے کہ یہ تمام فساد مذہب کے نام سے کیا جاتا ہے۔ موقع بے موقع لیڈر شور مچاتے ہیں۔ کہ اسلام خطرے میں ہے اور انہیں خیال بھی نہیں ہوتا کہ ان کی اپنی کارروائیوں سے ہی اسلام کو خطرہ ہے۔ ان کے اپنے کارناموں سے عوام میں یہ غلط فہمی پھیل رہی ہے کہ اسلام بغض و کینہ، فساد و عداوت کا مذہب ہے کیا یہی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ہے؟

کاش کہ مسلمان لیڈر ذرا دور اندیشی سے کام لیتے۔ کسی قسم کا جھگڑا شروع کرنے کے پیشتر یہ بھی دیکھ لیتے کہ انجام کیا ہوگا۔ فساد کرنا آسان ہے۔ بجھانا دشوار اور اس کے اثر کو مٹانا ناممکن ہے۔ جو کانٹے آج بوئے جائیں گے وہ ہماری آئندہ نسلیں چنیں گی یہ ممکن نہیں کہ آٹھ کروڑ مسلمان ہندوستان کو چھوڑ کر اور کوئی ملک جا بسائیں۔ ہندوستان ہمیشہ سے ہمارا ملک ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہم کو یہیں رہنا سہنا ہے اور ہندو بھائیوں سے نبھانا ہے ملک کی آزادی کے لئے جو کوششیں کانگریس کر رہی ہے وہ اگر آج نہیں تو سو سال بعد تو ضرور کامیاب ہونگی اگر ہم نے ان کا ساتھ نہ دیا اور ہمیشہ سدِ راہ بنے رہے تو اس وقت ہمارا کیا حشر ہوگا؟ کڑوے بیج کا پھل بھی کڑوا ہوتا ہے اس وقت بے وقت اور ہر بہانے کی لڑائی سے محبت کے رشتے ٹوٹ جائیں گے۔ اور دلوں میں برائی آجائیگی جب تک دوستانہ تعلقات قائم رہتے ہیں ایک دوسرے کی سہہ لیتا ہے مگر جب وہی نہ ہو تو پھر بھلا کوئی کیوں کسی کی عزت رکھے؟

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

بقیہ لمعات

ہٹلر اور یہودی قوم: جرمن میں یہودیوں پر جو بے پناہ مظالم توڑے جا رہے ہیں وہ امن انسانیت پر کلنک ہیں۔ دنیا بھر کے وہ لوگ جن کے دل میں انسانوں کے لئے ہمدردی ہے۔ جرمنوں کی اس بہیمیت و بربریت کی وجہ سے انسان نہیں بلکہ حیوانوں سے بدتر سمجھتے ہیں کہ محض نسلی تعصب کی بناء پر بے گناہ یہودیوں پر بھی عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے زمانے کے الٹ پھیر سے ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ ایک ایک جرمن کا یہی حشر ہو۔

جو انسان انسانیت کا احترام نہیں کرتے۔ اور طاقت کا صحیح استعمال نہ جان کر غلط استعمال کرنے میں ضرورت ہے کہ طاقت ان کے ہاتھوں سے چھین لی جائے۔ یہودی قوم کا بھی ایک بہت بڑا قصور رہا ہے کہ انہوں نے اب تک وطن پرستی نہیں سیکھی۔ اور یہی سبب ہے کہ آج دنیا کے کسی حصے میں نہ تو ان کی حکومت ہے نہ کسی سیاسی پوزیشن کے مالک ہیں۔ وہ جہاں بھی رہے محکوم کی حیثیت سے اور اپنی خود غرضیوں کی بنا پر غدار کہلائے جاتے رہے۔

یہودیوں کے خلاف جو الزام ہے وہ بھی کچھ کم سنگین نہیں۔ ہٹلر اپنی صفائی میں کہتا ہے کہ میں جرمنی میں ان لوگوں کو پھلنے پھولنے نہیں دوں گا۔ جو جرمنی کو مادر وطن تسلیم نہ کرتے ہوں۔ جن میں جذبہ حب الوطنی نام کو بھی نہ پایا جائے۔ اور جو وطن کے خیر خواہ نہ ہوں۔

جن انسانوں کی نظر میں "وطن" اور وطن پرستی مہمل چیز ہوتی ہے۔ وہ حاکم ہونے کی حیثیت میں ڈکٹیٹر اور غاصب کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ اور محکوم ہونے کی حالت میں غلام اور غدار اور یہ دونوں حالتیں کسی غیور قوم کے لئے قطعاً ناقابل قبول ہیں۔ اور اس کی صریحاً توہین و تذلیل ہے۔

کیا جذبۂ حب الوطنی سے دور اور وطن پرستی کو بت پرستی کہنے والے حضرات یہودیوں کی اس عبرتناک حالت سے سبق حاصل کریں گے؟

شمعِ بیداری

از:- جناب رضی احمد صاحب مجوّد غازی پوری
تلمیذ
حضرتِ فراق گورکھپوری

ڈوبتی ناؤ تباھی سے بچاؤ یارو!

رُوحِ خوابیدہ کو ہم اپنی جگانے اُٹھے
بختِ ناراض کو پھر اپنے منانے اُٹھے
ظلمتِ قلب کو نغموں سے مٹانے اُٹھے
گوشِ شنوا کو یہ آواز سنانے اُٹھے

ڈوبتی ناؤ تباھی سے بچاؤ یارو!

دُور ہیں دُور بہت عرصۂ جودت سے ہم
دور ہیں دور بہت مقصدِ ملّت سے ہم
دور ہیں دور بہت شانِ اخوت سے ہم
دور ہیں دور بہت رمزِ حقیقت سے ہم

اب تو للّٰہ ذرا ہوش میں آؤ یارو!

تفرقہ حد سے سوا ہم میں بڑھا جاتا ہے
مقصدِ غیر مکمل سا ہوا جاتا ہے
فرضِ انساں سے ہمیں دور کیا جاتا ہے
آسماں زیرِ زمیں اب تو گڑا جاتا ہے

جہل و نخوت کا یہ پردا ہی اٹھاؤ یارو!

فتنے جاگ اُٹھے ہیں یہ خواب پرستی کیسی
جس کو احساسِ خودی کچھ نہ ہو ہستی کیسی
تشنہ کاموں کے لئے بادہ پرستی کیسی
سورماؤں کی طبیعت میں یہ پستی کیسی

ھند کی شانِ قدیمی نہ مٹاؤ یارو!

بادۂ ذوقِ غلامی کے پرستاروں کو
مذہبی بغض و عداوت کے سزاواروں کو
پردۂ زہد میں ایماں کے خریداروں کو
شعبدہ بازِ سراسر یہ گنہگاروں کو
قابلِ ترک ہیں محفل سے اٹھاؤ یارو!

مادرِ ہند کی آنکھوں کے ستارو! اٹھو...
اُٹھو مجبور غریبوں کے دلارو! اُٹھو
اُٹھو معصوم یتیموں کے سہارو! اُٹھو
اُٹھو ناداریٔ و افلاس کے مارو! اُٹھو
اٹھو ظلماتِ غلامی کو مٹاؤ یارو!

برق کاشانوں پہ ہو سایہ فگن کیا معنی؟
دیکھتے دیکھتے لٹ جائے چمن کیا معنی؟
ہم پہ بھاری ہو زمانے کا چلن کیا معنی؟
ہند کہلائے غریبوں کا وطن کیا معنی؟
عہدِ زرّین سلف ذہن میں لاؤ یارو!

بلبلہ اُٹھ کے ہمیں آنکھ دکھائے افسوس
موجِ دریائے خیالی بھی ڈرائے افسوس
شعلۂ غیظ کو پانی بھی بجھائے افسوس
بزدلی نام شجاعت کا مٹائے افسوس
جذبۂ بھیشم و ارجن کو جگاؤ یارو!

(مسلسل)　　　　(خاص تنویر کیلئے)

یادِ ایام

افسانہ

{از:- پروفیسر مجنوں ایم۔ اے گورکھپوری}

۱ر جنوری ۱۹۱۷ء

"سالِ نو مبارک!" — یہ تھی وہ پیاری اور خوش آئند آواز جو آج صبح ۶ بجے میرے کانوں میں پڑی۔ میں بھی اچھی طرح جگا بھی نہیں تھا اور خواب کی کیفیت باقی تھی۔ چارپائی پر پڑے پڑے رات بڑی دیر تک۔ شاید ۳ بجے تک میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ کل نیا سال ہے۔ اور قاعدہ کی رو سے دُنیا کو ایک نئی کروٹ لینا چاہئے۔ کاش پُرانا سال واقعی چلا جاتا اور اپنے ساتھ اپنے پُرانے نظام کو سمیٹ لے جاتا۔ کاش نیا سال ایک نئی تہذیب کی بشارت لے کر آتا جس کی بُنیاد حق، خلوص، شرافت، مساوات اور حریت پر ہوتی اور جو کذب و افترا، مکر و احتیال، جبر و استبداد، غلامی اور محتاجی کو جڑ سے مٹا ڈالتی۔ کاش یہ نیا سال اعلیٰ و ادنیٰ، آقا اور مزدور، امیر اور غریب کے اختلافات مراتب کے لئے موت کا پروانہ لے کر آئے۔ اور سب کے لئے یکساں خیر و برکت، فرصت اور فراغت، آزادی اور اطمینان کا پیغام لائے میرا خیال رہ رہ کر موجودہ جنگ کی طرف جا رہا تھا۔ ممکن ہے یہ جنگ واقعی حق اور ناحق کی جنگ ثابت ہو۔ پھر دل کہتا تھا کہ ایسے نہ جانے کتنے نئے سال اسی انسانی دنیا میں آ چکے ہیں اور حق کے نام پر نہ جانے کتنی بار ایسی ہی لڑائیاں لڑی جا چکی ہیں یہ جنگ بھی لیٹروں کی جنگ ہے اور طاقت و جبروت میں مسابقت کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ اور ہر جنگ سے زیادہ تباہ کن اور انسانیت کا خمیر بگاڑنے والی معلوم ہوتی ہے۔ ...

اب ایک عرصہ سے میرے دن رات ایسے ہی تردّدات میں گزر رہے ہیں جن کو خاص اپنی ذات سے کوئی دور کا بھی تعلق نظر نہیں آتا۔ آج بھی میں اسی سارے جہان کے غم میں پچھلے پہر تک آنکھیں بند کئے ہوئے جاگتا رہا۔ اور جب دماغ تھک کر بالکل مجبور ہو گیا۔ اور نیند آئی تو طرح طرح کے خواب دیکھتا رہا جنہیں سے ایک کو بھی اپنی نجی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ سب کے سب خدا کی خدائی سے متعلق تھے اور مایوس کن تھے۔ یکایک کانوں میں یہ مبارک باد پہنچی تو چونک کر آنکھیں کھول دیں اور لحاف پھینک کر اُٹھ بیٹھا۔ میں اس انقلاب کا استقبال کرنے والا تھا جس کا نام میری تخیل میں "سالِ نو" تھا۔ لیکن یہاں تو وہی ایام تھے اور وہی ان کا نظام! وہی مروارید پلنگ کے قریب کھڑی تھی اور کہہ رہی تھی "لحاف اوڑھ لیجئے ورنہ سردی لگ جائے گی اور پھر بخار آ جائے گا!"

میں نے کہا "سالِ نو کی مبارک باد اور بیماری کا پیغام ایک ہی سانس میں خوب دیا!"

مروارید کچھ شرمندہ ہو گئی۔ مجھے اس کا احساس ہوا تو میں نے اُس کا دھیان بٹنے کے لئے کہا۔

"دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض!
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے"

مروارید! سال نو کا ثبوت؟"

مروارید مجھ سے لپٹ گئی اور میں نے اس کو بوسوں سے ڈھک دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے مروارید ہی نئی زندگی کی بشارت معلوم ہونے لگی۔ میں نے کہا "مروارید! اس وقت جی چاہتا ہے کچھ دیر کے لئے تم اسی طرح میرے پاس رہو اور کوئی آکر خلل انداز نہ ہو۔ تمھاری ماں تو ابھی گھنٹوں مصروف رہیں گی۔ لیکن اگر چودھری صاحب یا سبحان آ گئے؟۔۔۔"

"آبا جان ابھی تلاوت کر رہے ہیں" مروارید نے جواب دیا "اور آج انھوں نے اپنی چائے بھی اپنے ہی کمرہ میں منگائی ہے دیر تک وظیفہ میں مشغول رہیں گے اور سبحان ابھی سو رہے ہیں۔ میں آپ کی چائے یہیں منگائے لیتی ہوں۔ یوں بھی اس کا اندیشہ کم تھا کہ کوئی اتنا سویرے آ کے محض مزاج پرسی کے لئے آپ کے آرام میں خلل ڈالنا پسند کرے۔ یہ تو کچھ مجھی کو لت ہے کہ وقت بے وقت آپ کو ستاتی رہتی ہوں۔۔۔۔"

میں نے اس کا سر اپنے سینہ سے لگا کر کہا "مروارید تم کو خوب معلوم ہے کہ میں تم کو اپنے لئے کیا سمجھتا ہوں! تم میری زندگی کی تاریک فضا میں ایک روشن ستارہ ہو جو اکیلا چمک رہا ہو۔ تم کو پا کر میری عمر بھر کی محرومیوں کا احساس بہت کم ہو گیا ہے اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ میں اب پھر کچھ کرنے کے لائق ہو رہا ہوں۔ لیکن تمھیں مجھ سے کیا ملا؟۔۔۔ ایک محروم سے کسی کو مل ہی کیا سکتا ہے سوا محرومی کے؟۔۔۔۔"

مروارید نے اپنے ہاتھ میرے گلے میں حمائل کر دیئے اور کہنے لگی "شہاب صاحب برس برس کے دن ایسی باتیں نہ کیجئے آپ نے مجھے بہت کچھ دیا۔ دنیا کی سب سے بڑی دولت یعنی محبت!"

"محبت! ہاں محبت!" میں نے کہا "اسی کا تو دوسرا نام محرومی ہے؟ مروارید۔ کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ محبت کے بعد کیا ہوتا ہے؟"

"کیا ہوتا ہے؟ بتایئے" مروارید نے پوچھا۔

"محبت کے بعد محرومی کی منزل ہے جو بہر حال آتی ہے۔ محبت کے بعد وہ منظر آتا ہے جو ساری فضا کو دھندلی اور مکدر کر دیتا ہے محبت کے بعد ہی چند خالی اور غمناک گھڑیاں آتی ہیں اور اس کے بعد پردہ گر جاتا ہے اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔۔"

مروارید افسردہ ہو کر بولی "شہاب صاحب۔ آپ دل کی تاب چھین لیتے ہیں۔ خدا کے لئے دوسروں کو مسرتوں سے محروم نہ کیجئے چاہے یہ مسرتیں التباس ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔۔۔"

میں نے کہا "مروارید یہ اور بات ہے۔ لیکن ذرا سوچو۔ عذرا کے ساتھ میری محبت کا انجام کیا رہا اور اب جو تم سے وابستگی پیدا ہوئی اس کا حشر کیا ہوگا۔ سوا محرومی کے کوئی اور بات سمجھ میں آتی ہے؟"

مروارید کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرا دل عرصہ سے بھرا ہوا تھا۔ میں بھی آج خوب جی کھول کر رو دیا۔ بڑی دیر تک ہم دونوں آنسو بہاتے رہے۔ اتنے میں ملازم چائے لایا۔ اور ہم نے جلدی سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ مروارید نے میرے اور اپنے لئے چائے بنائی۔ میں نے کہا "ہاں مروارید سال نو مبارک! جس سال کی ابتدا آنسوؤں سے ہوئی ہو وہ ضرور مبارک ہوگا" مروارید نے کہا۔ "للہ شہاب صاحب۔ اب بس کیجئے۔۔۔"

میں نے کہا "اچھا مروارید۔ یہ تو خواہ مخواہ کی بات نکل آئی یوں تو محض اپنے لئے کسی چیز کو مبارک یا نامبارک سمجھ ہی نہیں سکتا میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ سال دنیائے انسانیت کے لئے کیا ہوگا۔ میں نے تم سے رات کا ایک خواب نہیں بیان کیا۔ میں نے

خواب دیکھا ہے کہ دنیا میں بہار اب کبھی نہیں آئے گی ۔ ۔"

"یہ سب آپ کا وہم یا بیمار اعصاب کی تکان ہے" مرد آرید نے میرے لئے ٹوسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے کہا" میرا ایمان یہ ہے کہ دنیا کی رفتار ہمیشہ ترقی کی طرف رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی اور حالات بہتر سے بہتر ہوتے جائیں گے ۔ ٹینی سن نے " لاکسلے ہال " میں کیا بتایا ہے ۔ یہ سچ ہے کہ اس کے بعد اس کو مایوسیاں ہونے لگیں اور اسکو" لاکسلے ہال " سالہا برس بعد بھی لکھنا پڑی ۔ مگر میں لامحدود ترقی کی قائل ہوں ۔ براؤننگ نے " ربی آبن عذرا " میں کیا پیغام دیا ہے :۔

" میرے ساتھ بڑھتے ہوئے چلو "

" بہتر سے بہتر تو ابھی ہونا ہے "

میرا ایمان یہ ہے کہ انسان ترقی کی منزلیں برابر طے کرتا چلا جائے گا ۔ یہاں تک کہ "فوق الانسان" (Supermans) پیدا ہونے لگیں گے ۔ اور پھر اس کے آگے ہماری منزل" منزل کبریا" ہی ہوگی ۔ ۔ ـــــ"

آج مرد آرید بڑے جوش کے ساتھ باتیں کر رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس چیز کا وہ سہارا لئے ہوئے ہے اس کو کس کے پکڑے رہنا چاہتی ہے اور سارا زور اسی میں لگائے دے رہی ہے ۔

مجھے عبرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آنے لگا ۔ میں نے کہا "مرد آرید میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا کب تک اس قسم کے مکر و فریب کا شکار رہے گی ۔ جب دنیا زیادہ معصوم تھی تو جس چیز کو اب فوق الانسان کہا جاتا ہے اس کو سیدھے سیدھے لٹیرا یا قزاق کہتے تھے ـــــ فوق الانسان سے دنیا کبھی خالی نہیں رہی ہے ۔ فوق الانسان وہ ہے جو دوسرے انسانوں کو تحت الانسان تصور کرے اور ان پر جبر و تشدد کرنا اپنا قدرتی حق سمجھے ۔ سو ایسوں کی کمی کبھی نہیں رہی ۔ رابن ہڈ (Robin Hood) بھی فوق الانسان ہی تھا ۔ ہلاکو اور چنگیز بھی فوق الانسان تھے ۔ نیرو ۔ فریڈرک اعظم ۔ غزنوی اور غوری یہ سب فوق الانسان ہی تھے ۔ اس لئے کہ وہ دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں کو تاخت و تاراج کرنا کار ثواب سمجھتے تھے ۔ اس وقت جو جنگ چھڑی ہوئی ہے اس کی بنیاد بھی اسی فوق الانسان کے تصور پر ہے انگریز دنیا پر اس لئے حکمرانی کر رہے ہیں کہ وہ فوق الانسان ہیں ۔ جرمنی کو اپنی فوقیت کا احساس ہوا تو اس نے دنیا کو جنگ کی دعوت دیدی ۔ جرمن قوم اپنے کو تمدن و اخلاق کا اجارہ دار سمجھ رہی ہے اس لئے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ جس" فوق الانسان" کی "نطشے" نے بشارت دی تھی وہ جرمنی میں پیدا ہونے لگا ہے اس خدا کی نئی مخلوق کا کیا حشر ہونے والا ہے ؟ یہ آنے والا وقت فیصلہ کرے گا ۔ لیکن مرد آرید پردہ ہٹ رہا ہے اور اس بت کا راز فاش ہونے والا ہے وہ دن دور نہیں کہ یہ بت بھی منہ کے بل آ رہے ۔ اب یہ حقیقت ظاہر ہو رہی ہے کہ فوق الانسان طبقہ اعلیٰ کا صرف دوسرا نام ہے جو جمہور پر حکومت کرنے کیلئے طرح طرح کے بہانے گڑھ رہا ہے انسان کے اندر بھیڑیا بھی موجود ہے اور اسی بھیڑئیے کا نام اب فوق الانسان ہے جو انسان کا اسی طرح دشمن ہے جس طرح بھیڑیا میمنہ کا دشمن ہے ۔ ۔ ۔ ـــــ"

چائے ختم ہو چکی تھی اور میں تھک گیا تھا اس لئے میں پھر لیٹ گیا ۔ مرد آرید مجھے تھوڑی دیر تک ایک عجیب نگاہ سے دیکھتی رہی ۔ جس میں حیرت ، تاسف ، شک ، تحسین و تعظیم سبھی عناصر شامل تھے ۔ وقت کافی گزر چکا تھا اور اب لوگوں کی آمد و رفت شروع ہونے والی تھی ۔ مرد آرید نے کہا" اچھا اب میں جاتی ہوں لیکن شہاب صاحب آپ بڑے ظالم ہیں ۔ کسی کا کوئی بت قائم نہیں رہنے دیتے ـــــ"

میں نے کہا "مروارید بیبی اب جاؤ لیکن سال نو کی خوشی
میں یہ اجازت تو دے ہی جاؤ کہ اب میں جب جی چاہے اپنا روزنامچہ
لے کر بیٹھ جایا کروں" مروارید مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

آج سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر جو بات ہوئی وہ یہ تھی
کہ مجھے یہاں کی ایک نئے صاحب سے ملاقات ہوئی — جو چودھری نبی احمد
کے دور کے رشتہ داروں میں سے ہیں اور جن کا ذکر دو ایک مرتبہ
اس سے پہلے میں سن چکا تھا۔ ان کا نام چودھری نظام الدین ہے
اس وقت یہ سپرنٹنڈنٹ پولیس ہیں پہلے خفیہ پولیس میں تھے جس سے
اب بھی تعلق باقی ہے۔ چودھری نبی احمد اور ان کے خاندان سے درپردہ
جلتے ہیں۔ لیکن ظاہر میں وہ خلوص اور محبت برتنے میں کمی نہیں کرتے
جس کی ایک رشتہ دار سے توقع ہونا چاہیئے۔ آج نئے سال کی مبارکباد
دینے آئے تھے۔

سہ پہر میں اچھا خاصہ مجمع ہو گیا تھا۔ ہم سب لوگ میدان میں
بیٹھے ہوئے تھے۔ عزیز اور بیگم عزیز مع اپنے بچوں کے موجود تھے
ان کے علاوہ شہر کے اور بہت سے سربرآوردہ لوگ آئے ہوئے
تھے اتنے میں چودھری نظام الدین بھی وارد ہوئے اور میں نے محسوس
کیا کہ چودھری نبی احمد۔ مروارید اور بیگم عزیز کے چہرے کچھ دھندلے پڑ گئے
نظام الدین سے میرا تعارف کرایا گیا تو انہوں نے کہا "میں آپ کو
اچھی طرح جانتا ہوں۔ البتہ ملاقات کا شرف حاصل نہیں تھا"
اس پر نہ جانے میرے منہ سے کیوں نکل گیا "آپ کا منصب
ہی یہ ہے کہ آپ بہتیرے ایسے لوگوں کو جانیں جو آپ کو نہ جانتے ہوں"
میں نے دیکھا کہ نظام الدین کے چہرہ کا رنگ کچھ بدل گیا یہ بات ان کو
بری لگی اگرچہ انہوں نے اس کے جواب میں کچھ کہا نہیں۔
فضا میں ایک قسم کا تناؤ پیدا ہو گیا تھا جس کو مروارید نے دور کیا
اس نے کہا "شہاب صاحب۔ ابھی آپ بڑے مزے مزے کے اشعار
سنا رہے تھے یہ سلسلہ خواہ مخواہ ٹوٹ گیا۔ مومن کے کچھ شعر اور سنائیے۔"
میں نے بھی اسی جگہ بنا لے لینا مناسب سمجھا۔ میں نے کہا "سنو۔
بڑا اچھا شعر ہے۔

"پہنچے وہ لوگ رتبہ کو کہ مجھے
شکوۂ بخت نارسا نہ رہا"

عزیز اور بیگم عزیز دونوں ایک آواز ہو کر "واہ! واہ!"
کرنے لگے۔ لیکن مروارید اور چودھری نبی احمد کچھ سکتے میں آ گئے۔
نظام الدین کرسی پر کروٹیں بدل رہے تھے اور اپنے حرکات
و سکنات سے ظاہر کئے دے رہے تھے کہ ان کے لئے یہ بیگانوں
کی محفل ہے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں —
اشعار سن سن کر ان کے چہرہ پر جو شکنیں نمودار ہو رہی تھی وہ
ایک اندرونی کرب کا پتہ دے رہی تھی آخرکار ان کا دم اس
قدر گھٹا کہ ان سے نہ رہا گیا اور انہوں نے ایسے تذکرے چھیڑ دیئے
جو ان کے محکمے اور ان کے مذاق دونوں سے یگانگت رکھتے تھے
اور بہت جلد وہ اپنے کارنامے گنا رہے تھے میری طبیعت کچھ تو
یوں بھی ایسے مباحث سے بدمزہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے نہ جانے
کیوں پہلے ہی نظر میں مجھے اس شخص سے نفرت ہو گئی تھی اور جب میں نے
دیکھا کہ یہ بدنصیب اس قدر بدذوق واقع ہوا ہے کہ اپنی بدذوقی کو سب
پر بالا ہی رکھنا چاہتا ہے تو جس نفرت کی ابتدا قیافہ سے ہوئی تھی
وہ یکایک شدید ہو کر عداوت میں تبدیل ہو گئی۔ میں کوئی بہانہ ڈھونڈ
رہا تھا کہ اس شخص کو ذلیل کروں۔ نظام الدین کا وجود نہ جانے کیوں مجھے
روئے زمین پر ایک لعنت معلوم ہو رہا تھا۔ حسن اتفاق سے انہوں نے
ایک ایسا ذکر چھیڑ دیا کہ میری مراد پوری ہو گئی۔ جب اچھی طرح اپنے
تمام گن اور سارے کارنامے گنا چکے تو چودھری نبی احمد سے مخاطب ہو کر

کہنے لگے۔ ہاں بھائی صاحب ایک بات تو آپ سے کہنا بھول ہی گیا میں نے جب یہ خبر سنی تو مجھے ایک دھکا سا لگا۔ چودھری زین الدین صاحب کے صاحبزادے اس مس تترا کے پیچھے آخر عیسائی ہو ہی گئے۔ اور یورپ میں گرجا میں جاکر شادی کرلی۔ ولایت کی تعلیم اور بیرسٹری کے زعم نے معلوم ہوتا ہے ان کا دماغ خراب کردیا ہے، ماں باپ، گھر بار سب سے قطع تعلق کرلیا ہے سب کی عزت خاک میں ملادی۔ سارا خاندان رسوا ہو رہا ہے جب مجھ سے کوئی پوچھتا ہے تو مارے شرم کے کچھ کہتے نہیں بنتا۔ زین الدین بیچارے کا کیا حال ہوگا۔ میں کل مراد آباد جانیوالا ہوں ——"

اس خبر کا سب پر اثر ہوا چودھری نبی احمد بڑی دیر تک افسوس کرتے رہے۔ بیگم نبی احمد نے تو سر پیٹ لیا۔ بیگم عزیز بھی افسردہ ہوگئیں۔ مرد آرید بھی سوچ میں پڑ گئی۔ تھوڑی دیر تک میں بھی چپ رہا۔ لیکن پھر میں نے چودھری نبی احمد سے کہا "آپ لوگ ایک معمولی سی بات سے میرے خیال میں غیر معمولی اثر قبول کررہے ہیں۔ اور ایک ذرا سی بات پر ضرورت سے زیادہ لعن طعن کررہے ہیں۔ واقعہ قابل افسوس ضرور ہے۔ خاص کر متعلقین کے لئے لیکن انسان دل کی منطق سے بھی مجبور ہے جس کے آگے دماغ کی منطق کام نہیں دیتی۔ کیا کیجئے گا۔

آتش عشق آب کار او برد
زلف ترسا روزگار او ببرد

چودھری نبی احمد اس واقعہ سے بے انتہا متاثر تھے۔ اس لئے انھوں نے کچھ آزردہ ہوکر کہا "یار بعض وقت تمھاری آزادی خطرناک معلوم ہونے لگتی ہے نہ صرف تمھارے لئے بلکہ سماج کیلئے"۔ مرد آرید نے شاید فضا کا رنگ بدلنے کے لئے کہا۔ "شہاب صاحب یہ کس کا شعر ہے اور کس موقع سے متعلق ہے؟"

میں نے کہا "شیخ فریدالدین عطار نے منطق الطیر میں ایک قصہ بطور تمثیل کے لکھا ہے۔ اسی میں یہ شعر ہے۔ شیخ صنعان ایک بڑے پرہیزگار عبادت گزار بزرگ تھے ان کے علم و فضل اور روحانی اکتسابات کا ہر شخص معترف تھا۔ سیکڑوں مرید تھے جو ان کو پوجتے تھے اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ وہ ایک "دختر ترسا" کو دیکھ کر اس پر عاشق ہوگئے اور ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ سارا زہد و اتقا بھول گئے۔ کفر و اسلام میں کوئی تمیز باقی نہیں ہی پھر اس لڑکی کے پیچھے انھوں نے کیا کیا نہیں کیا۔ شراب پی۔ زنار باندھا۔ سال بھر اس کے سور چرائے۔ تب جاکر کہیں وہ لڑکی راضی ہوئی۔ اسی قصہ میں یہ مشہور شعر بھی ہے

عشق ازیں بسیار کرد است و کند
سبحہ را زنّار کرد است و کند

جب ایسے ایسے کاملوں سے ایسی لغزشیں ہوئی ہیں تو بیچارے زین الدین کے صاحبزادے کس شمار میں ہیں۔ اس قصہ سے عطار نے اپنی گوں کا ایک نتیجہ نکالا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر انسان کے نفس میں ایک سور موجود ہوتا ہے جس سے ہوشیار رہنا چاہئے۔ مجھے عطار اور انھیں جیسے صوفیوں سے صرف یہ اختلاف ہے کہ وہ اسکو سور کہتے ہیں اور میں اس کو عین الانسان سمجھتا ہوں۔ ہاں میں یہ مانتا ہوں کہ اس "اندرونی انسان" کے ہاتھوں انسان ہمیشہ نہیں تو اکثر بری طرح تباہ و برباد ہوتا ہے"

"اس پر نظام الدین نے ایک تلخ طنز کے ساتھ کہا "اسی قسم کے خیالات نے دنیا میں اتنی برائیاں پھیلا رکھی ہیں۔ مجھے ایسی باتوں سے سخت نفرت ہے"

میں نے سکر بھیجا کہ خیر موقع تو ملا۔ میں نے کہا "آپ کو نفرت ہونا بھی چاہئے۔ اس لئے کہ اگر آج آپ کو ایسی باتوں سے رغبت ہو تو آپکا مذاق اور رجحان بدل جائے اور آپ اپنے فرائض منصبی میں کامیاب نہ رہیں"

نظام الدین نے تیوری چڑھا کر پوچھا "آپ کا کیا مطلب ہے؟"
میں نے کہا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کو فطرتاً یا عادتاً برائیوں سے اُنس ہے۔ آپ کا کام جرائم کا پتہ لگانا ہے اور آپ کی نظر زندگی کے قبیح پہلوؤں پر رہا کرتی ہے۔ آپ کو کبھی حسین چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہئیے۔"

"تو گویا آپ میرے محکمہ پر یہ بوچھار کر رہے ہیں" نظام الدین نے کچھ خائف لہجہ میں کہا۔ میں نے جواب دیا "جی ہاں یوں ہی سمجھئے۔ پولیس اور خفیہ پولیس جیسے محکموں کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ جرائم ہوں۔ اس وقت ان کی جو بھی ضرورت ہو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سفل درجہ کی چیزیں ہیں اور دامن انسانیت پر لعنتی داغ ہیں۔ تمدن اور شرافت کا جو عام میلان ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آگے چل کر جب انسان زیادہ سنجیدہ اور سلیم الطبع ہو جائے گا۔ تو تہذیب کا ایک مقصد یہ بھی ہوگا کہ دنیائے انسانیت کو پولیس جیسے غیر انسانی اداروں کی خدمات سے بے نیاز کردے ..... "

"جی نہیں" نظام الدین نے دانت پیس کر کہا "پولیس اور خفیہ پولیس کا کام یہی ہے کہ وہ آپ جیسے خطرناک اور سرکش لوگوں کی سرکوبی کرے۔"

میں نے کہا "آپ کو تھوڑا سا مغالطہ ہے۔ آپ کے ذہن میں ہندوستان جیسا غلام ملک ہے۔ جہاں آزادی کو بھی جرائم میں شمار کیا جا رہا ہے۔ سو وہ دن دور نہیں جبکہ آپ لوگوں سے یہ کام لے لیا جائے اور آپ لوگوں کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے۔ دوسرے مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں میں یہ محکمے کم سے کم زیادہ شریفانہ اور مفید عام فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یعنی ان کا دائرہ عمل جرائم تک محدود نہیں اور وہ صرف امن عامہ قائم رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ خیر یہ بات تو تبرہ ہو گئی۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جو لوگ ان محکموں میں آتے ہیں وہ زندگی کے قبیح پہلوؤں سے کچھ فطرتاً زیادہ مانوس ہوتے ہیں۔ اور ان کی نفسیات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو بڑی عبرت ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بعض لوگوں کو جرائم سے پیدائشی لگاؤ ہوتا ہے اور جب یہ لوگ چند در چند اسباب کی وجہ سے جرائم پیشہ نہیں ہو پاتے تو پھر ان کے اندر سراغ رسانی اور احتساب کی آگ حرکت کرنے لگتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر زندگی نے موقع دیا ہوتا اور خاطر خواہ آزادیاں میسر ہوئی ہوتیں تو آج پولیس کا ہر افسر جرائم پیشہ ہوتا وہ تو "کافر نتواں شد ناچار مسلماں شو" والی بات ہے۔

امریکہ نے اس راز کو سمجھا ہے سنتے ہیں وہاں شرائط جرم کے کارناموں کی اشاعت ممنوع ہے۔ اس لئے کہ یہ کارنامے مجرموں کے لئے زیادہ باعث تحریک ہیں۔"

میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں نے نظام الدین پر ان کی اصلیت روشن کر دی اور ان کے اندر یہ احساس سب کے سامنے پیدا کر دیا کہ وہ کس قدر پست درجہ کی مخلوق ہیں اس احساس سے وہ تلملا اٹھے اور برافروختہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر کتنا چودھری نبی احمد نے اصرار کیا کہ وہ کچھ دیر اور بیٹھیں لیکن وہ چلے ہی گئے، چلتے چلتے مجھے اپنے محکمے کے اختیارات کی دھمکی دیتے گئے ہیں۔ ان کے آخری الفاظ یہ تھے "یہ تو باغیانہ خیالات ہیں۔ سرکار کو چاہئیے کہ ایسے لوگوں کو نگاہ میں رکھے اور ان سے ہوشیار رہے"۔

میں نے ہنس کر کہا "نظام الدین صاحب سرکار کو جو کرنا چاہئیے کر رہی ہے اور آپ اس سے ناواقف نہیں ہیں۔ آپ کی سرکار اگر ایسا نہ کرے تو آج اس کی طاقت اور اس کے اقتدار کا راز فاش ہو جائے لیکن جس سرکار کی بنیاد جاسوسی پر ہو تو تاریخ میں اس کے دن گنے ہوئے سمجھئے"۔

* * * * *

خدا خدا کر کے نظام الدین تشریف لے گئے اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ جو فضا گندی اور زہر آلود ہو گئی تھی وہ پھر صاف ستھری اور زندگی بخش ہو گئی۔ لیکن میں نے سب کو بُری طرح فکرمند پایا۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید

چودھری نبی احمد کو یہ بات بُری لگی کہ میں نے ان کے گھر میں بیٹھ کر ان کے ایک مہمان کو اس طرح رسوا کر دیا۔ میں نے چاہا کہ معذرت کروں۔ چودھری نبی احمد نے کہا "خوب سمجھے! میاں میں تمہاری نیرنگی دیکھ رہا ہوں۔ تم کو اس شخص کے منہ نہ آنا چاہئے تھا۔ بڑا مفسد ہے۔ دوستوں کو بھی پیچ کھاتا ہے۔ اب آج سے وہ تمہاری تاک میں رہے گا۔ اور پھر تمہاری زندگی جیسی ہے ظاہر ہے اس کو بہت جلد اپنا داؤں پھیلانے کا موقع مل جائے گا۔"

میں نے کہا "چودھری صاحب۔ آخر میں کیا کرتا؟ مجھے اس شخص کی صورت دیکھ کر غصہ آ رہا تھا اس کے چہرے سے اس کے نفس کی خباثت ظاہر ہو رہی تھی یہ آدمی اُن بدبختوں میں سے ہے جن کو حُسن سے نفرت ہوتی ہے اور جو حسین چیز دیکھ کر جلنے لگتے ہیں میرا تو خیال یہ ہے کہ اس شخص کا رنگ جو اس بھیانک طور سے سیاہ ہے سو اس کا سبب یہی ہے کہ وہ ہر لمحہ اس غم اور غصہ میں جلا کرتا ہے کہ دنیا میں بے قدر کیوں حُسن کا وجود ہے۔ وہ کیوں ہے۔ میں نے ایک سے ایک سیاہ فام لوگ دیکھے ہیں لیکن آج تک میں نے کسی کے سیاہ رنگ کو اس قدر کریہہ اور گھنونا نہیں پایا اس کے چہرے کا رنگ دراصل اس کے دل کا رنگ ہے جو باہر پھوٹ نکلا ہے۔"

چودھری نبی احمد اس پر بے اختیار ہو کر ہنسنے لگے اور ان کے دل سے ساری کلفت دھو گئی بیگم عزیز نے کہا "شہاب صاحب اس قدر بے لاگ ہو کر باتیں کرتے ہیں اور اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتے ہیں کہ انکار یا اختلاف کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ تو اپنے مشاہدہ کو دوسروں کا مشاہدہ بنا دیتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نظام الدین کا باطن اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔"

"میں تو آپ کے آخری جملہ میں کھو سی گئی" مروارید نے والہانہ انداز میں کہا! "اس جملہ پر گویا آپ کی مُہر لگی ہوئی ہے۔ اس کو آپ ہی کہہ سکتے تھے۔ یہ نفسیاتی واقعیت اور یہ شاعرانہ انداز ایک ہی وقت میں دوسرے کے بس کی بات نہیں ہے۔ واہ!" اتنے میں سبحان آ گئے۔ انہوں نے سُنا تو مارے ہنسی کے لوٹنے لگے اور کہا "اس قسم کی خلاقانہ عبارتیں تو آپکی حصہ ہو گئی ہیں۔ میں نے پچھلا ایک افسانہ صرف اس لئے کبھی نہیں بھولوں گا کہ اس میں ایک شخص کی سیرت بیان کرتے کرتے آخر میں آپ نے یہ کہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے دل میں تشنگی اور دماغ میں کوڑھ تھا۔ چودھری نبی احمد نے کہا "یہ سب کچھ صحیح مگر شہاب کو سمجھ بوجھ کر اور موقع محل دیکھ کر زبان کھولنا چاہئے۔ خواہ مخواہ اپنے لئے خطرے پیدا کر لیتے ہیں۔"

میں نے اب چُپ ہی رہ جانا بہتر سمجھا۔"

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اور خُنکی بڑھ رہی تھی۔ میدان سے ہم سب لوگ اُٹھ کر کمرہ میں آ گئے۔ عزیز کو کہیں جانا تھا اس لئے وہ چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ بیگم عزیز نے کہا "میں ابھی کچھ دیر اور ٹھہروں گی آپ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد گاڑی بھیج دیجئے گا۔"

آج بیگم عزیز نے مجھ سے ایک عجیب سوال کیا جو اس قدر دلچسپ تھا کہ مروارید بھی آج اپنا سارا جذبۂ رشک بھول گئی۔ بیگم عزیز نے بڑی دردمندی کے ساتھ پوچھا "شہاب صاحب ایک بات میں آپ سے پوچھتے پوچھتے رہ جاتی ہوں۔ آپ اتنا کم کیوں ہنستے ہیں اور جب کبھی ہنستے بھی ہیں تو آپ کی ہنسی محض دکھانے کی ہوتی ہے۔ آپ کی ہر بات سچی ہوتی ہے سوا آپ کی ہنسی کے۔ اس میں کیا راز ہے؟"

مروارید اس سوال پر سراپا تحسین و آفرین تھی۔ اس نے کہا "واہ آج تو آپ نے ایک ایسی بات نہ صرف ہم لوگوں کو متوجہ کر دیا ہے جو دن کی طرح روشن تھی مگر جس کی طرف ہم لوگوں کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔"

میں نے کہا "یہ ذمہ نہیں لیتا کہ آپ کی رائے صحیح ہے لیکن ایک اس قسم کی ہنسی ہوتی ضرور ہے غالب نے اپنے اس شعر میں ہنسی کا نقشہ کھینچا ہے۔

"بصورت تکلف بہ معنی تاسف
اسد میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

لیکن میں تو اچھا خاصا ہنس لیتا ہوں "

" نہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ بہت کم ہنستے ہیں اور جھوٹی ہنسی ہنستے ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے ؟ " مروارید نے بیگم عزیز کے سوال کو زیادہ زور کے ساتھ دُہراتے ہوئے کہا۔

" سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سوال کا کیا جواب دوں جبکہ جو الزام تم لوگ مجھ پر لگا رہی ہو۔ مجھے اسی کو ماننے میں تامل ہے۔ تاہم ایک بات یاد آگئی۔ جرمنی کے ایک مشہور ادیب اور فلسفی نے شیطان کی زبان سے ایک بڑے مزے کی بات کہلوائی ہے " مدت ہوئی کہ خدا ہنسنا بھول گیا " تو جس دنیا کے خالق کو ہنسی نہ آتی ہو اس دُنیا میں کوئی کیا ہنسے اور کس بات پر اور کس دل سے ؟ "

میں نے بات بڑے مزے سے اُڑا دی تھی۔ لیکن مروارید نے اسی سلسلہ میں ایک دوسرا سوال کر دیا جس کی طرف مجھے سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہونا پڑا۔ اس نے پوچھا " اچھا شہاب صاحب سچ سچ بتلائیے آپ کبھی کسی چیز سے واقعی خوش اور آسودہ بھی ہو سکتے ہیں ؟ — "

میں نے کہا " مروارید میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم نے اس وقت یہ سوال کیوں کیا۔ لیکن میرے خیال میں ناآسودگی انسان کے خمیر میں ہے اور اس کی تمام ترقیوں کی ضامن ہے جب زندگی نام ہے حرکت دوام کا تو اس میں آسودگی کا سوال بے کار ہے ———

حال سے ناآسودہ رہنا مستقبل کی دلیل ہے۔ جب ایک صورت حال زیادہ عرصہ تک قائم رہ کر خشک اور سخت اور بے جان ہونے لگتی ہے تو انسان اس سے متنفر ہو جاتا ہے اور نئی صورت حال پیدا کرنے کی غرض سے بغاوت پر تل جاتا ہے۔ آفرینش کے دن سے کر اب تک یہی ہوتا ہے۔ زندگی اور ارتقا کا راز یہی ناآسودگی اور بغاوت ہے یہ بیکار خارجی ہے یا اندرونی ؟ یہ دوسرا سوال ہے مگر کسی نہ کسی قسم کی ناآسودگی انسان کا مقدر ہے اور اس کی زندگی کی کفیل۔ میرا خیال ہے کہ اگر انسان کی زندگی میں ناآسودگی نہ ہوتی تو بہت جلد اس کو پیدا کرنے کی ضرورت پڑتی اور آدم اور فردوس کے قصہ کو اگر من و عن تسلیم کر لیا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ واقعی یہی ہوا۔ آدم اور حوا کو ناآسودگی کا بہانہ ایجاد کرنا پڑا۔ خیر یہ تو ایک مذاق ہے لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو تو میری جیسی طبیعتیں کبھی کسی ایک حال پر قرار نہیں پا سکتیں اور ان کو کسی چیز سے آسودگی نہیں ہو سکتی۔ "

* * * * * * * *

آج میں نے کئی صفحے لکھ ڈالے۔ جب جب موقع ملتا گیا۔ بیٹھ کر لکھتا گیا۔ آج مجھے کسی نے ٹوکا بھی نہیں۔ مروارید نے مجھے کئی بار لکھتے ہوئے دیکھا۔ مگر آج میرا خدا سید ھا تھا۔ کچھ بولی نہیں اور مجھے میرے حال پر چھوڑے رہی۔ خدا اس کا بھلا کرے۔

(باقی)

اعتذار: — گزشتہ ۲ ہفتوں سے سحر صاحب مسلسل اور شدید بیمار رہے اور اب بھی کامل طور پر صحت مند نہیں ہیں۔ اس لئے " سرگزشت " نہیں لکھی جا سکی ——— ادھر یہ افسانہ ملک بھر میں بے حد مقبول ہوا ہے اور تقاضوں پر تقاضے چلے آ رہے ہیں کہ " سرگزشت " کے زیادہ سے زیادہ صفحے دیئے جایا کریں۔ ہمیں " سرگزشت " کے قدردانوں کی مایوسی کا اندازہ ہے۔ مگر مجبوری ——— کو کیا کریں۔

(ادارہ)

خاص (تنویر کیلئے)

غزل

(از محترمہ نواب سیدہ سردار بیگم "اختر" (حیدرآبادی) مدیرہ حرم کانپور)

یہ شانِ لطف ہے، یا رنگِ برہمی کیا ہے؟ ۱ رُخِ حسیں پہ ترے، یہ فسردگی کیا ہے؟

ہوں تو اسیرِ محبت! خطا معاف!! اب مجھے ۳ خبر نہیں کدہ و رسمِ عاشقی کیا ہے؟

جسے تلاشِ دوا ہے وہ درد ہی کیا ہے ۲ ہوس کی شان ہو جس میں وہ عاشقی کیا ہے؟

ترے فراق کو آرامِ جاں، بنا لینا! ۴ پھر اور اس کے سوا درسِ زندگی کیا ہے؟

حجابِ لالہ و گل میں جو تو نہیں ہے! تو پھر ۵ یہ بوئے روح فزا رنگِ دلکشی کیا ہے؟

کسی کی موجِ تبسم کے سب کرشمے ہیں ۶ وگرنہ لالہ و گل کی شگفتگی کیا ہے؟

اُسی کی چشمِ توجہ یہ راز سب جانے ۷ میں کیا بتاؤں خودی کیا ہے بیخودی کیا ہے؟

اٹھی ہے دل سے پھر اک موجِ شوق و بیتابی ۸ نشاطِ دردِ محبت میں پھر کمی کیا ہے؟

برس رہا ہے، فضاؤں سے نشۂ غمِ عشق، ۹ کسی کی چشمِ حسیں آج شبنمی کیا ہے؟

تری جبینِ زر افشاں کا فیض ہے ورنہ ۱۰ قمر کا نور ستاروں کی روشنی کیا ہے؟

اسے بھی اس کے غمِ عشق میں بھلا دینا ۱۱ جو بے خودی سے کہیں تو پھر خودی کیا ہے؟

نہ پوچھ ہم سے ہمارے لبِ خموش کا راز ۱۲ رہینِ عرض جو ہو شرحِ عاشقی کیا ہے؟

کہاں کے شیشہ و پیمانہ و سبو! اختر ۱۳ تری نگاہ کے صدقے مجھے کمی کیا ہے؟

حیاتِ انسانی میں دولت کا وجود

نفسیات و فلسفہ کی روشنی میں

از جناب سید احمد علی احمد جذبی (بھوپال)

دورِ حاضرہ کے حکماء ہیئت دانان اور ماہرین علم النفس اس نظریہ سے کلیتہً متفق الرائے ہیں کہ حیاتِ انسانی ترکیب ہے دو عناصر سے "نفس و دماغ" عموماً دماغ کو ایک مادی شے اور نفس کو ایک روحانی شے فرض کیا جاتا ہے۔ نفس سے مراد عام خواہشات انسانی ہیں، دوسرے الفاظ میں انسانی دماغ کی وہ قوتیں ہیں جو جملہ قوائے مدرکہ کی حاکم اور ان کو مجتمع کرکے حرکت میں لاتی ہیں۔ اکثر عقل و روح پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے نفس و دماغ ایک دوسرے سے منسلک اور اثر انداز ہیں چنانچہ اگر دماغ پریشان و متفکر ہو تو جسمانی اضمحلال کا پیدا ہونا ضروری ہے اسی طرح اگر جسمانی تکلیف موجود ہو تو روحانی پژمردگی و افسردگی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہی جسم و روح ہماری ذات کے دو اہم اجزا ہیں اور انہی سے حیاتِ شخصی ترکیب ہے لیکن نفس دماغ پر فائق حیثیت کا حامل ہے۔

یہ عام خیال ہے کہ رنج و راحت، انقباض و انبساط شادی و غم، جملہ تغیرات ذہنی اور کیفیات حسّاسی کا تعلق جسم سے اس قدر نہیں، جس قدر دل یعنی نفس سے ہے۔ یہی وجوہات ہیں جن کی بناء پر نفس و دماغ مستقل طور سے مدبرین و مفکرین اور ماہرین نفسیات کے فلسفیانہ غور و فکر کا مستقل موضوع بنے ہوئے ہیں، دماغ و نفس اس درجہ ایک دوسرے سے وابستہ اور اثر انداز ہیں کہ کوئی تکلیف عام اس سے کہ وہ روحانی ہو یا جسمانی دونوں بشدت تمام محسوس کرتے اور اثر انداز ہوتے ہیں انسان کے احساسات غم و مسرت کا تعلق انہی دونوں عناصر سے ہے یعنی اس احساس کو جو نفس و دماغ میں تاثرات خارجی سے مرتب ہوتا ہے جذبہ الم و مسرت کہا جاتا ہے۔ اس احساس لذت والم کی دو مختلف و متنوع طرائق ہیں۔ اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت درجہ اہم، روحانی اور جسمانی، روحانی تکلیف کے نفوذ کا باعث محض تصورات ہیں انسانی وجود میں تصورات نہایت درجہ اہم ہیں بیشتر ناکامیوں اور کامرانیوں کا انحصار اور جملہ امور متعلقہ محض تصورات پر مبنی ہیں۔ دنیا کے اکثر مسرور اور مطمئن انسان ارباب تصورات ہیں۔

انسانی خیال کی دو صفات ہوتی ہیں مسرت بخش اور تکلیف دہ اسی کا دوسرا نام جذبہ ہے گویا خیال سے جذبہ

کا نفاذ ہوتا ہے اور اسی جذبہ کی نوعیت کے لحاظ سے فعل عمل میں آتا ہے۔ اسی جذبہ کی اہم پیداواریں خواہشات و اُمیدیں ہیں اور یہی اکثر لذت والم کا باعث بنی رہتی ہیں، خواہشات اور اُمیدوں کی مطابقت سے فعل کا عمل میں آنا باعثِ مسرت اور اسکے منافی کسی امر کا واقع ہونا باعثِ تکلیف ہے اگر جذباتِ الم کی فراوانی اور شدت پیدا ہو جائے اور اس کا تسلسل ایک عرصہ قایم رہے تو یہ لازمی امر ہے کہ دل و دماغ پر بُرے اثرات مرتب ہوں۔ اور نتیجہ ًنا موافق حالات کی تاب لاکر کمزور ہو جائیں اور اپنا فعل بند کردیں جو انسان کی موت کے مترادف ہے۔

تصریحات بالا ہم کو اس تلاش و تجسس پر مجبور کرتی ہیں۔ کہ موجودہ دورِ ارتقا میں وہ کونسی شے ہوسکتی ہے جو انسانی خواہشات اور اُمیدوں کو بہمہ وجوہ احسن و مکمل کردے اور حیاتِ انسانی کو خوشگوار اور معمورۂ مسرات بنادے۔ متعدد شواہد و تمثیلات ہمارے اس نظریہ کو تقویت دیتے ہیں کہ تنہا دولت وہ شے ہے جو انسانی خواہشات اور اُمیدوں کی تکمیل اور نفس و دماغ کی تسکین کا باعث ہے۔

تفصیلات مندرجہ کی روشنی میں ہم انسانی خواہشات کا جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ انسانی دُکھ و سُکھ سے ان کا کیا تعلق ہے:۔ ؟ ۔

انسان کا مقصد حیات تکمیل سکون، تکمیل راحت، اور تکمیل مسرت ہے۔ اگرچہ وہ انفرادی حیثیت سے بھی تکمیل حیات کرسکتا ہے۔ لیکن حقیقی اعتبار سے اس وقت تک سکون راحت اور مسرت سے دوچار اور لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں مل سکتا۔ جب تک کہ وہ من حیثیت المجموع اور من حیثیت القوم سکون حقیقی کی جستجو میں کامیاب نہ ہوجائے

کیونکہ قومیت ایک زندہ تخیل ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے تازگی پسند اور جدت طراز واقع ہوا ہے ایک پہلو پر اسے قرار نہیں کوئی حالت عام اس سے کہ کتنی ہی دل پسند کیوں نہ ہو۔ ایک عرصہ کے بعد طبیعت میں تنفر کا باعث ہونے لگتی ہے۔ عملی زندگی کی یکسانیت دماغی قویٰ کے لئے موت ہے، قناعت بےبسی کا نام ہے متانت، سنجیدگی و سکون موت کے مترادف ہیں نہ صرف انفرادی زندگی بلکہ حیات اجتماعی اور بقائے قوم و ملت کا بھی یہی حال ہے غرضکہ تبدیلی و تنوع کی خواہش انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور زندگی کے روشن پہلو کو زیادہ نمایاں ظاہر کرنا قدرتی احتیاج ہے اس فطری خاصہ کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو اس میں آزادی کی قدرتی خواہش مضمر ہوتی ہے۔ یہی آزادی کا جذبہ مسلسل تبدیلی کا خواہشمند اور انسانی ترقی کا باعث ہے لیکن مفلسی آزادی کے نظریٰ ہما کو جو انسان کا پیدائشی حق ہے اس کے سینہ میں ہی گلا گھونٹ کر خاتمہ کردیتی ہے۔ اور غلامی کا گرویدہ بنادیتی ہے جو انسان کے طمانیت کے لئے دائمی تازیانہ ہے۔ حیات انسانی میں تمدن ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے۔ سکون حقیقی بغیر تمدنی زندگی کے ممکن نہیں۔ دنیا میں وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جس کا تمدن اعلیٰ اور نظام معاشرت ارفع ہو۔ لیکن حصول تمدن بغیر دولت کے محال ہے تاریخ عالم کے صفحات ہمارے اس استدلال کی تائید میں ہم کو یہ بتلاتے ہیں کہ تمدن کا آغاز انہی ممالک میں پہلے ہوا جہاں دولت کی فراہمی جلد ممکن تھی گرم ممالک میں کیونکہ قدرت کے ودیعت کردہ ایسے لطائف موجود تھے اور حصول دولت کے ذرائع سہل الحصول و آسان تھے۔ اس لئے تمدن کا آغاز جلد ہوا۔ اس کے مقابلہ میں سرد ممالک جہاں دولت کی فراہمی

اس حد تک پیدا نہیں ہوئی جو تمدن کے آغاز کیلئے ضروری ہے۔

دنیا میں اس وقت ایک ہیجانی دور کا آغاز ہو رہا ہے افکار و عقائد میں شدید طلاطم برپا ہے۔ معاشرتی تحریکات، اقتصادی سوالات، اختراعی امکانات، جدید رجحانات و نظریات اور ذاتی میلانات، یہ تمام عناصر ایک نئے دور کی آمد کی خبر دے رہے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کسی زبردست لامعلوم انقلاب کی بےچینی سے منتظر ہے، اور انسان اپنی فطری احتیاج کی وساطت سے موجودہ ماحول سے غیر مطمئن ہے۔ قرن ماضیہ کے کسی عرصہ میں دنیا کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور سماجی مسائل میں اس درجہ پیچیدگیاں نہیں پیدا ہوئیں، جتنی کہ آج ہیں۔ تغیر و انقلاب کی کشمکش تمام شعبات حیات میں نظر آ رہی ہیں۔ کائنات کو ایک لمحہ کے لئے سکون نہیں دنیا کا ہر حصہ اقتصادی طور پر باہم منسلک ہے ہر ملک میں بیکاری کا دور دورہ ہے، سیاسی، معاشرتی تمدنی اور اقتصادی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ دنیا کے پونے دو ارب باشندوں میں چالیس کروڑ انسان بیکار محض ہیں، غرضکہ جملہ مفاسد کا منبع بیکاری و مفلسی ہے اور جملہ مصائب کی جڑ فقر و احتیاج ہے دنیا میں چوری، ڈاکہ زنی، امن سوزی، بدمعاشی و دروغ بافی خون ریزی، قانون شکنی وغیرہ انسانیت سوز افعال اور امن شکن حرکات کا وجود محض اس وجہ سے ہے کہ وہ غریب مفلس و بیکار رہیں ان کو ضروریات زندگی کی فراہمی کے لئے دولت کی ضرورت ہے۔ ہماری معاشرت، سیاست، تمدن، ترقی، علم و دانش، دانائی و فراست خیالات، تصورات، امیدیں و خواہشات غرضکہ جملہ ضروریات زندگی اور تسکین قلب کے اسباب جن پر حیات انسانی کا انحصار ہے۔ حصول نتیجہ کے نقطۂ نظر سے اپنی تکمیل کے لئے دولت ہی کے شرمندۂ احسان ہیں۔

معاشرتی اصطلاح میں دولت نام ہے۔ ہر اس شے کا جو فائدہ مند ہو اور لوازم حیات اور ضروریات زندگی میں معاون ہو اس طور سے ہم دولت ہی کو ضروریات زندگی اور لازمہ حیات کہہ سکتے ہیں۔ اور جائز طور پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دولت انسانی کردار، اس کی خوبصورتی اور اعلیٰ مقاصد حیات کی تکمیل کی خالق ہے۔

غرضکہ یہ تمام جزئیات ہماری روزانہ زندگی سے متعلق ہیں اور انہیں سے انسان کے دکھ، سکھ اور کیفیات جذبی کا تعلق ہے۔ اس طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرائض معیشت کے ادا کرنے اور زندگی کو بہ ہمہ وجوہ احسن و مکمل کرنے میں جو شے سب سے زیادہ معین و کارآمد ہو، وہی سب سے بہتر اور اسی کی تحصیل سب سے مقدم اور سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اور وہ اکتساب زر ہے۔ یہی انسانی خواہشات و امیدوں کو اس کی حسب منشاء مکمل کرتی ہے۔ ورنہ بصورت دیگر قوانین نفسی کے مطابق اس پر کیفیات الم اور حسرت و یاس، پژمردگی و افسردگی کے جذبات طاری ہوں گے۔ اور انسانی جذبہ کو ٹھیس پہنچے گی۔ اور ایک ناگوار کیفیت طاری ہوگی۔ جس کا اثر اعصاب کے ذریعہ دماغ کی جانب منتقل ہوگا۔ اور ایک ہیجانی کیفیت کے زیر اثر جذبات الم کی صورت اختیار کرے گی۔ اور اس کا اظہار و نفاذ مختلف و متعدد و مہلک امراض کی صورت میں ہوگا۔ جس کا بعد میں موت کی صورت میں صادر ہونا لازمی ہے۔ زندگی ایک دلکش راگنی ہے لیکن چند روزہ اس کی دلکشی کتنی جلد ختم ہونیوالی ہے اس حیات چند نفس کے لذائذ سے محض اس بنیاد پر کنارہ کش ہونا کہ کسی دوسری دنیا میں اس سے بہتر لذتیں آرام و سکون حاصل ہوگا۔ ایسا ہی نرا احمقانہ فعل ہے کہ ہاتھ کی مچھلی کو اس امید پر دریا میں ڈال دیا کہ بڑی مچھلی حاصل ہو جائیگی۔ بصورت دیگر کیا زندگی محض ایک مایوسی اور حسرت سے نکل کر دوسری حسرت و یاس کی زندگی سے دوچار

بھنے کا نام نہیں۔ زندگی کو رنجیدہ و ملول کیوں بنائے۔ خوش و خرّم کیوں نہ رہو۔ کیونکہ دنیا میں اسی سے کسی کو اور خود اپنے آپ کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کیا انسان محض جینے کے لئے زندہ ہے۔ کیا مسرت ہمیں یہ محسوس نہیں کراتی کہ حیات قابل قدر شے ہے جب تمہیں زندہ ہی رہنا ہے تو کیوں ' سیاہ مست رندوں کی طرح نہ رہو جو بساط عشرت پر پیالے خالی کر دیتے ہیں اور ہر بار زندگی کو مخاطب کر کے آواز دیتے ہیں کہ ایک جام اور۔

اطمینان اور طمانیت کی دیوی سکھ شانتی اور آنند کی رانی کا استھان صرف دولت ہے اور اس سے روح اور آتما کو تسکین ہوتی ہے ایسی سکھ و آنند کی سندر دمنوہر جگہ کو چھوڑ کر وہ کہاں جا سکتی ہے؟ فقط!

رعایت! ادارہ تنویر نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ طلباء اور لائبریریوں سے چندہ سالانہ صرف (عہ) ڈھائی روپیہ لیا جائے۔ بشرطیکہ عہ روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیجکر رسالہ جاری کرایا جائے۔ تاکہ وی پی کے اخراجات کا بار وقت پر نہ پڑے اُمید کہ اس رعایت سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

منیجر تنویر بمبئی ۸

افسانہ

نیرنگ تقدیر

از محترمہ سعیدالنساء بیگم صاحبہ بنت اصغر حسین صاحب

میں ایک متمول و شریف گھرانے کا رکن ہوں اور ایک باعزت مشہور شہر کا باشندہ، ہم دو بھائی تھے۔ میں بڑا ہوں۔ ہمارے والدین ہم دونوں کو بہت چاہتے تھے یوں تو والدین کو اولاد پیاری ہوتی ہی ہے۔ لیکن ہمیں والدین کی محبت و شفقت بہت زیادہ حاصل تھی، خاص کر میرے اختیارات بہت وسیع تھے میرے حکم کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا تھا میرے باپ ایک عہدہ پر مامور تھے اور ہماری زندگی بہت آرام سے گزرتی تھی۔ ہمارا خاندان بھی وسیع تھا لیکن اتفاق روزگار سے دور دراز مقامات پر جا بسے تھے میرا بچپن تھا اس لئے میں انھیں یاد نہ رکھ سکا حالانکہ یہ ضرور معلوم تھا کہ ہمارے ہی رشتہ دار قریبی ہیں اور یہی حال شاید ان کا بھی ہو۔

خیر اب ہماری زندگی کا دوسرا دور تھا۔ بچپن رخصت ہو چکا تھا ہم میدانِ عمل میں آنیکی تیاریاں کر رہے تھے۔ اگر سچ جانئے تو یہیں سے وہ واقعات رونما ہوتے ہیں جو آگے چل کر افسانہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ عہد طفولیت، کیونکہ گزرا یاد نہیں اسی زمانے میں میں اور میرا بھائی ریاض ایک کالج میں زیر تعلیم تھے۔ سن کے ساتھ ساتھ تعلیمی منازل بھی طے کر چکے تھے اس وقت میری عمر ۲۲ سال اور ریاض کی ۲۰ سال تھی اتنا ہی فرق کلاس میں بھی تھا۔ میرا ابھی آخری سال تھا اس کے بعد مجھے کسی دوسرے شہر کی یونیورسٹی میں جا کر تعلیم کی تکمیل کرنی تھی۔ میں نے اپنے ارادے کا ایک سال قبل اعلان بھی کر دیا تھا۔ جب یہ خبر اُڑی تو میری والدہ نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں شادی کر لوں مگر چونکہ میں آزاد خیال تھا، خود مختار تھا میں نے انکار کر دیا اس پر بھی یہ مسئلہ کچھ وقفہ سے ضرور پیش ہوتا کبھی دوستوں کے ذریعہ پیام ملتا اور کبھی کاغذ و قلم کے ذریعہ، اسی طرح مختلف طریقوں سے کہا جاتا اور ہمیشہ میں یہی کہتا کہ میں اپنی مرضی سے کروں گا۔ مجھے جاہلوں کے طریقے ناپسند ہیں اسی طرح چھ مہینے گزر گئے۔ اسی دوران میں نہ معلوم کتنی بار تنگ کیا گیا ادھر وقت کم رہ گیا اور مجھے جلدی جواب دینے کو کہا گیا میں بھی عاجز ہو گیا تھا اور سوچے بیٹھا تھا کہ اب کوئی پیغام آئے گا تو میں اپنا قطعی فیصلہ سنا دوں گا اب تو میری حیرت و پریشانی کی انتہا نہ رہی جب ریاض نے مجھ سے کہا کہ تمھاری رائے کے موافق تمھیں پورا پورا اختیار دیدیا گیا ہے۔ جہاں تم مناسب سمجھو فیصلہ کر لو۔ میرے لئے ایک اور مصیبت درپیش ہو گئی۔ میں تو وقت کے ٹالنے کی غرض سے یہ ضد کر رہا تھا چار و ناچار میں والدہ کے پاس گیا مگر یہ سوچ کر گیا۔ کہ جس جگہ وہ کہیں گی میں ناپسند کر دوں گا اور وہی ہوا کہ انھوں نے ہزاروں نام گنا ڈالے، لیکن میں ہر ایک جگہ کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتا۔ آخر ایک ہمارے ہی رشتہ دار تھے مگر مدت ہوئی تھی کہ وہ اس مقام سے بہت دور رہنے لگے تھے ان کی لڑکی شکیلہ کے متعلق کہا میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ غیر ارادی طور سے

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر کیا تھا سب پھولے نہ سماتے تھے مگر ساتھ ہی میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگرچہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے لیکن ابھی آپ کر نہ چھیڑیں، کیونکہ میری تعلیم باقی ہے اُس وقت تو سب نے ہاں میں ہاں ملائی، لیکن دل کے حال کو کون جانے اب میرا سال ختم ہو گیا اور میں یہاں سے کئی سال کے لئے چلا گیا۔ میرے جاتے ہی والدہ نے لڑکی کے والدین کو لکھا اور وہ لوگ بھی نیم راضی ہو گئے۔ جب یہاں تک معاملہ بڑھ چکا تو مجھے اطلاع دی گئی لیکن میں نے کوئی اعتراض نہ کیا دور دراز کا ایسا معاملہ تھا کہ کوئی رائے قائم نہ ہو سکی۔ اور نہ طے پائی۔ کچھ اِدھر کچھ اُدھر، ہاں، ہوں ہو کر رہ گیا اور نہ میں نے دریافت کرنا مناسب سمجھا اور نہ کوئی اطلاع ملی۔

جب سے میں یہاں آ کر پڑھ رہا تھا میری طبیعت بہت گھبراتی رہتی تھی۔ مطالعہ میں وقت صرف ہوتا یا کوئی ناول لے کر بیٹھ جاتا مجھے یہاں آئے کوئی سال ڈیڑھ سال گزر چکے تھے ایک روز طبیعت بہت گھبرا رہی تھی۔ باغ کے سامنے اپنے برآمدے میں بیٹھا ہوا حسب معمول ناول سے دل بہلا رہا تھا کہ میرے دوست رشید کی آمد نے مجھے چونکا دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رسالہ تھا۔ رسمی باتوں کے بعد میں نے پوچھا رشید کونسا رسالہ دیکھوں۔

اس نے جواب دیتے ہوئے کہا زنانہ رسالہ ہے۔

میں نے کہا رکھتے جاؤ، میں دیکھ کر بھجوا دوں گا۔ آج کل میری کتابیں بھی ختم ہو گئی ہیں۔ اس لئے دل اور بھی نہیں لگتا۔ رات تو رشید کی معیت میں کٹی۔ صبح سے میں اپنے فرائض سے فراغت پا کر سر شام سے ہی رسالے کر بیٹھ گیا۔ پہلا ہی ورق الٹا تھا کہ ایک نسوانی تصویر پر نظر پڑی۔ جس کے نیچے یہ سطور درج تھیں۔

(مس ایس ہاشم۔ جنہیں افسانہ نویسی میں انعام اوّل ملا ہے انعامی افسانہ شریک اشاعت کیا جاتا ہے) میری مشتاق نگاہوں نے چند ورق الٹ پلٹ کرنے کے بعد نکال ہی لیا اور میں نے شوق سے پڑھا۔ مجھے بے حد پسند آیا اس کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ اس ہستی کو کسی نہ کسی طرح تلاش کرنا چاہئے میں اپنے ارادے سے آگاہ کرتا تو کسے کرتا کبھی یہ خیال پیدا ہوتا کہ نیچر سے پتہ دریافت کروں ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہو جاتا کہ نہ معلوم نتیجہ کیا نکلے غرض دو تین گزر گئے۔ اور میں اسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ تیسرے دن رشید سے ملاقات ہوئی۔ ابھی پڑھا نہیں کہہ کر میں نے رسالہ دینے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ ابھی تک کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ یہ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ مجھے الجھن کا ہیکی ہے۔ اس تصویر میں آخر کونسا جادو ہے۔ کونسا سحر ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچے لیتا ہے یوں ہزاروں تصویریں میری نظر سے گزر چکی تھیں ایک تو پہلے ہی میں بد پریشان رہتا تھا اب ایک اور آفت ناگہانی نازل ہو گئی، ناول پڑھوں تو دل نہیں لگتا۔ کالج کی کتاب لی، تھوڑی دیر میں طبیعت گھبرا گئی ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہی افسانہ میں نے نہ معلوم کتنی بار پڑھا۔ بعض وقت میں اپنی حماقت پر غصہ کرتا سوچتا کہ میں نے لیا ہی کیوں اسی دوران میں رشید ایک روز ایک کتاب کے سلسلے میں مجھ سے ملنے کے لئے آیا میں نے تھوڑی دیر کے لئے روک لیا مگر وہ میرے تغیر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے خرابی صحت کا بہانہ کر کے نجات پائی۔

آخر میرے ہاتھوں سے دامن صبر چھوٹ گیا میں نے اسی عذاب جان رسالے کا ذکر چھیڑا۔ اس کے بعد میں نے کہا پیارے دوست مجھے اپنے رسالہ میں سے مس ہاشم کی تصویر پھاڑ دو۔ پہلے وہ میرے الفاظ پر غور کرنے لگا۔ بار بار میری

طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ کہنے کی جرأت کرتا تھا
مگر اس کے الفاظ حلق میں اٹک کر رہ جاتے۔ مگر اس نے میری طبیعت
کا رنگ دیکھتے ہوئے خاموشی سے تصویر علیحدہ کر دی اور کچھ کہے بغیر
چلا گیا۔ اس شرمندگی کے باعث میں کسی سے نہیں ملا اکثر رشید آتا
تو میں اپنے نوکر کے ہاتھ کہلا بھیجتا کہ گھر پر نہیں ہیں مگر اس کو ان
سب باتوں کی خبر تھی جب کئی وقت اسی طرح گزرے تو میں نے
پھر یہی بہانہ پیش کر دیا۔ اب کی وہ خلاف معمول میرے کمرے میں
چلا آیا۔ اور ہنستے ہوئے پورا قصہ دہرا دیا۔ اب آپ ہی اندازہ
کیجئے کہ مجھے کس قدر پشیمانی ہوئی ہو گی غرضکہ میرا راز فاش ہو گیا اور
مجھے تسلی دی اور کہنے لگا کہ ایسا کون سا کام ہے جو تم اس قدر پریشان
ہو۔ اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر مجھے اس کی تشفی سے اطمینان
ہو گیا۔ میرا غم کسی قدر ہلکا ہو گیا مگر دل سے بھلا نہ سکا۔ اس واقعہ
کو گزرے بھی کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن میرے دل میں ہر وقت
وہی خیال تھا۔

وطن جانے میں کچھ دن باقی تھے کہ والدہ کا خط آیا انھوں نے
تاکید کی تھی کہ میں اپنے عزیز یعنی شکیلہ کے والد سے ملنے
کے لئے ان کے گھر کالج سے ہی چلا جاؤں۔ چار و ناچار سامان
سفر تیار کیا۔ ادھر کالج بند ہوا اور میں روانہ ہوا۔ شہر میں داخل
ہوا اس سے پہلے کبھی آنے کا اتفاق نہ ہوا تھا اس وجہ سے ہر ایک
چیز نئی معلوم ہوتی تھی۔ آخر مکان تلاش کرتے کرتے بہت دیر
ہو گئی بارہ بجے کے قریب کار نے مجھے ایک چھوٹے مگر خوبصورت
مکان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ میں نے کئی بار سوال کیا یہی ہے چونکہ
مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا مگر جب نوکر نے نام اور پتہ سے اطمینان
دلایا۔ جب جا کے مجھے یقین ہوا میں اتر کر برآمدہ میں گیا جہیں
ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پردہ نصف اٹھا ہوا تھا اندر
سے ریڈیو کی آواز آ رہی تھی۔ میں ٹھہر گیا۔ آدمی نے کہا کہ اپنے صاحب
سے اطلاع کر دو۔ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا صاحب اور
بیگم صاحبہ دعوت میں گئے ہیں۔ صرف بی بی ہیں۔ اطلاع کئے
دیتا ہوں، اپنا کارڈ دیدیجئے۔ میں سوچنے لگا اور کارڈ دینے اور
نام بتانے سے بھی انکار کر دیا۔ صرف اتنا کہہ دیا۔ میں پردیس
سے آ رہا ہوں۔ اور ان کے عزیزوں سے ہوں۔ نوکر نے کہا
ہماری بی بی تو پردہ نہیں کرتیں۔ خاص کر عزیزوں سے، کہہ
آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اندر گیا۔ میں برآمدے میں کھڑا رہا مگر
باتوں کی آواز صاف سنائی دیتی تھی اس نے کہا کہ کوئی صاحب
آئے ہیں۔ اور آپ کے عزیز ہیں۔ کیا بلا لوں۔ اس کے جواب
میں کسی نے نازک آواز میں کہا۔ جب وہ نام اور پتہ نہیں بتاتے میں نے
کبھی دیکھا نہیں اور کوئی گھر پر ہے بھی نہیں۔ کیونکر بلا لوں میں چلی
جاتی ہوں ڈرائنگ روم میں بٹھا دو۔ میں اندر آ کر بیٹھ رہا۔ مگر ہر طرف
خاموشی تھی۔ دل گھبرانے لگا۔ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اتنے میں پھر وہی
نوکر آیا۔ اور پوچھنے لگا کہ آپ کے واسطے پان لاؤں یا چھالیہ الائچی
میں نے کہا کہ میں پان نہیں کھاتا۔ نوکر واپس چلا گیا مگر مجھے
ہنسی آنے لگی یہ سوچ کر اگر شکیلہ کو معلوم ہو جائے کہ میں کون ہوں
تو میری خاطر تواضع یوں نہ کرے گی۔ اس طرح کبھی بیٹھتا کبھی
ٹہلتا رہا۔ ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں جس
آواز کو میں پہلے سن چکا تھا پشت سے سنائی دی۔ وہ کہہ رہی
تھی کہ کوئی صاحب آئے ہیں۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔ نام و پتہ
پوچھا تو بتانے سے انکار کر دیا۔ شکیلہ کے والد باہر آئے مجھے
دیکھ کر پہچان لیا۔ باتیں ہوتی رہیں کہ آدمی نے آ کر کہا کہ چائے
تیار ہے اور وہ ملکر اندر آئے تو کوئی نظر نہ آیا چا ر وغیرہ پی کر
ہم لوگ باہر ٹہلنے لگے۔ اب تقریباً چھ کا عمل تھا کہ شکیلہ کے بھائی

بھی آگئے۔ اور ہمارا تعارف ہوا انھی کے اصرار سے شہر دیکھنے میں چلا گیا۔ صبح ہوئی تو شکیلہ کی والدہ بھی آگئی تھیں میں ان سے بھی ملا لیکن شکیلہ دکھائی نہ دی۔ میں نے سوچا کہ پردہ کرتی ہوگی کیونکہ ہمارے یہاں کا طریقہ یہی ہوتا ہے۔

اب یہاں میری ملاقات کئی لوگوں سے ہو چکی تھی ایک دن اس طرح ہم لوگ بیٹھے تھے، محبت کے فلسفے پر بحث ہونے لگی باری باری سب سے سوال ہوئے میری باری بھی آئی۔ ابھی تک میں نے حصہ نہیں لیا تھا۔ اس پر بھی میری بحث سب سے جداگانہ تھی۔ اس کے بعد میں نے اس تصویر کا ذکر کیا۔ جو میرے دل و دماغ پر مسلط تھی۔ سب ایک رائے ہو کر بولے دیکھیں میں نے کچھ توقف کیا۔ مجبوراً مجھے دکھانا پڑی۔ مجھے حیرت ہونے لگی اس معاملے پر کہ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے، کبھی تصویر کبھی مجھے آخر میں نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے کہ تم لوگ مجھے مجرم کی حیثیت سے کیوں دیکھ رہے ہو۔ اس پر میرے دوست نے شکیلہ کے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو ان کی بہن کی تصویر ہے۔ شرمندگی، خوشی و حجاب نے ایک ساتھ مجھے مغلوب کر لیا۔ مجھے یقین ہی نہ آتا تھا۔ اس پر سب نے کہا کہ شکیلہ کے کمرے میں جا کر دیکھ لو، غرض شام کو جب ہم اندر آئے تو شکیلہ کے بھائی شکیلہ کے کمرے میں لے گئے۔ جو بہت پرتکلف طریقہ پر آراستہ تھا۔ ایک کونے میں میز پر وہی تصویر لگی ہوئی تھی اور وہی سطریں درج تھیں، آج پہلی بار میرا ضمیر والدہ کے مذاق کی تعریف کر رہا تھا۔

میں کمرے میں بیٹھا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا کہ میرے پیچھے سے کچھ [illegible] سنائی [illegible] نے مڑ کر دیکھا تو ایک لڑکی جو سفید ساڑی اور ہلکے فیروزی رنگ کے بلاؤز میں ملبوس تھی۔ اسی کمرے میں داخل ہوئی۔ پہلے کچھ ٹھٹکی۔ پھر آگر الماری کھول کر کچھ چیزیں نکالنے لگی مگر ہماری بات چیت نہیں ہو سکی وہ چیزیں نکالتی جاتی تھی۔ اور آدمی کے ہاتھ سے بھجواتی جاتی تھی۔ جب وہ جانے لگی تھی تو میں نے ہمت کر کے پوچھا کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ ہی کا نام مس شکیلہ ہاشم ہے۔ اس نے جواب دیا جی ہاں مجھے شکیلہ ہی کہتے ہیں۔ دوبارہ میں نے دریافت کیا۔ آپ مجھے جانتی ہیں اس نے کہا کہ اگر غلطی ہو جائے تو مجھے معاف کیجیے گا خیال یہی ہوتا ہے کہ آپ کا نام مسٹر اختر ہے۔ میں نے خوشی کا اظہار کیا اس کے ہماری ملاقات برابر ہونے لگی اور رفتہ رفتہ حجاب کا پردہ اٹھتا گیا۔

مجھے یہاں آئے قریب دو ہفتہ ہو گئے تھے اور جس تاریخ میرا جانے کا ارادہ تھا وہ دن بھی چلا گیا۔ مگر میرا دل بھرتا ہی نہیں تھا۔ میں نے والدہ کو خط لکھا کہ میں ملازمت کی کوشش کر رہا ہوں، چونکہ میرے دوستوں نے یہی رائے دی ہے اور وہ بھی کوشش کر رہے تھے۔ اس پر بھی میں کچھ دنوں کے لئے وطن چلا گیا۔ کیونکہ بہت عرصہ گزر چکا تھا۔ میں دوبارہ آیا تو حسن اتفاق سے میری ملازمت کا بندوبست ہو چکا تھا۔ میں نے پھر والدہ کو اطلاع دی کہ اب آپ میری طرف سے کسی قسم کی فکر نہ کیجئے۔ کیونکہ میری تعلیم بھی ختم ہو گئی اور ملازمت بھی عمدہ مل گئی، قابل فخر اور میں نے اپنی زندگی کا ماحصل بھی پا لیا یعنی شکیلہ، اب آپ اس سے ہی میری زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وابستہ کر دیں۔ جس کی آپ کو ایک مدت سے آرزو تھی۔

غرض کہ میں ایک امیرانہ اور شمول زندگی بسر کر رہا تھا جس کے ساتھ خوشی و مسرت آمیزش تھی۔ ہم کبھی کبھی خوشگوار مقامات کی سیر کرنے چلے جاتے۔ کبھی کسی دریا کے کنارے بیٹھ کر خوشنما اور پرفضا مقامات کو دیکھتے ہوئے عہد ماضی کی یاد کو تازہ

کر لیتے۔ میں اپنے بچپن کا تصور باندھتا، کبھی کالج کی زندگی کو دہراتا
اسی طرح شکیلہ بھی میری ہم خیال ہو کر اپنے ضمیر کے ساتھ قلم
تصور سے اپنے ذہن میں ایک نادر بوقلموں خیالی مرقع کو
دکھا کر تازہ کر دیتی۔ لیکن جب ہم عہد حال پر نظر ڈالتے تو پھولے
نہ سماتے۔ غرضکہ ہماری زندگی خوشی سے معمور تھی اور ہم دونوں
شاداں و فرحاں تھے۔ زیادہ تر ہمارا وقت سیر تفریح میں
گزرتا۔ مگر فلک ناہنجار کو کب منظور تھا جیسا کہ ایک قول مشہور
ہے کہ زیادہ راحت مصیبت کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور ساتھ ہی
ساتھ زمانے نے بھی اپنی میٹھی نیند سے چونک کر کروٹ لی۔
بحر تلاطم کی ایک موج نے ہمارے جہاز زیست کو جو کہ
خوشی و مسرت انبساط سے معمور تھا۔ غرق کر دیا۔ شکیلہ کی
شمع زندگی ظالم جھونکوں سے مغلوب ہو کر ایک آخری ہچکولا
لے کر خاموش ہو گئی۔ اور اس کی موت مجھے تباہ و برباد
کر گئی۔ ایک روز میں اخبار دیکھ رہا تھا شکیلہ نے مجھ سے آ کر
کہا کہ چلو موسم کا لطف اٹھانے کشمیر چلیں۔ میں بہت جلد راضی
ہو گیا۔ چونکہ مجھے ہر طرح شکیلہ کی خوشی منظور تھی۔ دوسرے
روز ہم سفر میں تھے۔ منزل مقصود پر قدم استقلال سے بڑھتے ہی
چلے جاتے تھے۔ وہاں پہنچ کر سوائے پھرنے اور سیر کرنے کے کچھ
کام ہی نہ تھا۔ شکیلہ کو سیر و تفریح سے بہت شوق اور حد درجہ
دلچسپی تھی۔ شالا مار باغ میں آج کا دن بہت خوشگوار تھا
کبھی کبھی برق بے تاب ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتی
اور کبھی بادل گرج گرج کر دل دہلا دیتے۔ تھوڑی دیر میں
کچھ کچھ پھوار پڑنے لگی۔ شکیلہ نے اصرار کیا کہ باغ جانے کا
یہی وقت ہے۔ ہم دونوں نکلے اور باغ میں پہنچے اس وقت
وہاں پر نہ معلوم کیا دلکشی تھی کہ دل اس طرف کھنچا جاتا تھا
بلبل اپنا نغمہ الاپ رہی تھی۔ چڑیوں کے میٹھے گیت
دل موہ لیتے تھے۔ اور بھی بہت سے لوگ اس دلفریب منظر
سے مسرور ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد بادل ہٹنے لگے۔ پھوار بھی
کم ہو گئی۔ تماشائی بھی رفتہ رفتہ جانے لگے۔ میں نے
بھی کہا اب گھر چلنا چاہئے۔ لیکن شکیلہ نے انکار کر دیا میں
ناول لے کر نہر کے کنارے بیٹھ کر پڑھنے میں محو ہو گیا۔
سورج اپنے طویل سفر سے تھک کر گوشہ عافیت میں جانے
لگا۔ اب کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ یکایک میں چونکا اور گھڑی
پر نظر ڈالی۔ مجھے یہاں آئے کئی گھنٹے ہو گئے تھے میں اٹھا اور
شکیلہ کے پاس آیا دیکھا تو وہ قدرت کے بنائے ہوئے سبز مخملی
بستر پر غافل نیند سو رہی تھی۔ اس وقت وہ کتنی حسین معلوم
ہو رہی تھی اس پر عجب دلکشی تھی۔ میں کچھ دیر بغور دیکھتا رہا
جگایا۔ جگانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ تیسری بار
جب میں نے جگانے کی ناکام سعی کی تو میرے سامنے دنیا اندھیر
ہو گئی۔ دل و دماغ معطل ہو گیا۔ چونکہ شکیلہ کے بازو
پر مہلک زخم تھا جو سانپ کے کاٹنے کا معلوم ہوا بے جان
و بے حس و حرکت دنیا و مافیہا سے بے خبر ابدی نیند سو رہی تھی۔
میرے لہلہاتے باغ میں ہمیشہ کے لئے خزاں آ گئی
آہ۔ شکیلہ کی موت نے میری دنیا اجاڑ دی۔

افسوس

کسی تدبیر کو تقدیر نے چلنے نہ دیا
وقت نے ایک بھی ارمان نکلنے نہ دیا

خط و کتابت کا پتہ
مینیجر تنویر۔ تھرڈ سانکلی اسٹریٹ بمبئی ۸

ہمارا ادب کدھر جا رہا ہے؟

از: محترمہ بیگم شارق دہلوی

ایک بے بس اور غلام قوم کا ادب ویسے بھی زندگی کی تابندگی سے محروم ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے موجودہ ادب میں وہ تمام اسقام موجود ہیں جن سے اس کا مردہ بلکہ مُردار ہونا ثابت ہوتا ہے۔ زندگی کی جان بخش لہروں سے محروم ہوتا تو پھر بھی ایسا یاس انگیز نہ تھا لیکن ہمارے ادبی رسائل و مطبوعہ کُتب کا مثبت طور پر ضرر رساں ہونا یقیناً قابلِ افسوس ہے۔ نامناسب نہ ہوگا کہ میں صرف زنانہ اردو لٹریچر کی موجودہ رفتار پر ایک ناقدانہ نظر ڈالوں۔ اس طرح میں ادب کی وسیع دُنیا کے ایک حصّۂ محدود پر اچھی طرح محاسبہ کر سکوں گی۔ درحقیقت ہماری ساری ادبی کارگزاریاں اب تک گھٹے ہوئے جذبات اور مردہ احساسات کا آئینہ معلوم ہوتی ہیں ایک جسدِ بے رُوح ہونے کی حیثیت سے زنانہ اور مردانہ رسائل میں بظاہر کوئی خاص فرق موجود نہیں ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر کبھی کبھی اُمید کی ایک جھلک دل میں پیدا ہوتی ہے کہ اردو رسائل اور اخبارات میں بعض ترقی پسند مضامین بھی گاہے ماہے شائع ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھار کسی پریس سے کوئی حیات افروز کتاب بھی شائع ہو جاتی اور بھولے بسرے کوئی مواد نظر سے ایسا بھی گزر جاتا ہے جس سے قطعی نااُمید ہو جانے کا جذبہ تنزلزل ہو کر دب جاتا ہے لیکن بنہایت افسوس کے ساتھ میں یہ سطور لکھنے پر مجبور ہوں کہ زنانہ رسائل میں یہ چیز کبھی اتفاق سے بھی دکھائی نہیں دیتی۔

ہمارے زنانہ رسائل کا رزارِ حیات کی نہایت پُرآشوب تحریکوں سے مطلق بے خبر ہیں اور وہ ایسا مواد اُگل رہے ہیں جس میں قرونِ وسطیٰ کے عہدِ نوابی کی بُو آ رہی ہے۔ لاہور کے صرف ایک رسالے کو چھوڑ کر جس کی تہی دامنی اُسے رسالچہ کہلوانے پر اصرار کر رہی ہے درحقیقت سارے زنانہ رسالے اپنے اندر ایک زنانہ پن اور نسائیت کا گہرا جذبہ رکھتے ہیں اور وہ جو قدامت پسند غیر تعلیم یافتہ عورتوں ناک پر اُنگلی رکھ کر بات کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ بس وہی عادت یا ادا اس ساری زنانہ رسالہ بازی پر جاری و ساری ہے۔ وہ جو مضامین شائع کرتے ہیں، صرف گھر کی چار دیواری کے اندر قید رہنے والے ذی روح دوپایوں کے نقطۂ نظر سے شائع کرتے ہیں اور اُن ہی کی محدود [illegible] کا اُنہیں مقدم خیال ہوتا ہے۔ یہ رسالے یہ کبھی خیال بھی نہیں کرتے کہ ہم صحافتی انقلاب کے علمبردار ہیں اور ہمارے ذریعہ ہماری سوئی [illegible] معاشرت جاگ سکتی ہے اس لئے بجائے رہنمائی کرنے کے یہ پیٹ کے بندے اُن خریداروں کو خوش رکھنا ہی اپنا فرضِ عین سمجھتے ہیں جن کے چندوں سے اُن کا رشتۂ حیات قائم ہے۔ اگر میں مضامین کو علیحدہ علیحدہ لوں اور آپ سے بیان کروں کہ کس قسم کے افسانے ہمارے رسالوں میں شائع ہوتے ہیں یا کس قسم کی نظمیں یا اسلامی مضامین نکلتے ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے کہ درحقیقت ہمارا ادب آج سے چالیس سال پیچھے ہے۔

بس قسم کے مضامین کی ہمارے معاشرت کو اشد ضرورت ہے۔ اُن کی بجائے بے روح افسانے، بے لطف تُک بندیاں اور مبہم اور بے ربط ادب لطیف کے اجزا شائع کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ خریداران رسالہ اس چیز کے طالب ہیں یہ سارے رسالے جنہیں غلاظت اور تعفن کی پوٹ کہنا شاید درست ہوگا ایک خاص بنے ہوئے ڈگر پر چلے جا رہے ہیں اور خود ان کو بھی یہ نہیں معلوم کہ جا کدھر رہے ہیں۔ جس طرف خریداروں کی بدذوقی اُنہیں ناک پکڑے کھینچ کرلئے جا رہی ہے۔ وہ بے چارے کشاں کشاں گھسٹے چلے جا رہے ہیں۔

وقت یہ آپڑی ہے کہ جس قدر ادبی رسائل ہماری عورتوں یا لڑکیوں کے ہاتھوں میں پہنچتے ہیں۔ وہ سب کے سب کسی تجارتی ادارہ کی جان ہوتے ہیں اور اس ادارے کا فائدہ یا نقصان اس رسالہ ہی سے وابستہ ہوا کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آئے دن رسالے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور مرتے رہتے ہیں بلکہ غالبًا پیدا ہی مرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ابھی تک تعلیم یافتہ طبقہ نے بالخصوص نوجوانوں جن کے ہاتھوں میں ادبی رسائل کی باگ ڈور ہے، اُصول پرستی نہیں سیکھی ہے۔ وہ شخصیت پرستی کی بھول بھلیوں میں بھٹکے پھر رہے ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ بے اُصول ہوکر کوئی معقول بات کہی جاسکے۔

آپ کسی زنانہ رسالے کو اٹھا لیجئے۔ اس میں وہی دو چار بیلوں کے اور مینے کے کونے کے پھولوں کے نقشے اور ڈیا گرام ہوں گے، وہی چاکلیٹ یا حلوائے گزر بنانے کی ترکیب ہوگی۔ وہی بے معنی نظمیں ہوں گی اور وہی دو چار مذہبی مضامین ہوں گے جو آج سے پہلے منور کبھی نہ کبھی شائع ہو چکے ہوں گے۔

جس بد قسمت ادبی قحط سالی سے ہمارا ہندوستان جنت نشان گزر رہا ہے۔ اُس نے ہمیں جذباتی حیثیت سے دیوالیہ بنا کر چھوڑ دیا ہے

لیکن ایسے سخت وقت میں جبکہ ہماری ادبی تحریکیں سرے سے تحریکیں ہی کہلانے کی مستحق نہیں ہر ایڈیٹر۔ رئیس القلم اور ہر نامہ نگار علامہ دھر بننے پر مصر ہے۔ ہر زنانہ رسالہ کا ہر نمبر خاص نمبر ہوتا ہے۔ عام نمبر خاص خاص موقعوں پر نکالا جاتا ہے۔ ہر رسالہ میں مقویات و منہیات سے لے کر طلائے شاہی اور مار اللحم خاص الخاص تک کل اشتہارات شائع کئے جاتے ہیں اور ہٹلر سے لے کر مس مادھوری تک سب کی تصاویر زیب رسالہ کی جاتی ہیں۔ ہر زنانہ رسالہ اپنے خریداروں کی ایک بے رونق محفل مرتب کرتا ہے اور آسائش محفل میں سیاہ و سفید کا فرق نہیں کیا جاتا گویا یہ محفل نہیں ۔۔۔۔ خواجہ عمر عیار کی زنبیل ہے۔ جس میں ہر شے موجود ہے۔ بجز ذوق سلیم کے۔

ایسے ادبی رسالے اور اس سے ملتی جلتی ہی وہ ادبی کاوشیں جو کتابی صورت میں ہر سال منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوتی ہیں۔ در حقیقت پنساری کی دکانوں پر پڑیاں باندھنے کے کام آنی چاہیں۔

اے کاش ہمارے لٹریری آرگن معاوضے دے کر بہترین تراجم کرانے کا انتظام کریں۔ نہایت معقول اور بصیرت افروز مضامین کے سلسلے شروع کریں۔ قلوب کو گرمانے والے اشعار شائع کریں اور ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک ایک ادبی زلزلہ برپا کردیں۔ تاکہ جو لوگ سوئے ہوئے ہیں شاید وہ جاگ جائیں۔ موجودہ بے حسی اور کس مپرسی ہماری ادبی کوزوقی کی چغلی کھا رہی ہے۔

تغیر

از آنسہ رضیہ دلشاد بیگم صاحبہ

پی پی کی بولی نہ بول

پاپی پپیا!

پی پی کی بولی نہ بول

جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔ اُملا اپنی سہیلیوں سمیت شہر سے دور نخچیر ویران میں جھولے کی پینگوں پر کھل کھل کر گیت گا رہی تھی جھیل کا کنارہ، برسات کا سماں، ہرے ہرے درخت، اونچا جھولا اور اُملا اور اس کی سہیلیوں کی سرخ اور سبز ساریاں دو سماں پیدا کر رہی تھیں۔ جو ہندوستان کے رومان کی جان ہے اور جو مغرب کی "تہذیب" کے بدولت تیزی سے مٹ رہا ہے۔ کھڑ کھڑ کی آواز نے ان لڑکیوں کو عالم محویت سے چونکایا۔ درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے ایک بیل گاڑی جا رہی تھی۔ جو چلنے سے زیادہ ہل رہی تھی بیل گاڑی میں کوئی بات جاذبِ نظر نہ تھی۔ البتہ اس کے مسافر ضرور اس قابل تھے کہ نگاہ ایک دفعہ کی بجائے کئی دفعہ اُدھر جانا چاہتی تھی گاڑی والے سمیت پانچ آدمی تھے۔ جن میں سے چار گاندھی کیپ پہنے تھے۔ کھدر کے کرتے اور پاجامے اور دھوتیاں پہنے، چمڑے کی چپلیں۔ ایک شخص خاص طور پر قابلِ ذکر تھا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک بڑا سا ہینڈ بیگ تھا۔ جس کو وہ مضبوطی سے پکڑے ہوئے بیل گاڑی کے ہچکولوں سے بچانا چاہتا تھا۔ قیاس کہتا تھا۔ کہ اس میں نازک چیزیں ہوں گی۔ صورت سے ذہانت اور شرافت برستی تھی لڑکیوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں "یہ کون ہیں" "کہاں جا رہے ہیں" "پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں"

اُملا بولی بھئی ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ڈاکٹر ہے ڈاکٹر، کم از کم اس کے بیگ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کملا کہنے لگی ڈاکٹر تو ہے ہی اس نے ہمارے رسوئیے کے لڑکے کا علاج کیا تھا۔ میرے پتا جی اسے جانتے ہیں مگر اسے اچھوت سیوا کا شوق ہے۔ گاؤں گاؤں پھرتا ہے اور غریب لوگوں کا علاج کرتا ہے اس وقت بھی کہیں جا رہا ہوگا۔ ہے بڑا ہمدرد اور اچھا آدمی ہمارے رسوئیے سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔ اور اس کے لڑکے کو اچھا کر دیا۔ پتا جی نے کہا آپ کی فیس کیا ہے تو کہنے لگا کہ غریبوں کی آشیرباد"

لکشمی نے کہا اوہ! یہ تو بڑے کمال کی بات ہے؟ ایسے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں۔ رادھا جس کے باپ اور ایک بہنوئی آئی سی ایس تھے کہنے لگی ہاں بھئی ایسے پاگل تو کم ہی ملتے ہیں۔ بھلا کیا سود ہے کہ ولایت کی ڈگریاں رکھتے ہوئے گاؤں گاؤں مارے پھر رہے ہیں اُملا جواب تک چپ تھی کہنے لگی بھئی جو دیس کی سیوا کرتا ہے اسے روپیہ کی کیا پروا! وہ ایسا کام کرتا ہے جو روپیہ کمانے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ سب سہیلیوں نے مسکرا کر اُملا کی طرف دیکھا "جانے بھی دو" لکشمی کہنے لگی، جھولا جھولو، اور لگیں زوروں سے پینگ بڑھانے۔ ابھی بیل گاڑی بہت دور نہ گئی ہوگی کہ جھولے نے دغا دی۔ اور چشم زدن میں اُملا زمین پر بے ہوش پڑی تھی۔ لڑکیوں کی چیخیں بلند ہوئیں۔ اور ساتھ ہی بیل گاڑی کے چرخ چوں کی آواز بھی بند ہو گئی۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر ستیش اور ان کے ساتھی بیہوش اُملا کے پاس موجود تھے۔ جھیل میں سے پانی لایا گیا اور بیگ

کھول کر زخمی سر کو پٹیوں سے باندھ دیا گیا۔ خیریت یہی تھی کہ اندرونی
چوٹ نہ آئی تھی۔ البتہ سر پر زخم لگنے سے حواس جاتے رہے
تھے۔ ڈاکٹر ستیش پٹیاں باندھنے میں مصروف تھے۔ مگر اُن کی
آنکھیں اس بات کا جائزہ لئے بغیر نہ رہ سکتی تھیں کہ جس سر کو وہ پٹیوں
میں لپیٹ رہے تھے وہ کتنا خوبصورت اور کیسے سیاہ بالوں سے
ڈھکا ہوا تھا۔ جو آنکھیں بند تھیں وہ کتنی بڑی بڑی اور کیسی سیاہ
پلکوں والی تھیں۔ جو چہرہ تکلیف سے زرد تھا وہ کتنا پیارا اور بھولا
تھا۔ اور جس جسم کو اُنھوں نے گود میں اٹھا کر بیل گاڑی میں لٹایا!
وہ کتنا ہلکا اور نازک تھا۔ سب لڑکیاں بیل گاڑی میں بیٹھ گئیں
کیونکہ ڈاکٹر کی رائے ہوئی کہ گاؤں میں جا کر کسی آنے جانے والی بس
کی ذریعہ سے اُملا کو گھر پہنچایا جائے۔ گاؤں میں پہنچتے پہنچتے شام
سی ہو گئی۔ غریب کسانوں کے پاس سہریاں اور تکئے تو نہ تھے
البتہ نیچے پیال بچھا کر اوپر دو چار کھیس بچھا دی گئیں اور اُملا کو گاڑی سے
اُتار کر اس پر لٹایا گیا۔ تھوڑی دیر میں اُملا کو ہوش آ گیا "میں کہاں
ہوں" کہہ کر وہ اُٹھنے لگی۔ مگر ستیش نے اُسے پھر لٹا دیا۔ "اُٹھو نہیں
تم جھولے پر سے گر گئیں تھیں۔ میں ڈاکٹر ستیش تمھارے پاس ہوں گھبراؤ
نہیں۔ ہم گاؤں میں ہیں۔ ابھی تم کو گھر پہنچا دیں گے۔ سونے کی کوشش
کرو۔" اُملا نے کئی بار آنکھ کھول کھول کر دیکھا اس کی سہیلیاں
اور ڈاکٹر ستیش کے ساتھی سو چکے تھے مگر ڈاکٹر ستیش برابر اس کے
پاس بیٹھے تھے۔ اُس نے کئی بار اُن کی طرف دیکھا پھر نقاہت
سے آنکھیں بند کر لیں۔ صبح نو دس بجے اُملا بس کے ذریعہ سے گھر
پہنچا دی گئی ———

(۲)

چلا ہوں اے دلِ راحت طلب کیا شاد ماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

ڈاکٹر ستیش اور اُملا کی اتفاقیہ ملاقات بہت سی ملاقاتوں کا
پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر ستیش کو دیہات سدھار اور اچھوت سیوا
کا شوق تھا اور وہ رامپور ہفتہ میں ایک مرتبہ ضرور جایا کرتے تھے
جہاں اُنھوں نے ایک چھوٹا سا دواخانہ کھول رکھا تھا اور اکثر اپنی
چھوٹی سی موٹر میں رامپور کے علاوہ اور بھی اطراف کے گاؤں
میں چلے جایا کرتے تھے جہاں کہیں معمولی بیماریاں دیکھتے خود علاج
کر دیتے سخت بیماروں کو شہر بھیج دیتے۔ ایثار و قربانی ایسی چیز
ہے کہ ہر انسان اس سے مرعوب ہو جاتا ہے اور اُملا بھی عام
انسانی جذبات سے خالی نہ تھی کہ اُس پر اثر نہ ہوتا! وہ اکثر اُن کے
ساتھ گاؤں میں جاتی اور مریضوں کو سنبھالتی جو کمی ڈاکٹر ستیش
میں تھی وہ اُملا نے پوری کی یعنی وہ اکثر دیہاتیوں کو جمع کر کے
صفائی وغیرہ کے متعلق سمجھایا کرتی۔ اُس کی شیریں بیانی سے
لوگ بہت جلدی اس کی باتوں کی طرف مائل ہو جاتے یہاں تک
کہ اُملا کو بغیر گاؤں گئے ایک دن بھی چین نہ آتا جب تشدد نے ہندوستان
کے اکثر ناز پروردوں کو قید میں محبوس کیا۔ وہ رفتہ رفتہ اس
پر بھی اثر کر رہا تھا۔ رائے [illegible] پیارے لال کو یہ بات ناگوار
گزرتی۔ جو اُملا کی بچی اکلوتی اور ناز پروردہ اُملا اور
یوں گاؤں گاؤں مارے پھرے۔ اگر وہ اُس کو ڈاکٹر ستیش کے
ساتھ جانے کی اجازت دیتے تھے تو محض اس خیال سے کہ اُن
کی اکلوتی بچی کا دل نہ ٹوٹے اور اس وجہ سے بھی کہ ان کو ستیش
کی شرافت پر پورا بھروسہ تھا ورنہ اُن کے نزدیک یہ بھی جنون
کی ایک قسم تھی۔ حالانکہ گو ستیش ایک مشہور آدمی کا لڑکا ولایت
ڈگری یافتہ اور [illegible] خیال آتا تھا
کہ ستیش کا دماغ تو کچھ خراب نہیں ہے مگر جس وقت وہ علمی
یا سیاسی بحث کرنے لگتا تھا تو [illegible] اس کی قطعی تردید ہو جاتی تھی

سال بھر بعد پھر برسات ہی کا زمانہ تھا کہ ستیش نے رائے بہادر صاحب سے اُملا کے ساتھ شادی کے لئے خواستگاری کی۔ وہ پہلے ہی سے یہ جانتے تھے کہ ایک نہ ایک دن یہ ہوگا اور جواب بھی سوچے ہوئے تھے۔ وہ اپنی عزیزہ اُملا کے ساتھی بننے کے قابل ستیش کو سمجھتے تھے مگر شوہر بننے کے قابل ہرگز نہیں۔ ستیش کی بابت یہی نہیں کہ کسی شخص کے لئے اُن کے نزدیک اچھا تھا ایثار اور قربانی کی جو خاموش تعلیم اُس کے رویہ سے ملتی تھی اُس کی قدر ان کے دل میں ضرور تھی مگر ایسے شخص کو شریک زندگی بنانا اُن کے خیال میں خطرہ سے خالی نہ تھا۔ وہ گورنمنٹ کے خطاب یافتہ تمام کی نظروں میں معزز اور سرکار کے وفادار، کانپور کے سب سے بڑے رئیس سیٹھوں میں سے تھے کہاں اُن کی اکلوتی گریجویٹ لڑکی اور کہاں ایک کانگریسی اکھڑ! نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ انھوں نے ستیش کو لکھا کہ میں اُملا کو اُسی حالت میں تمھیں دے سکتا ہوں۔ جب تم یہ کانگریسی خبط چھوڑ کر اپنا زیادہ وقت اور بیشتر توجہ اپنی پریکٹس کی طرف لگاؤ اور اتنا کافی پیدا کرو کہ اُملا اُسی آرام سے تمھارے یہاں رہ سکے جس آرام سے میرے یہاں رہے اور رہے گی اگر کسی برابر والے سے بیاہی جائے۔ ستیش نے دو تین مرتبہ لکھا کہ اُملا سے خود دریافت کیا جائے کہ وہ روحانی آرام چاہتی ہے یا جسمانی۔ مگر رائے بہادر صاحب نے ایک نہ سنی۔ اُن کے نزدیک روح کوئی چیز نہ تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ روح کا نشہ جب تک ہی رہتا ہے جب تک آرام سے ملتا جائے اور جب سچ مچ روپیہ نہیں ہوتا تو روح بھی پریشان ہونے لگتی ہے۔ اُملا اِن تمام حالات سے بے خبر تھی۔ خاموش طبیعت ستیش نے کبھی اُس سے ذکر بھی نہ کیا کہ میں نے یوں درخواست کی تھی اور یہ جواب آیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اگر کبھی ایسا ہوگا تو ستیش مجھ سے ضرور کہے گا۔ اُس کی سمجھ میں یہ معمہ نہیں آتا تھا کہ ستیش پہلے زیادہ خاموش کیوں رہتا ہے اور اس کی کوٹھی پر اس قدر کم کیوں آتا ہے۔ ستیش کی جو کچھ حالت تھی وہ تو قلم لکھ نہیں سکتا وہ رہ رہ کر سوچتا تھا کہ روپیہ ایسی ناپائدار چیز کے لئے لوگ کس قدر خواہش مند ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ روپے سے انسان کی زیادہ تر ضرورتیں پوری ہوتی ہیں لیکن اگر انسان کی جائز ضرورتیں پوری ہو جائیں اور وہ خوش رہے تو اس میں کیا حرج ہے اس کی پریکٹس معمولی طور پر آرام سے رہنے کے لئے کافی تھی مگر رائے بہادر صاحب کا مطالبہ بہت زیادہ تھا وہ ملکی خدمت اور اپنے سیاسی اصولوں کو کسی کے لئے بھی نہ چھوڑ سکتا تھا۔ یاس اور نا اُمیدی کے اِس زبردست طوفان کے آگے اس کے اصول کی کشتی باربار ہچکولے کھاتی تھی مگر آگے بڑھی جاتی تھی۔ دل کو سکون دینے کے لئے وہ اور بھی زیادہ ملکی کاموں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دُکھے ہوئے دل کو دوسروں کا دُکھ دور کر کے اپنی تکلیف میں ایک گونہ افاقہ معلوم ہوتا ہے۔

(۳)

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ کبھی
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

اُملا اِن تمام حالات سے بے خبر لکھنؤ بھیج دی گئی جہاں اُس نے میڈیکل کالج میں داخلہ کروالیا۔ چلتے وقت ستیش سے ملنے گئی تھی مگر ستیش گھر پر موجود نہ تھا۔ کسی گاؤں میں گیا ہوا تھا اس نے اپنا جانا دو ایک دن ملتوی کرنا چاہا مگر رائے بہادر صاحب کا مشورہ ہوا کہ اتنی سی بات کے لئے حاضری کم نہ کروائی جائے لہٰذا وہ رات ہی کی گاڑی سے بیٹھ گئی۔ وہ خود یہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد ڈاکٹری پاس کر کے ستیش کے ساتھ دیہات سدھار میں لگ جائے۔ لکھنؤ پہنچ کر اُس نے ستیش کو کئی خط لکھے

وہ حیران تھی کہ ستیش اس کے خطوں کا جواب دیتا تو ضرور تھا مگر کچھ بے دلی اور علیحدگی سی ظاہر ہوتی تھی جو کسی زیرک شخص کی نگاہ سے چھپ نہیں سکتی۔ اُملا کا ہر خط معصومانہ، بلند ارادوں سے بھرا رہتا تھا۔ ستیش زیادہ تر دیہات کا حال وغیرہ جو وہ دریافت کرتی، لکھ دیتا۔ جس جس گاؤں میں جس کی خیریت یا حالات دریافت کرتی۔ وہ لکھ دیتا اور بس بیّن ظاہر ہوتا تھا کہ جبراً اپنے آپ کو علیحدہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُملا کو لکھنؤ آئے چار ماہ ہوئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ اُملا کالج سے واپس آئی تھی کتابیں وغیرہ رکھ کر چائے پینے کا ارادہ کر رہی تھی کہ تار والا پہنچا۔ اُملا بیسویں صدی کی پیدائش تھی اُن لوگوں میں نہ تھی جو تار کا نام سُن کر گھبرا جاتے ہیں اُس نے نہایت اطمینان سے دستخط کئے اور تار کھولا۔ مگر تار کا مضمون کیا تھا۔ جس نے پاؤں تلے کی زمین نکال دی۔ لکھا تھا "سیٹھ جی کی طبیعت بہت خراب ہے فوراً آیئے" "ستیش"۔ اُملا تار لئے ہوئے میٹرن کے پاس پہنچی اور تیاری کر کے فوراً رات کی گاڑی سے بیٹھ گئی۔ اُس کا دماغ پریشان تھا۔ حواس و ہوش بجا نہ تھے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے کبھی سوچتی تھی کہ کسی نے مذاق کیا مگر ستیش سے تو ایسے مذاق کی کبھی اُمید نہ تھی۔ سیٹھ جی کے خطوط تو بے شک آئے تھے کہ بخار اور کھانسی ہے مگر اس قدر خرابی کی تو اُمید نہ تھی لکھا تھا کہ حکیم صاحب نے نزلہ بتایا ہے۔ جاتا رہے گا۔ کبھی سوچتی کہ ستیش نے اتنے دنوں ایسی بے رُخی کی اور اب پتاجی کے پاس ہے یہ آخر کیا معمہ ہے؟ اسی اُدھیڑ بُن میں سفر پورا ہو گیا۔ اسٹیشن پر کوئی نوکر سیٹھ جی کا نہ تھا۔ ستیش کا بڈھا نوکر رام دیال موجود تھا۔ کہنے لگا ستیش بابو ہم کا بھیجن ہیں۔ ہم تمکا گھر پہنچا دیب" اُملا حیران تھی۔ کہنے لگی "اور بابو جی کہاں ہیں" جواب ملا" اُو تو گاؤں گئے ہیں۔ ہمکا کہہ گئے ہیں کہ تمکا گھر پہنچا دیئیں" اُملا کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ تھی اسٹیشن پر کسی سواری کا موجود نہ ہونا، کسی نوکر کا نہ آنا، ستیش کا اس بے رُخی سے اُس کو چھوڑ کر گاؤں میں چلے جانا۔ یہ سب ایک معمہ تھا جو کسی طرح اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا بمشکل اُس نے ایک سواری کی اور گھر پہنچی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی رہے سہے حواس جاتے رہے۔ برآمدہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر گرانٹ بیٹھے تھے اور ایک سب انسپکٹر۔ اُملا گھبرائی تو بہت مگر نئی پود کی ہمت کی داد دینی چاہیئے۔ بہت اخلاق سے مسٹر گرانٹ سے ملی۔ مسٹر گرانٹ اس کے والد کے گہرے دوست تھے۔ بہت اخلاق سے پیش آئے اور الگ لے جا کر تمام ماجرا سمجھایا۔ کس طرح سیٹھ جی نے روئی کا سٹہ کھیلا۔ کس طرح اُن کا اندازہ غلط نکلا۔ اور اُن کو سترہ لاکھ روپے کا نقصان ہوا اور اب وہ ایک دیوالیہ کی حیثیت سے ہیں۔ خیر خواہ لوگوں نے بہت چاہا کہ سیٹھ جی کو اطلاع نہ ملے مگر بھلا بات کس طرح چھپ سکتی تھی۔ اُن کی طبیعت بہت خراب تھی اُس پر سے جو یہ خبر ملی۔ تو سخت صدمہ پہنچ کر بے ہوشی طاری ہو گئی اب ہم لوگ اس انتظار میں ہیں کہ ذرا ہوش و حواس بجا ہوں تو اُن کو کہیں اور پہنچایا جائے کیونکہ بنگلہ بھی اب اُن کو نہیں مل سکے گا۔ یہ سب سُن کر اُملا اندر گئی۔ باپ کو بستر پر پڑا دیکھ کر ڈاکٹر سے جو ہاتھ میں گھڑی لئے نبض دیکھ رہا تھا۔ اِس رُوح فرسا منظر کو دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکی۔ جذبات کا چشمہ اُبل پڑا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہچکیوں کے درمیان اُس نے اپنا نام سُنا اور چشم زدن میں ستیش اُس کے قریب تھا "شانتی اُملا! شانتی!" وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا: "بھگوان پر بھروسہ رکھو! وہ جو کچھ کرتا ہے ہماری بھلائی کے لئے۔ رونا بند کرو اور سوچو

شدت سے میری طرف رجوع ہیں تو اس کے بیعت کے سلسلہ کو
وسیع سے وسیع تر کرکے عالمِ نسواں کو بھی اپنے حلقۂ عقیدت میں
لینے لگا۔ اب صوفی کی دولت میں اضافہ ہونے لگا۔ لیکن اس نے فیاضی
سے کام لیا، اور آمدنی کا ہر پیسہ غریبوں، اور محتاجوں، نیز اپنے
عقیدتمندوں پر صرف کرنے لگا۔ انواع واقسام کے کھانوں کا
لنگر جاری کردیا۔ لوگ سمجھے کہ صوفی کو دستِ غیب حاصل ہے چنانچہ
اب اس کی پرستش ہونے لگی۔

شام کا وقت تھا، سورج کے پران بازو مضمحل ہو چکے
تھے، آسمان کا روشن دل اپنی تنویر سے عالم کو منور کرنے والا تھا
زمین کی نبض مدھم چلنے لگی تھی، اور درخت خاموش کھڑے تھے۔
فضا میں سناٹا تھا۔ اور سمندر کی سطح ساکن تھی۔ غرضکہ دنیا کی ہر
چیز شام مایوسی سے لبریز تھی۔ خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صوفی
محو یادِ الٰہی تھا۔ اس کی گردن قلب کی طرف جھکی ہوئی تھی، اس وقت
اسے محسوس ہو رہا تھا کہ فطرت اس سے باتیں کر رہی ہے اس حال
میں کبھی کبھی اس کی گردن میں حرکت خفی ہو رہی تھی اور پیشانی پر بل پڑ
رہے تھے۔ جب یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کے تصور میں کوئی چیز حائل
ہے۔ دفعتہً تصور کی موج فضا میں لوہیت کی ایک روشنی نظر آتی
ہے، اور اس موج نور میں کسی کی سکر پاش نگاہیں تیرتی ہوئی
محسوس ہونے لگتی ہیں۔ صوفی نے جھنجھلا کر گردن اٹھائی اور مصلے
سے کھڑا ہو کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ دیکھا کہ سامنے متبسم نگاہیں
صاعقہ بر انداز ہیں۔ ایک ۱۸ سالہ دوشیزہ مع ایک ضعیفہ کے عقیدتمندانہ
انداز کے ساتھ مودبانہ کھڑی ہے، اور ہدیہ عقیدت پیش کر رہی
ہے۔ صوفی نے دونوں کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اور پوچھا کہ تم
کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟

ضعیفہ۔ حضور یہ بچی اور خادمہ مرید ہونا چاہتی ہے۔ ہم
شہر سے آئے ہیں۔

صوفی (ضعیفہ کی طرف اشارہ کر کے) یہ بچی تمہاری ہی ہے؟

ضعیفہ۔ جی ہاں حضور، اب تو میری ہی ہے۔ اس کے والدین
کا انتقال ہو چکا، اور اب اس کی تعلیم وپرورش کی میں ہی ذمہ دار ہوں

صوفی (لڑکی سے) کیوں بیٹی تم کیا پڑھتی ہو؟ اور تمہارا کیا
نام ہے؟

لڑکی نے شرماتے ہوئے کہا میرا نام "ناز" ہے۔

ناز ـــ ناز! کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟ صوفی نے
دل میں کہا۔ اور گردن جھکالی۔ اور بچپن کا وہ زمانہ یاد آگیا جب
یہ دونوں ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اور گھنٹوں تنہائی میں باتیں
کیا کرتے تھے۔

صوفی۔ (ضعیفہ کی طرف اشارہ کر کے) یہ تمہاری کون ہیں؟
دس سال پہلے میں نے تو تمہارے گھر میں اس کو کبھی نہیں دیکھا اس
پر نیم خجالت وخفت کے ساتھ نازؔ خاموش ہو گئی اور ایک سرد آہ
کے ساتھ اپنی یتیمی ومفلسی کی داستان شروع کردی اور کہنے لگی
کہ میرے والدین کے انتقال کے بعد جب میرا کوئی نہیں رہا اور
دنیا میری نگاہوں میں اندھیر ہو گئی تو مجبوراً فاقہ کشی تک نوبت
پہنچی۔ کسی عزیز وقرابت دار نے میرے سر پر ہاتھ نہ رکھا حتیٰ کہ
بھیک کے ٹکڑوں پر گزر کرنے لگی۔ جب میں ہوشیار ہوئی
تو لوگوں کی نگاہوں میں خواہش پیدا ہو گئی۔ میں نے خوف
کی وجہ سے بھیک مانگنا چھوڑ دیا۔ جب کئی وقت کا فاقہ ہوا
اور میں بھوک کی شدت سے تڑپنے لگی تو (ضعیفہ کی طرف
اشارہ کر کے) یہ رحم دل ماں بن کے آ گئیں، اور تسلی دے کر میری خبرگیری
کرنے لگیں۔ مجھے اپنے مکان پر لے گئیں۔

صوفی ۔ تو اب تمہارا کیا شغل ہے؟

اس کا بقایہ مضمون صفحہ ۴۹ پر دیکھو

ہندوستان کے فرزندانِ ناہموار کی ماں

شاعرِ حریت حضرت رشد تھانوی مدظلہ العالی

جن کے زہریلی فضا میں تلخ کامی کیلئے
اپنے بچے پالتی ہے تو غلامی کے لئے

راندۂ درگاہ ہونے والے لوگوں کے عوض
کرتی ہے پیدا انھیں قائم مقامی کے لئے

"خانہ زادِ شاہ" کہہ کہہ کر بصد فخر و غرور
دے رہی ہے تربیت قیدِ دوامی کے لئے

ان میں پیدا تو نے کی ہے وہ پرستاری کی حس
باعثِ ذلت ہو جو ایک ایک عامی کے لئے

کر چکے ہیں فطرتِ آزاد کو اپنی تباہ
بن کے بندے، خواجگی کی نیکنامی کے لئے

پیروی میں مقتدر رجعت پسند اشخاص کی
مستعد ہیں پوری پوری تیز گامی کے لئے

سر بکف رہتے ہیں اذعان نمکخواری کے ساتھ
تیغِ استبداد کی بے نیامی کے لئے

جذبۂ حریت ان میں ہے نہ عزمِ انقلاب
جو ضروری ہے ہر انساں [illegible] کے لئے

ایسے فرزندوں کی ماں [illegible]

(عطیہ حسن)

[illegible] کی ناہموار [illegible] ہے تمام

نامہ

از جناب سجاد حیدر آفریدی ملیح آبادی

پیاری شیلا خوش رہو!

محبت نامہ ملا۔ شکریہ، آج ایک عرصہ کے بعد تم نے خط لکھا ہے۔ مگر نہ معلوم کیوں ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے تم ہمیشہ اور روز خط لکھتی رہی ہو، تم نے لکھا ہے "اب میری یاد میں آنسو بہانے سے فائدہ؟" یہ تو ٹھیک ہے مگر کیا تم قدرت سے لڑنا چاہتی ہو۔ اور کیا تم آدمی کی فطرت کو بدلنا چاہتی ہو۔ میرے لئے یہ اسی طرح ناممکن ہے جس طرح تمھارے لئے مجھے بھلا دینا۔ میں مجبور ہوں، اور شاید رہوں، کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ۔ اس کے لئے میں معافی مانگتا ہوں۔ مجھے امید ہے تم معاف کردوگی۔ اس لئے کہ اب تک تم میری ہر خطا کو معاف کرتی رہی ہو۔ کیا ہوا اگر کچھ دنوں سے تم میری نہیں ہو اور نہ ہوسکتی ہو۔ لیکن پھر بھی میں جانتا ہوں تم اتنی سنگدل نہیں ہو کہ مجھے معاف نہ کرو۔ تم یقیناً معاف کردوگی کیوں معاف کردوگی نا؟..........

آہ! شیلا میں آنسو بہانے پر مجبور ہوں، تم نہیں جانتیں مجھ کو اس پر مجبور نہ کرو، یہ تمھارا ظلم ہوگا اگر تم رونے بھی نہ دو۔ میں رو کر ہی دل کی بھڑاس نکال لیتا ہوں اور یہی میری زندگی ہے۔

مجھے تم اب بھی میری ہی معلوم ہوتی ہو۔ حالانکہ نہیں ہو۔ میں گھنٹوں اپنے کو اس خیال سے تسلی دیتا ہوں کہ تم میری ہو اور ابھی آتی ہی ہوگی۔ ہمیشہ کی طرح۔ مگر فوراً کسی خیال سے چونک پڑتا ہوں میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اب تم میری کہاں۔ تم کسی اور کی ہو..... شیلا کہیں یہ خیال نہ کرلینا کہ میں تمہیں تکلیف دینے کو یہ سب باتیں لکھ رہا ہوں۔

آہ! شیلا۔ اس خیال سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور میں بھی تمھارا شریک غم ہو جاتا ہوں۔ روتا ہوں خوب جتنا رو سکتا ہوں۔ چاہتا ہوں آنکھوں سے آنسو بنکر بہہ جاؤں..... فنا ہو جاؤں۔ مگر ہمیشہ اس کوشش میں ناکام رہا۔ جیسے پہلے بھی رہا ہوں۔

میں تم سے جدا ہوتے ہی جان گیا تھا اور مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اب میں تم کو حاصل نہیں کرسکتا، تم کو اپنا نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ آنے والے خوفناک اور مایوس واقعات میری نظر کے سامنے تھے جس کو شاید تم بھی محسوس کرتی تھیں۔ مگر نہ جانے کیوں ہماری زبانوں پر مہر سکوت لگی تھی۔ شاید قدرت کی طرف سے انتظام تھا۔ جو ہوکے رہتا، اور ہوا۔

نہ جانے مجھے یہ لکھتے ہوئے کیوں تکلیف ہوتی ہے کہ اب تم کسی اور کی ملکیت ہو کسی اور کی بیوی ہو۔ شیلا میں کیسے یقین کروں کہ تم کسی اور کی ہو۔ یا کسی اور کی ہوسکتی ہو۔ تم۔ کو۔ تو۔ میرا۔ ہونا۔ چاہئے۔ تھا..... تم میرے لئے پیدا کی گئیں تھیں۔ آہ! تم کو مجھ سے چھین لیا گیا۔ اور یہ ناانصافی ہوئی۔

تمھاری دی ہوئی انگوٹھی ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے جس کو دیکھ کر گزرے ہوئے رنگین دن بہت یاد آتے ہیں۔ وہ دن

جس کے سائے میں ہم دونوں جوان ہوئے۔ کاش وہ دن پھر آجائیں۔ زیادہ نہیں۔ صرف چند راتیں اور چند دن! بس۔ لیکن کہاں .... یہ سب خیالات ہیں۔ ایسا کیوں ہونے لگا۔

آہ! شیلا۔ شاید تم کو وہ شام یاد ہو۔ جب میں نے حالات کی بنا پر پیشین گوئی کی تھی کہ ہم لوگ بہت جلد جدا ہونے والے ہیں۔ تو تم رونے لگیں تھیں اور مجھے شرمندہ ہونا پڑا تھا۔ لیکن شیلا میری بات ٹھیک نکلی۔ اور تھوڑے عرصے کے بعد تم مجھ سے چھین لی گئیں۔ تمہاری شادی ہو گئی۔ ہو گئی نا؟ — بتاؤ شیلا میرا خیال کتنا ٹھیک نکلا۔ نہیں معلوم میری آنکھوں میں آنسو کیوں آ رہے ہیں۔ شاید تمہاری آنکھوں میں بھی ہوں۔ لیکن وہ نکل کر رو بھی نہیں سکتیں۔

تم سے جدا ہوئے بہت زیادہ دن نہیں ہوئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے صدیاں بیت گئیں۔ شیلا وہ رات یاد ہے جب ہم نے اور تم نے جاگ کر گزاری تھی۔ جس کی یاد میرے دل میں تو ہمیشہ رہے گی اور شاید تم بھی کوشش کرنے پر بھول نہ سکو۔ کیسی رات تھی، ابر چھایا ہوا تھا۔ بوندیاں پڑ رہی تھیں۔ تمہارے مکان کے پیچھے والے باغ میں کوئل بول رہی تھی۔ وہ تمہاری مسلسل باتیں، ہائے اب تو تمہاری باتیں بھی ختم ہو گئیں اور وہ موسم بھی نہ رہا اور نہ اب ویسی راتیں ہی آتی ہیں۔ اور اگر آتی بھی ہیں تو..... تم کہاں...... میرے لئے اب ایسی راتیں ایک بلا سے کم نہیں جو ہر وقت میری جان کے درپے رہتی ہیں۔

میں بیمار [illegible] تم کو کیسے معلوم ہوا۔ اچھا شاید شکنتلا نے کہا ہو۔ وہ [illegible] تھی۔ [illegible] بیٹھی رہتی شیلا وہ تم سے چھوٹی ہے۔ مگر [illegible] بہت [illegible] تھی۔ پتا جی بہت [illegible] کر کے پچھتا رہے ہیں۔ میں نے اسکی شادی کا ذکر چھیڑا تو شرما گئی۔ بالکل تمہاری طرح۔ اور [illegible] شکنتلا کو دیکھ کر میری آنکھوں میں تمہاری تصویر پھر جاتی ہے۔ دل کے کہنہ زخم تازہ ہو جاتے ہیں لیکن ایک عجیب لذت کے ساتھ، شکنتلا بالکل تمہاری طرح ہنستی بالکل تمہاری طرح بولتی اور بالکل تمہاری طرح چلتی اور شرماتی ہے مگر تمہاری طرح محبت سے لبریز دل نہیں رکھتی۔ اور یہی ایک کمی ہے، اس کو دیکھ کر میرے دل کو بڑی تسکین ہوتی ہے۔ جب تک وہ بیٹھی رہتی ہے مجھے بہت آرام ملتا ہے۔ لیکن آہ یہ کب تک، اس کے جاتے ہی میرے دل کی کیفیت اور زیادہ خراب اور قابل رحم ہو جاتی ہے۔ جیسے ڈوبتے ہوئے کو سہارا دے کر پھر ڈبو دیا جائے۔

ہاں..... خوب یاد آیا..... تم نے مجھے گریہ زاری سے روکنے کی کوشش کی۔ اور ایک حد تک کامیاب بھی [illegible]۔ مگر افسوس ہے۔ تم خود روتی ہو۔ تم کہو گی یہ تم کو کیسے معلوم ہوا۔ تو سنو۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اگر مجھی کو نہ معلوم ہو تو پھر کسے معلوم ہوگا تمہارے خط میں روشنائی پھیلی ہوئی تھی اور آنسوؤں کے نشان بھی تھے۔ شاید تم کہدو۔ پانی گر گیا تھا۔ مگر کیا شکنتلا بھی جھوٹ کہتی تھی۔ دیکھو شیلا۔ مجھ سے چھپانا بیکار ہے۔ تم نے آج تک مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ یہ آج تم ایک نئی بات کیسے کر رہی ہو شیلا؟ کیوں نہیں کہتیں رو دی تھی۔ شکنتلا بھی کہتی تھی ایک رات میں بہن جی کے وہاں رہی۔ میں نے دیکھا وہ بہت رات تک نہیں سوئی۔ صبح ان کے کمرے میں گئی تو دیکھا وہ رو رہی تھیں شیلا تم شکنتلا سے تو درد سر کا بہانہ کر سکتی ہو مگر میں شکنتلا نہیں تیرے شیلا جس طرح جی چاہے، اپنے کو برباد نہ کرے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔

جب کبھی میں اس خیال سے کہ قدرت ہم کو ایک جگہ دیکھنا گوارا نہیں کرتی اور نہ کرے گی۔ رونے لگتا تھا تو تم کہتی تھیں۔ رونے سے تم اچھے نہیں لگتے۔ مگر اب تم جان گئی ہو گی میرا سچ کرنا رونا سب ٹھیک تھا۔

آہ! شیلا۔ تمہاری تکلیف میری تکلیف ہے اور تمہاری خوشی میری خوشی، جب میں سنتا ہوں کہ تم کو کسی قسم کی تکلیف ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اور میری روح کو کتنا صدمہ پہنچتا ہے۔ شاید تم کملا کو منع کردو کہ وہ تمہاری باتیں مجھ تک نہ پہنچایا کرے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی اس میں کوتاہی نہ کرے گی۔ وہ ضرور کہے گی شیلا! میں تمہاری دکھ بھری داستان سنکر کیسے خاموش رہ سکتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ شیلا؟ جس کے ساتھ میں نے زندگی کا زیادہ حصہ گزارا ہو۔ میں اسکی تکلیف کیسے برداشت کرسکتا ہوں۔

وہ عیش و نشاط کے دن میں کیسے فراموش کردوں۔ جن کی آغوش میں ہم نے تعلیم پائی، جوان ہوئے.... ایک ساتھ رہے .... محبت کی .... اور محبت کے گیت گائے۔ میں تو بھول نہیں سکتا کیا تم بھلا سکتی ہو؟ وہ دن، وہ راتیں، وہ گرمی اور جاڑے کی دوپہر جب ایک ساتھ ہم گزارتے تھے۔ آہ شیلا! کیسے پیارے دن تھے! اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ اب تم کسی طرح حاصل کی جاسکتی ہو تو میں اپنی زندگی بھی قربان کرسکتا ہوں۔.. مگر شیلا تم ہی بتاؤ کیا اب تم مجھ کو حاصل کرسکتی ہو ــــ ناممکن .... ہم لاکھ کوشش کرنے پر ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔

جب ساری کائنات محوِ خواب ہوتی ہے۔ میں جاگا کرتا ہوں۔ اور روتا ہوں۔ ستاروں سے باتیں کرکے چاند سے مخاطب ہوکر، مگر تم کہاں۔

تمہارے باپ نے انکار کرکے دو زندگیوں کو برباد کردیا۔ کہیں کا نہ رکھا ان کے لئے دنیا تاریک کردی۔

[illegible]

مگر اے ظالم دنیا تیری وجہ سے [illegible] بولنا پڑتا ہے اور مکر بھی کرتے ہیں تو تیری [illegible] سے ......

برسات آگئی۔ رات سے بارش ہو رہی ہے۔ نہ جانے اس وقت تم کیا کر رہی ہوگی۔ میں تو اپنے پرانے کمرے میں بیٹھا تم کو خط لکھ رہا ہوں۔..... تم کو بیتے ہوئے افسانے سنا رہا ہوں۔ اور شاید تم کو تکلیف بھی دے رہا ہوں۔ مگر شیلا میں مجبور ہوں .... آخری ہچکی تک تم کو اسی قسم کی تکلیف دیتا رہوں گا۔ میں کوشش کررہا ہوں کہ تم کو بھول جاؤں....... اور تم مجھے بھول جاؤ.. کاش ایسا ہی ہوسکتا ... کہ میں تم کو فراموش کرکے زندگی کے باقی دن آرام سے کاٹ دیتا۔ لیکن شیلا میں ایسا نہ کرسکا اور شاید نہ کرسکوں۔ آدمی کا ہر چاہا پورا نہیں ہوتا۔ جس طرح میں نے تم کو حاصل کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ اسی طرح اس میں بھی کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

رات کو میں تمہارے باغ کے آگے سے گزرا۔ شیلا جو دل پر گزری بیان نہیں کرسکتا۔ آہ! اب تم اس باغ میں کہاں میں بہت دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ نہ معلوم کس جذبہ کے تحت، اور کچھ دیر ٹھیرتا۔ مگر افسوس بارش آگئی۔ اور مجبوراً اپنے تنگ و تاریک حجرے میں آنا پڑا۔

اچھا شیلا یہ تو بتاؤ۔ کیا کبھی ویسے ہی دن آتے ہیں؟ جیسے پہلے آیا کرتے تھے۔ کیا اب بھی تمہارے مکان کے پیچھے والا تالاب بڑھتا ہے؟ کوئل کی کوک آم کے باغوں سے کیا اب بھی آتی ہے؟ کیا پہلے کی ایسی موسلادھار بارشیں اب بھی ہوتی ہیں؟ شیلا شاید تم کو یاد ہو ایک روز رات کو میں تمہارے مکان میں آیا تھا۔ تم ساری رات غفلت کی نیند سوتی رہیں [illegible] میں جاگتا رہا۔ منہ اندھیرے تمہاری آنکھ کھلی تو تم نے میرے ہاتھوں کو اپنے نرم ریشم سے ہاتھوں میں لے کر [illegible] تمہارے سرخ ہونٹوں سے اپنے خشک ہونٹ [illegible] [illegible] پانی برستا ہوا آ بھر رہا تھا۔

ہائے شیلا وہ زمانہ اب خواب وخیال بن کر رہ گیا۔ میں دیارِ وطن آیا تو تمہاری صورت کو ترستا گیا۔ صرف خط کے ذریعہ تمہاری سیلی ہوئی نرم و نازک انگلیوں کی خنکی محسوس کر سکا۔ بس۔ ایک مرتبہ تم نے لکھا تھا۔ میں نے سنا ہے تم مرلی والے "شیام بہت گاتے ہو۔ ہاں شیلا گاتا بھی تھا۔ اور یہ چیز مجھے پسند بھی تھی۔ مگر اب تو نہ گاتا ہی ہوں اور نہ مجھ کو اب پسند ہی ہے۔ ایک تو یہ چیز گا کر میں رنج مول لینا نہیں چاہتا۔ دوسرے تمہارے لئے گاتا تھا۔ تم کو سناتا تھا سو اب کس کو سناؤں۔ رو تو لیتا ہوں۔

سرِ شام جب ہلکی ہلکی بوندیں پڑتی ہوتی ہیں اور پپیہا کوکو سے گھنے جنگلوں کو سر پر اٹھائے ہوتا ہے تو سسری ہچکی بندھ جاتی ہے۔ اور میں بے تابانہ یہ شعر پڑھنے لگتا ہوں۔ جس کو کبھی تم خود گایا کرتی تھیں ؎

کچھ ترشح تھا پپیہا بولتا تھا شام تھی
دیر تک روتا رہا او بے وفا تیرے لئے

شیلا۔ تمہارا جو یہ خیال ہے کہ میں تم کو بھول کر کسی اور سے دل لگالوں گا، کسی کو دل میں جگہ دوں گا، غلط ہے۔ شیلا یقین جانو اب اس دل میں کسی اور کے لئے جگہ نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے کوشش کی تھی اور اپنے خیال میں کچھ کچھ کامیاب بھی رہی مگر میں اس سے ہمیشہ یہی کہتا رہا ؎

ان سے کہہ دے دل جو آئی ہیں نئی کچھ حسرتیں
بستیاں کچھ پہلے بھی یاں بس کے ویراں ہوگئیں

یہ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ میں شراب پینے لگا ہوں؟ ہاں شیلا میں پیتا ہوں جس چیز کو میں ہمیشہ بہت خراب سمجھتا رہا اب اسی کو پیتا ہوں۔ میں نے آج تک تم سے کوئی بات نہیں چھپائی اور نہ چھپاؤں گا۔ میں شراب پیتا ہوں، "تم کو بھول جانے کے لئے" اپنے کو بیہوش کر دینے کے لئے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو شیلا۔ کہ میں نے جب تک تمہارے ساتھ رہا کوئی نشہ نہیں پیا۔ مگر اب پیتا ہوں پینا پڑتا ہے "بھول جانے کے لئے" ان خوفناک ہاتھوں کو جس نے ہمیں جدا کیا۔ ہمارے ارمانوں کو خاک میں ملا دیا۔ ہمیں زندہ دفن کر دیا۔ آہ شیلا! .... — . .... — ..

شیلا برا نہ ماننا۔ میں اس وقت بھی پئے بیٹھا ہوں۔ اس کڑوی چیز کو، جس کو مذہب اور ہماری سوسائٹی حرام اور ایک لعنت قرار دیتی ہے۔ مگر میں پیتا ہوں۔ حلال سمجھ کر، اس لئے کہ تم کو بھول جاؤں اور ساتھ ساتھ خود کو بھی فراموش کر دوں۔

شیلا۔ میرے دل میں کتنی حسرتیں، کتنے ارمان موجزن ہیں۔ جن کا پورا کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

عاشق کے درد دل کی حقیقت نہ پوچھئے
ارمان جو نکل نہ سکے درد بن گئے

مگر شیلا...... یقین جاننا دل کو یوں بھی اور یہ سوچ کر بھی چین نہیں پڑتا۔ شراب تم کو بھلا نہیں سکتی۔ بعض اوقات شراب پی کر تمہاری یاد اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اور اکثر شراب مجھے بیہوش کر دیتی ہے اور میں تم کو بھول جاتا ہوں۔ لیکن جب ہوش آتا ہے تو خلش اور بڑھ جاتی ہے۔ آہ شیلا اس وقت بھی تم دل میں ہو۔ دماغ میں ہو...... خون کے ساتھ گردش کرتی ہوئی معلوم ہو رہی ہو۔ ہاں ..... یہ حقیقت بھی ہے تم مجھ میں سما چکی ہو۔ میں نے تم کو محبت بنا کر دل میں اتار لیا ہے خود کو تم میں اور تم کو خود میں سمو لیا ہے۔ اچھا اب خط ختم کرتا ہوں درد بڑھتا جا رہا ہے۔ خدا حافظ

یاد کوئی آرہا ہے کیا کروں
دل بہت گھبرا رہا ہے کیا کروں

نوائے فراق

از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری ایم۔اے

کیا زندگی و موت بھی کیا کون و مکاں بھی
اک خواب پریشاں ہے نظامِ دو جہاں بھی

اُمید نہ رکھتے تھے بہت عشق میں لیکن
اس ظلم کا تجھ سے تو نہ ہوتا تھا گماں بھی

اللہ ری نیرنگئی تقدیرِ محبت
بیداریٔ جاوید بھی ہے خوابِ گراں بھی

اک سلسلۂ جوشِ غمِ عشق ہیں دونوں
صحرائے جنوں خیز بھی دریائے رواں بھی

طے ہو کے رہا مرحلۂ قربت و دوری
کچھ تھی کششِ حسن بھی کچھ جذبِ نہاں بھی

کر عہدِ گزشتہ کو شریکِ غمِ امروز
خاکسترِ ماضی سے کچھ اُٹھتا ہے دھواں بھی

شاکی تری آنکھوں سے کے ہیں رسوائے محبت
ایسوں کا بتاتا ہے کوئی نام و نشاں بھی

اک شامِ غریباں میں فسانہ سے فسانہ
یہ عشق و محبت بھی، جہانِ گزراں بھی

اے دل کبھی اس دہر کی افسردہ فضا دیکھ
اے درد کے مارے ہوئے کچھ آہ و فغاں بھی

ہے صلحِ کل اس انجمنِ ناز میں ہر سمت
رہ رہ کے کچھ ابرو کی لچکتی ہے کماں بھی

آنکھوں کا تری قول ہے اک خواب ہے دنیا
میخواروں سے کہتا تھا یہی پیرِ مغاں بھی

کچھ پوچھ نہ اس وقفۂ ہستی کی کشاکش
کچھ موت ہے ٹھہری کچھ عمرِ رواں بھی

ہستی و عدم جزر و مدِ عشق ہیں اے دل
اس درد کی تاثیر یہاں بھی ہے وہاں بھی

دنیا بھی یہی ہے غمِ دنیا بھی یہی ہے
افسردہ سے کچھ داغ ہیں کچھ سوزِ نہاں بھی

میرا بھی سلام اس سے خیال آئے تو کہنا
اے جستجوئے عشق وہ ملجائے جہاں بھی

خود حسن کو ملتا نہیں اندازہ کچھ اس کا
وہ دل کہ شکیبا بھی ہے لرزاں بھی، تپاں بھی

اک سمت خراماں بھی وہ بے لاگ ادا سے
دزدیدہ نگاہوں سے سوئے دل نگراں بھی

گو شامِ ابد صبح ہوئی راہ میں تیری
اب تک ہے وہی میل وہی سنگِ نشاں بھی

لے حسن و محبت کے وہ ایام بھی آئے
کچھ کم ہے ترا لطف بھی کچھ دردِ نہاں بھی

بیگانۂ عالم ہے بہت عشق بھی لیکن
کیوں بند ہے مدت سے زمانے کی زباں بھی

مانوس ذرا دردِ محبت سے بھی ہو لے
سنتے ہیں فراقؔ ایسوں کو ملتی ہے اماں بھی

خاص تنویر کے لئے

صوفی کی سرگزشت

از جناب امام اکبر آبادی

صوفی ایک نوعمر مردانہ حسن کا مجسمہ تھا، اور جتنا یہ حسین تھا اُتنا ہی ذہین و حسن پرست بھی تھا۔ اس کو مذہبی تعلیم سے ایک نوع کا عشق تھا، اور یہی وجہ تھی کہ سولہ سال کی عمر میں اس نے دستارِ فضیلت حاصل کرلی۔ اس کے بعد یہ مصر پہنچا اور وہاں سے فلسفہ و منطق کی ڈگری حاصل کی اور پھر ہیئت و نفسیات میں کمال حاصل کرکے اپنے وطن دہلی واپس آکر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کردیا۔ چند روز میں اس کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ بڑے بڑے علامہ آتے اور علمی بحث سے استفادہ کرتے، فلسفی، منطقی، اور حکما آتے، اور صوفی کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہتے غرضکہ ہمہ وقت علمی مشاغل تھے اور مختلف عنوانات پر گفتگو ہوا کرتی اور روزانہ صوفی کے مکان پر اچھا خاصا مجمع ہونے لگا۔

آنے والوں میں ایک شخص احمد نامی تھا، جو تجارتی ہونے کے علاوہ ادب فلسفہ سے بھی ذوق رکھتا تھا۔ اور ذہانت میں صوفی کا ہم پلہ تھا۔ اکثر صوفی کے پاس اس کی نشست رہا کرتی، اور صوفی اپنے تمام دوستوں میں احمد ہی کو زیادہ عزیز و دلکش انسان سمجھتا تھا۔ رفتہ رفتہ صوفی کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی، اور کچھ اسے اپنی تشہیر کی اشاعت کا ملکہ بھی تھا۔

صوفی خوش لباس تھا، اور خوشبو و حسن سے اسے محبت تھی اگر دبی زبان سے کبھی کوئی اس کی وضع پر اعتراض کرتا تو یہ کہہ دیتا کہ "اللہ جمیل و یحب الجمال" اس کی زبان فروشی و آتش بیانی کے روبرو بڑے بڑے مقررین و مناظرین کی زبانیں جنبش نہ کرتیں۔ اس کی جادو بیانی کا یہ حال تھا کہ جو بات منہ سے نکلتی، معلوم ہوتا تھا کہ الہام ہو رہا ہے۔ اس کی بات کا جواب دینے سے اکثر بڑے بڑے علامہ و فلسفی عاجز رہتے۔

ایک روز صوفی کے مکان پر چند علما جمع تھے، اور فرشتوں کے وجود و عدم وجود پر بحث چھڑی ہوئی تھی۔ چاء اور پان کا دور جاری تھا۔ ابتداء میں بحث نہایت سنجیدگی و متانت سے شروع ہوئی۔ پھر ذرا تیزی پیدا ہوگئی۔ کچھ وقفہ کے بعد اور تیزی ہوئی پھر ایسا معلوم ہونے لگا، گویا ایک غیر ذمہ دار مخلوق ہے، جو اپنے احتساب فرائض سے غافل ہے اور کفر کی تلوار سے ایک دوسرے کو قتل کردینا چاہتی ہے۔ چہرے سرخ ہوگئے۔ گلے کی رگیں پھول گئیں منہ میں کف بھر آئے، اور جب وحشیت و بہیمیت کا دور شروع ہوا تو علامہ حسن (صوفی) نے کہا۔

"میرے محترم بزرگو! فرشتوں کا وجود جسمانی نہیں ہے، بلکہ روحانی ہے ان کو نہ تو جرع و عطش کی خواہش ہوتی ہے، اور نہ ان کے پاس نفس ہے۔ بلکہ فرشتہ نام ہے ایک روحانی طاقت کا۔"

صوفی کی زبان سے یہ سن کر تمام علماء دم بخود رہ گئے، اور ایک دوسرے کا منہ تکنے کے ساتھ ہی اعتراض کی بوچھار شروع کردی صوفی نے نہایت اطمینان سے ایک ایک کا جواب دیا، جب کچھ نہ بن پڑا تو متفقہ طور پر کفر کا فتویٰ صوفی پر لگا کر چل دیئے اس کے بعد

بجز احمد کے سب نے اس کے مکان پر آنا ترک کر دیا اور ذاتیات پر اتر آئے۔ چونکہ اس سے قبل بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا اس لئے صوفی اس گروہِ مقدس سے بیزار اور اب کچھ متنفر سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جاڑوں کی ایک طویل رات میں جبکہ صوفی عبادت الٰہی میں مصروف تھا دفعتہً اس کے دماغ نے ایک پلٹا کھایا، اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔

"ہاں بیشک علماء کی جماعت میری سمجھ میں نہیں آئی اسکا باہمی اختلاف دور نہیں ہو سکتا۔ تنک مزاجی، زود رنجی۔ اس سے دور نہیں ہو سکتی کسی مسئلے کے نفس مطلب تک پہنچ کر بھی اس کے اظہار کی اس میں جرأت نہیں۔ بات بات پر کفر کا فتویٰ لگا دینا اس کے نزدیک کھیل ہے حقیقت میں یہ گروہ قوم کی تباہی کا باعث ہے۔ مجھے ان لوگوں سے ترک تعلق کر لینا چاہئے اور خدا کی عبادت میں زندگی بسر کرنا چاہئے۔ــــ"

چنانچہ صوفی اب یادِ خدا میں محو ہو گیا۔ اور اس نے مستقل عزم کے ساتھ یہ طے کر لیا کہ اب وہ کسی سے نہیں ملے گا۔ اس نے ایک تارک الدنیا کی طرح گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ جب یہ خبر اس کے حلقۂ احباب میں پہنچی تو سب کو افسوس ہوا، اور ان کا افسوس اس وقت اور زیادہ بڑھ گیا، جب کہ صوفی سے ملنے جاتے اور محروم واپس آتے۔

سب کو رنج تھا کہ ایک مفید و صائب الرائے انسان ان سے الگ ہو گیا۔ البتہ مہینوں کے بعد صرف احمد سے کبھی ملاقات ہو جاتی، ورنہ صوفی کو حجرے سے باہر قدم نکالے ہوئے ہفتوں گزر جاتے۔

صوفی اکثر شب بیدار رہتا، اور خدا کی ہستی پا لینے کی تمنا کے سوا اور کچھ نہ چاہتا۔ اکثر راتیں یہ جنگلوں اور پہاڑوں میں گزارتا اور وہاں کے سناٹے میں فطرت کو چہل قدمی کرتے ہوئے پاتا۔ چاندنی میں چشمہ کے کنارے بیٹھ جاتا، اور گھنٹوں خاموشی سے تکلم کرتا، لذت اندوز ہوتا اور سمجھتا کہ یہ خدا کا نور ہے، اور اسی کا جلوہ ہے۔ یہ پہاڑوں کی سنگین و خاموش چٹانوں میں فطرت کو خوابیدہ دیکھتا۔ پھولوں میں کروٹیں بدلتا ہوا محسوس کرتا، اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اسے بیدار پاتا۔ غرضکہ محنت و ریاضت کے اثر سے اسے رویائے صادقہ ہونے لگے۔ اور ہر وقت وہ ایک وجدانی کیفیت محسوس کرتا۔

ایک روز احمد اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

احمد: میرے دوست یہ کیا حالت ہے؟ دنیا کو فیض سے محروم رکھنا، آئینِ انسانیت کے خلاف ہے۔

صوفی: یہ سچ ہے۔ لیکن کیا تم نے نہیں سنا کہ

ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را

احمد:۔ یہ مقولہ خود غرضی و تن آسانی پر مبنی ہے۔

صوفی:۔ جو کچھ بھی ہو۔ مجھے اس میں لطف آتا ہے اس سے بہتر زندگی کوئی نہیں۔ یہ کہا اور حجرے کے اندر چلا گیا۔

احمد اس کی بے مروتی پر افسوس کرنے لگا۔

دن اور رات صوفی عبادت میں گزارنے لگا۔ نہ کھانے کا ہوش، نہ پینے کا۔ اب اس کی ریاضت کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ بجائے علماء کے بزم صوفی میں، صوفیائے کرام پروانوں کی طرح گرنے لگے۔ حلقۂ درس اور ہُو حق کا شور ہونے لگا۔ اور سبّوح و سبّوح پکارنے لگے۔

دفعتہً صوفی کے دماغ نے پھر پلٹا کھایا۔ اور اس کو پیری مریدی کا شوق شروع ہوا۔ چنانچہ چند ہی روز میں اس کے ہزارہا مرید ہو گئے۔ اور اس کی کرامتوں پر رائے زنی ہونے لگی۔ چونکہ صوفی ذہین تھا، نبض شناس تھا، اور علم النفس کا ماہر، جب اس نے دیکھا کہ میری کرامتوں کے اثر سے ایک عالم میرا گرویدہ ہو رہا ہے اور عقیدت مند

کہ کرنا کیا ہے؟" ڈاکٹر کہنے لگا "سیٹھ جی کو خفیف سا ٹی۔بی کا شک معلوم ہوتا ہے۔ اِن کو کھلی ہوا میں کھنا چاہئے اور پھل ملنے چاہئیں اور کوئی ڈاکٹر ایسا ہو جو روزانہ ان کی حالت لکھتا رہے۔" اُملا کہنے لگی کہ حالت لکھنے کو تو ستیش موجود ہے مگر کھلی ہوا اور پھل کہاں سے آئیں گے اب تو روٹی ہی مل جائے تو بہت ہے"۔ "افسوس اُملا" ستیش کہنے لگا۔ "کیا تم بھول گئیں کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ اور تمھارا باپ میرا باپ ہے۔ ہم تپا جی کو گاؤں لے چلیں گے وہیں رہیں گے۔ تم بھی چلو۔ دیہات سیوا بھی کرو۔ اور تپا جی کی دیکھ بھال بھی کرو۔ میں بھی وہیں سے آ رہا ہوں۔ ایک چھوٹا سا گھر وہ لوگ دینے پر راضی ہیں۔ وہیں چلو۔" دوسرے دن اُس عالی شان محل کو جہاں اُس کا بچپن گزرا تھا چھوڑ کر اُملا اور سیٹھ جی دونوں گاؤں میں چلے گئے۔ ستیش اُن کے ساتھ رہتا۔ کبھی شہر آ جاتا۔ کبھی پھر گاؤں واپس چلا جاتا۔

(۴)

ہوگئی فسخ محبت ہی کو
آگیا اُن کو وفا کا اعتبار

تھوڑے سے عرصے میں دنیا کتنے رنگ بدلتی ہے۔ کیا کیا لیل و نہار دکھائی دیتے ہیں۔ جو کل تھا وہ آج نہیں جو آج ہے وہ کل نہیں۔ کل یاس تھی آج اُمید، کل مایوسی تھی آج اطمینان۔ انسان کی کشتیٔ حیات لیل و نہار، یاس و اُمید، ناکامی اور کامیابی کے سمندر میں کیا کیا ہچکولے کھاتی ہے۔ کچھ اُسی کے دل سے پوچھئے جس پر یہ سب بیت چکی ہو۔

ایک برسات آپ نے وہ دیکھی جب دو معصوم دلوں میں محبت کا بیج بویا گیا۔ ایک برسات وہ بھی دیکھی جب سال بھر پرورش پانے اور جان پڑنے کے بعد اس کو پامال کر دیا گیا۔ وہ مُرجھا کر خشک ہونے کے قریب ہو گیا۔ آیئے اب یہ بھی سماں دیکھئے جب تضادِ قدرت کے منتظم ہاتھ اس کو واقعات تبدیلیوں سے پھر سینچتے ہیں۔ پھر شجرِ محبت میں کونپلیں پھوٹتی ہیں پھر وہ ہرا ہوتا ہے پھر اُس کے بار آور ہونے کے سامان ہوتے ہیں۔ آج اُملا اور ستیش کی شادی ہے۔ سیدھے سادے گاؤں والے جمع ہوتے ہیں اور معمولی طور پر دو سچی محبت کرنے والے آخر مل جاتے ہیں۔ چاروں طرف سے شور ہوتا ہے۔ "ستیش بابو کی جے!" "اُملا دیوی کی جے"۔ سب سے زیادہ خوش سیٹھ جی نظر آتے ہیں۔

آہ! کسی نے سچ کہا ہے ؏

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

SUNITA DEVI



She is coming in Ranjit's "Prof Vaman M.Sc." at West End Talkies

MEERA



See her in Bombay Talkies "Bhabi" at Roxy Talkies Bombay.

یہ سن کر ناز بانو نے شرمندگی و خجالت سے گردن جھکالی لیکن عنیفہ نے جواب دیا کہ حضور میں اسے گانے کی تعلیم دیتی ہوں۔

صوفی کا دل دھڑکنے لگا، اور دل ہی دل میں سوسائٹی کی بے اعتنائیوں پر ملامت کرنے لگا۔ دفعتاً اس کے دماغ میں ناز بانو کی آواز زندگی گردش کرنے لگی۔ اور اس کے باصرہ نواز جمال سے یہ متاثر ہونے لگا۔ اس کی نگاہوں کے روبرو کمند دل کے جال بچھنے لگے، تیروں کا مینھ برسنے لگا اس نے ذرد پڑھا اور کہا آگے آ۔ ممتاز آگے آئی اور مودب ہو کر بیٹھ گئی۔ صوفی نے اسے عربی زبان میں کچھ پڑھایا۔ اور اس کا ہاتھ اپنے دونوں قوی ہاتھوں میں لے کر اس انداز سے دبایا کہ ممتاز کی روح کے بجائے، خود صوفی کی روح متاثر ہونے لگی۔

صوفی نے اپنے تئیں سنبھالا اور کہا بیٹی آنکھیں بند کر، اور ذات الٰہی میں کھو جا۔ ناز نے ایسا ہی کیا۔ اب اس سے خدا کے نام کی ضربیں لگوائی گئیں، اور ہر ضرب کے ساتھ گردن کو گردش دینے کا حکم ہوا۔ پھر اس گردش میں سرعت پیدا کرنے کا حکم ہوا۔

ناز نے حکم کی تعمیل کی، اور جوش عقیدت میں اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور اب یہ بے ہوش تھی۔ صوفی اسے دیکھ رہا تھا گھور رہا تھا، اور محسوس کر رہا تھا کہ ایک مرمریں طلسمی مورت خوابیدگی میں بھی بیدار ہے۔ صوفی نے پھر اپنے تئیں سنبھالا اور ناز پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ اب یہ ہوش میں تھی، اور صوفی کے قدموں پر اس کا سر تھا۔ صوفی نے اسے اٹھایا، اور چند دعائیہ کلموں کے ساتھ رخصت کیا۔

صوفی تنہا حجرے میں رہ گیا۔ حجرے کا ذرہ ذرہ صحرائے دہشت بن گیا۔ فضا مایوسی سے لبریز ہو گئی۔ اور صوفی اپنے اندر ایک نوع کی ہذیانی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ یہ اٹھا اور ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ پھر بیٹھ گیا۔ اور وضو کر کے عبادت الٰہی میں محو ہو گیا انہاک ذات باری میں ڈوب جانا چاہا، لیکن انتشار خیال سے یکسوئی حاصل نہ ہو سکی۔ اب یہ پھر اٹھا۔ اور اپنی روح کی گہرائیوں میں ایک نوع کا ارتعاش دیکھنے لگا۔ کچھ وقفے کے بعد یہ پھر عبادت الٰہی میں غرق ہو گیا۔ اپنی گردن قلب کی طرف ڈال دی۔ اور گھنٹوں ایک بے حس مورت کے مانند بیٹھا رہا۔ لیکن عبادت کا وہ لطف منزلوں دور تھا۔ یہ سجدے میں گر گیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہنے لگے۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ کلیجہ منہ تک آنے لگا۔ اور ایک چیخ کے ساتھ اس کی زبان سے یہ نکل گیا کہ "الٰہی مجھے اپنی پناہ میں رکھ" غرضکہ فطرت ہنس رہی تھی، اور یہ رو رہا تھا۔

صوفی کی چند روز تک یہی حالت رہی مرید محسوس کرنے لگے کہ صوفی پر آج کل جذب کی حالت طاری ہے۔ مجذوبانہ کیفیت کا زور ہے۔ شب کی تنہائی میں صوفی نے اپنی حالت کا جائزہ لیا اور اس نے طے کیا کہ اب مجھے ایسی جگہ چل دینا چاہئے، جہاں کوئی نہ ہو۔ چنانچہ یہ کشمیر کے پہاڑوں کی طرف سب کو چھوڑ کر چل دیا۔

شام کا وقت ہے کانپتے ہوئے اور ڈھلتے ہوئے، سورج کی کرنیں کلابہ کے سمندر کی سطح ساکن پر اس طرح پڑ رہی ہیں گویا پگھلا ہوا سونا موجیں لے رہا ہو۔ لوگوں کا ہجوم، زرق و برق لباسوں کی کثرت، اور طوفان حسن کا وہ نظارہ، جو بیک وقت ایک اجنبی کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ کبھی نہیں دیکھا۔

دفعتاً ایک شاندار موٹر آیا، اور اس میں سے ایک مجسمۂ حسن بے حجاب جو آسودۂ ناز تھا، ایک قرمزی رنگ کی ساری میں ملفوف نیچے اترا۔ بے شمار نگاہیں جو ابھی فضا کے نظارے میں محو تھیں۔ اب ناز کے سراپے پر پڑ رہی تھیں، اس کی نشیلی آنکھوں کے پیالوں سے لوگوں کی تشنہ نگاہیں

جو رعنائی کش تھیں اور اس کی کشادہ و دراز متحرک آنکھوں میں معلوم ہوتا تھا کہ لیل و نہار گردش میں ہیں۔ خنجر ناز بے نیام تھا۔ اور شباب تیغ بکف، عشق سر بکفن تھا، اور حسن مقتل بداماں۔

ناز بانو نے زمین پہ قدم رکھا اور افضل جو بمبئی کے دولت مندوں میں سے تھا، اس کے ہمراہ چند لمحوں کے لئے ٹہلنے لگی، اس کے پائے حسن کی رفتار سے رباب کی ترنم ریزیاں جاری تھیں۔ مجمع کے دل و دماغ کی رگ رگ میں، رگوں کے ریشے ریشے میں، ریشوں کی ترکیب میں بجلیاں دوڑ رہی تھیں اور ایک دوسرے سے اشارۃً پوچھ رہا تھا کہ یہ کون ہے؟ نور و ظلمت کی ہم آغوشی کے ساتھ ہی کلاب کی سرزمین روشن ہوگئی اور ناز بانو و افضل چند لمحوں کی تفریح کے بعد اپنے کار میں بیٹھ کر چل دیئے۔

ناز بانو جس طرح اپنے شعلہ زا حسن کی وجہ سے مشہور تھی اسی طرح افضل اپنے تموّل کے باعث بمبئی کے سرمایہ داروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ناز کی اور اس کی ایک "ریس" میں ملاقات ہو چکی تھی۔ اور ان کے مراسم محبت میں تبدیل ہو چکے تھے۔ کار تیزی سے چلی جا رہی تھی، اور یہ دونوں باہم مصروف راز و نیاز تھے۔

افضل: مسکرا کر میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ مدت کی آرزو کو اپنے پہلو میں زندہ دیکھ رہا ہوں۔

ناز (ایک الہانہ انداز سے) ہاں دیکھئے کلاب کا سارا مجمع مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ اور سب کی نگاہیں مجھ پر ہی جمی ہوئی تھیں

افضل: اور میری نگاہیں کبھی مجمع پر تھیں، اور کبھی اپنے اوپر ــــــ

ناز: کیا آپ جانتے ہیں کہ احمد کون شخص ہے؟ میں نے اسے ریس میں دیکھا تھا۔

افضل: یہ ایک تاجر پیشہ ہے، ہوشیار ہے، اور ذہین ہے اور اکثر اس کا مطمح نظر پیسہ ہوتا ہے۔ احمد کا نام سن کر افضل نے ناز پر ایک مشتبہ نظر ڈالی، اور ناز اس سے متاثر ہوگئی۔

ناز بانو: کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ ......

ابھی ناز کا فقرہ شروع نہ ہوا تھا کہ دفعتاً ایک سیٹی کی آواز آئی۔ اور اسی کے ساتھ ایک فائر ہوا، جس سے ناز بانو کی بڑھیا کا خاتمہ ہوگیا۔ فوراً ہی دوسرا اور تیسرا فائر ہوا جس سے ڈرائیور اور افضل شدید مجروح ہوئے۔ اور موٹر رک گیا۔ ناز کی ایک چیخ نکلی۔ اور برابر جو ایک د[illegible] ا رہی تھی، رکی اس میں سے چند نقاب پوش اترے، اور ناز کو اٹھا کر اپنی کار میں ڈالا اور روانہ ہوئے ناز بانو پر نیم غشی طاری تھی، اس پر اس کو کچھ سنگھا کر اور بیہوش کر دیا۔ اور اب یہ غفلت کی نیند سو گئی۔

(باقی)

سرمایہ دار کو مصور کا پیغام

از :- شاعرِ اسلام ترجمانِ وحدت حضرت مولانا مصور بمبئی

عیاں تجھ پر اگر کیفیتِ مستور ہو جائے
قسم اُسکی، کہ تو بھی بندۂ مزدور ہو جائے

خیانت کر رہا ہے تو امیں بن کر زمانے میں
قیامت ہے کہ تُو دنیا میں یوں مشہور ہو جائے

دہکتی آگ ہے، ہاں آگ، یہ دولت یتیموں کی
نہ تو مغضوب ہو جائے نہ تو مقہور ہو جائے

غریبوں سے تجھے نفرت ہے لیکن مجھ کو یہ ڈر ہے
نہ تو قلبِ شہنشاہِ عرب سے دور ہو جائے

تری ہستی تو کیا، برباد ہو تاجِ شہنشاہی
نبرد آرا جو اُن کی فطرتِ غیور ہو جائے

بھرا ہے تیرے ساغر میں یہ خونِ ملتِ بیضا
نہ کوئی نشۂ دولت میں اتنا چور ہو جائے

یہ بزمِ عیش تا کے؟ یہ تنعم تا کجا غافل؟
کہ اپنی زندگی سے بھی کوئی رنجور ہو جائے

یہ تیرے جبر و استبداد کا ہر دم تقاضا ہے
کوئی مجبور کر دے، اور تو مجبور ہو جائے

اے ناداں نظر کر انقلاباتِ زمانہ پر
نظامِ زیست پر اس درجہ کیوں مغرور ہو جائے

نسیمِ باغ کیا؟ جوشِ نمو کیا؟ صحنِ گلشن کیا؟
یہ تیری کم نگاہی ہے کہ تو مسحور ہو جائے

جو تو چاہے تو ہاں اب بھی اس درِ فلاکت میں
تری چشمِ کرم سرمایۂ مزدور ہو جائے

جو تو آنسو بہائے بیکسوں کی خستہ حالی پر
رُخِ عالم سے رنگِ مسکنت کافور ہو جائے

یہ ممکن ہے کہ تو عصیاں پر اپنے منفعل بھی ہو
یہ مشکل ہے کہ تو رحمت سے اُسکی دور ہو جائے

تجھے احساس ہو جائے جو نورِ کبریائی کا
یہ عالم پھر ترے ہی نور سے معمور ہو جائے

بجائے خوں تری رگ رگ میں پھر نورِ حقیقت ہو
جو تُو چاہے تو ہر ذرہ حریفِ طور ہو جائے

رگوں میں تیری گر انسانیت کا خون ہے کچھ بھی
تو پھر لازم ہے تو اس در پر مجبور ہو جائے

کوئی دم میں گزرنے کو ترا اب جوشِ دہرِ فانی سے
بدل دے موت کو اُن کی حیاتِ جاودانی سے

چالاک شوہر

از علّامہ شبلی صاحب بمبئی

(۱)

اشک آنکھوں میں فغاں لب پہ تمنا دل میں
جی بہلنے کے شبِ ہجر یہ ساماں نکلے

سلیم رات کے دو بجے گھر واپس آیا۔ اور آہستہ قدم چلتے ہوئے کمرے کے دروازہ سے جھانک کر دیکھا کہ اُس کی جان نثار وفاشعار بیوی جھروکے کے قریب انتظار میں بیٹھی ہے، آنکھوں سے آنسوؤں کے ریلے جاری ہیں، کمرے میں داخل ہوتے ہی سلیم بیوی نے اشک آلود آنکھوں سے اس کے چہرے پر ایک پُرمعنی نظر ڈالی، مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی عتاب آمیز کلمہ زبان سے نکالے، سلیم نے آگے بڑھ کر کہا :۔

" میں جانتا ہوں تم کیا کہنے والی ہو۔ اس لئے تمہیں گفتگو کی تکلیف دینا نہیں چاہتا، تم یہ چاہتی ہو کہ اس وقت مجھے ضروری اور غیر ضروری باتیں سناؤ۔ اور ایک واعظ کی طرح موافق اور ناموافق نصیحتوں سے میرا مغز چاٹو۔

لیلی، (غصہ میں بھری) معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں اپنی آوارہ گردی کا اعتراف اور گناہوں کا احساس ہے۔ اور لائق سزا ہونے کی توقع رکھتے ہو۔

سلیم " گناہ اور سزا؟ اری پگلی اس وقت ہم ہیں کہاں؟ کیا میں نے کسی عدالت سے بیاہ کیا ہے یا تھانہ سے شادی کی ہے؟ ہا، ہا، قہ، قہ

لیلی نے جان لیا کہ سلیم نشے میں چور ہے اور اس کوشش میں ہے کہ پیر نہ لڑکھڑائیں ۔

(۲)

لیلی " آج تم نے پھر شراب نوشی کی، باوجودیکہ مجھ سے وعدہ کر چکے تھے، اور قسم بھی کھالی تھی کہ اس نجاست کو کبھی مُنہ نہ لگاؤ گے۔

سلیم " میں نے شراب نہ پینے کا وعدہ ضرور کیا تھا مگر اس شرط سے کہ بالکل مدہوش نہ ہو جایا کروں گا۔ میں اپنے وعدہ کا پابند ضرور ہوں اس کی دلیل یہ ہے کہ آج مجھے کسی نے اُٹھا کے گھر تک نہیں پہنچایا، بلکہ میں خود اپنے پیروں چلا آیا ہوں، اور دروازے کے قفل کا سوراخ بھی مجھے فوراً مل گیا، اری دیوانی اسے کوئی نشہ کہتا ہے؟ ہا، ہا، ہا، ہا ــــ

لیلی " ہنس لو، اور خوب ہنس لو، یہ قہقہے کسی دن خون کے آنسو رلائیں گے۔ تم نے جو کچھ اپنے والد مرحوم سے ورثہ میں پایا تھا وہ سب تو برباد کر چکے صرف ایک چوتھائی اس کی باقی رہ گئی ہے۔ وہ بھی رہن ہے۔ اب بتلاؤ یہ گل چھرے کب تک اڑیں گے؟ تمھیں اتنا خیال نہیں کہ رفتہ رفتہ بربادی کے گڑھے کے دہانے پر پہنچ چکے ہو " معہ فرداً اس میں گرنے ہی والے ہو۔

اور ساتھ ساتھ مجھے بھی قعر مذلت کی گھاٹی میں جھونکو گے۔

افسوس میرے والد اور بڑے بھائی نے مجھے بہتیرا سمجھایا تھا کہ تمھاری شوہری کو منظور نہ کروں، کیونکہ تم بڑے فضول خرچ اور آوارہ مشہور تھے، مگر مجھے تمھاری صورت و سیرت کچھ ایسی پسند آگئی تھی جس سے میں نے ان کی ایک نہ مانی، اور تمھارے لئے انھیں ناراض کیا، جس کا یہ صلہ مجھے دیا جاتا ہے؟ ع

خراب و خستہ ذلیل و رسوا تم سے ملتے نہ ایسے ہوتے

سلیم" بیوی، تم نہیں دیکھتیں، اس وقت مجھے جمائیوں پر جمائیاں آرہی ہیں، نیند کا بری طرح غلبہ ہو رہا ہے، کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ان ساری باتوں کو کل صبح تک اٹھا رکھتیں، تاکہ میں ہوشیاری میں اچھی طرح سنتا اور سمجھ سکتا، میں تمھیں ایک نیا طریقہ بتلا دوں جس سے تمھیں آرام رہے گا، اور مجھے بھی تکلیف نہ ہوگی، وہ یہ کہ جب کبھی میں تمھارے خیال میں مجرم ثابت ہو جاؤں تو فرد جرم چاہے جس قدر لمبی ہو، لکھ کے اس پر دفعات جرم بھی لگا دیجئے ع

لگا دو تم خوشی سے مہر میرے قتل نامے پر
مجھے اقرار الفت ہے سزا پانے کے قابل ہوں

اور اس فرد جرم کو میرے سرہانے رکھ دیجئے، جس کو میں سونے سے پیشتر یا بیدار ہونے کے بعد پڑھ لوں گا، ممکن ہے کہ کسی شب اس کے مطالعے سے مجھے خوب نیند آجائے، ہا! ہا! ہا!"

لیلی" خوب مضحکہ اڑالو۔ مذاق کا کوئی پہلو رہنے نہ پائے، کیونکہ تمھارے شعور و احساس کا جنازہ اٹھ چکا ہے، مگر اتنا جان لو کہ اب تمھارے ساتھ میرا نباہ ہو نہیں سکتا عنقریب یہ گھڑی ٹل جائے گی۔

(۲)

اس رات لیلی کی آنکھ صبح تک نہ جھپکی، اپنی کم نصیبی پر روتی رہی، ماضی کا خیال اسے ستا رہا تھا، وہ زمانہ یاد آنے لگا جبکہ وہ اپنے والدین کے زیر سایہ کس لاڈ، چاؤ سے پلی تھی، اس کی کوئی فرمائش رد نہ ہوتی تھی۔ ماں، باپ اور بھائی اس کی ہر ندا پر لبیک کہتے تھے، اور اسے ہر طرح خوش رکھنے میں کوتاہی نہ کرتے تھے کئی اعلیٰ خاندان کی بیگمیں لیلی کے لئے پیغام لے آئی تھیں، ہر کوئی اس کے حسن صورت، حسن ادب، حسن اخلاق کی وجہ اپنی بہو بنانے کی خواہشمند تھیں، لیلی کا کنبہ بھی اسی تردد میں تھا کہ اس نادر الوجود دوشیزہ کے لئے کونسا شوہر انتخاب کریں؟

ایک شب لیلی اپنے والدین اور بھائی کے ہمراہ سنیما گئی ہوئی تھی ان کا باکس ریزرو تھا، انٹرول کے وقت اپنی دایہ کے ساتھ باکس سے باہر ہوا کھانے کے لئے نکل آئی۔ دایہ نے ایک خوبصورت، خوش قطع اور خوش لباس نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

دایہ" بی بی لیلی، دیکھئے وہ سلیم میاں ہیں۔ جن کی والدہ آج ہی اپنے یہاں تم سے اپنے فرزند کی نسبت کا پیغام لائی تھیں بی لیلی! اگر میری رائے لو تو میں یہی کہوں گی کہ آج تک جتنے پیغام آئے ہیں۔ ان میں یہی ایک لائق و فائق نوجوان ہے، جو چال میں، ظرافت میں، ادب میں بے نظیر ہے، تھوڑا ہی عرصہ گذرا ہے کہ ان کے والد نے انتقال کیا، اور پانچ سو بیگھے زرخیز زمین ان کے لئے ورثہ چھوڑ گئے ہیں۔ اللہ کے دیئے سے گھر بار، موٹر نوکر چاکر سے ایک شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

لیلی نے دایہ سے تو کچھ نہ کہا، مگر سلیم کی شکل دیکھتے ہی اس کا دل دھڑکنے لگ گیا۔ اتفاقاً چار آنکھیں ہوگئیں، سلیم نے اشارے سے سلام کیا، جس کے جواب میں لیلی نے دلکش تبسم کے ساتھ سر ہلا دیا، اور فرط حیا سے سر جھکائے بسرعت باکس میں داخل ہوگئی۔ اس مقابلے کے بعد دایہ اکثر سلیم کا ذکر چھیڑ کے اس کی تعریف کے پل باندھا کرتی تھی۔ ممکن ہے کہ

اس خدمت کے صلے میں سلیم اُس کی منتیں کرتا ہو،

جب سلیم کی جانب سے متواتر درخواستیں آئیں تو لیلی کے والد نے سلیم کے عادات و اطوار، چال چلن دریافت کرنے شروع کئے تو معلوم ہوا کہ بدچلن ہے، جس سے اپنی لاڈلی بیٹی کو اس کے بیاہ میں دینا نامنظور کیا، مگر چونکہ لیلی سلیم پر اپنا دل پھینک ہی چکی تھی اس لئے اپنی والدہ سے صاف الفاظ میں کہدیا کہ مجھے سلیم کے سوا اور کوئی شوہر پسند نہ ہو گا' ماں بھی فوراً اپنی بیٹی کی طرفدار ہو گئی اور شوہر اور لڑکے کو یہ سمجھا بجھا کے رضامند کر دیا کہ سلیم ابھی کم سن ہے اس میں ب جوانی کی اُمنگیں ہیں جو بیاہ کے بعد خود بخود نابند ہو جائیں گی ۔۔

(۳)

تم شوق سے جا بیٹھو اغیار کے پہلو میں
لو ہم تو چلے یاں سے لے یار خدا حافظ

صبح سات بجے سلیم نیند سے بیدار ہوا' مگر عجب پریشانی کی حالت میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اردگرد دیکھ رہا ہے، کیونکہ اسے ایک ڈراؤنا خواب دکھائی دیا تھا' جس کا مسلسل منظر تو یاد نہیں رہا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ لیلی نے اپنے کپڑوں میں آگ لگا دی اور سر سے پاؤں تک ایک شعلہ بن گئی ہے' جسے بجھانے کے لئے لپک کے جو اس کے قریب پہنچا تو اس کے کپڑے بھی بھڑک اٹھے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے' شعلوں نے اُنھیں گھیر لیا۔ اور ان کا جسم اس طرح گھلنے لگا جیسے موم پگھلتا ہے؛ اس قسم کے خواب سے سلیم اگر گھبرا کے اٹھے تو تعجب نہیں ہے، وہ کئی گھنٹوں کی نیند کے بعد بیدار ہوا تھا۔ اس لئے شراب کا نشہ اُتر چکا تھا' حواس بھی کچھ درست تھے' دل ہی دل میں لیلی کے ساتھ بدسلوکی پر خود کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ اگرچہ وہ ایک آوارہ، رقص و سرود، شراب و کباب کا دلدادہ تھا' تاہم لیلی کی محبت کے مقابلے میں دنیا بھر کی حسین عورتیں اس کی نظر میں ہیچ تھیں، کیونکہ پہلی ہی نظر میں لیلی اس کا دل لے چکی تھی' جس پر کسی غیر کا قبضہ ہو نہیں سکتا تھا' مگر کیا کرے' اس کی عقل و خواہشات میں اتحاد نہ تھا' دل کی خواہش عقل کی رکاوٹوں پر غالب آجاتی ہیں' بہت کچھ چاہتا تھا کہ بُری لتیں اور آوارگی چھوڑ کے لیلی کے ساتھ آسائش کی زندگی گزارے۔ مگر وہ عادتیں نہ چھوٹتی تھیں جو بچپن سے اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھیں ۔

خوب سی جمائیاں، انگڑائیاں لیتے ہوئے بستر سے یہ ارادہ کر کے اٹھا کہ لیلی کے کمرے میں جا کے اس سے معافی مانگ لے' اس یقین کے ساتھ کہ وہ زیادہ عرصہ تک خفا نہ رہے گی' ضرور معاف کر دے گی۔ چنانچہ لیلی کے کمرے میں گیا تو وہاں اس کا پتہ نہ تھا نہ بستر کی چادر پر شکن پڑی ہے جس سے پایا گیا کہ رات کو اس نے اپنے کمرے میں آرام نہیں کیا' سلیم کو تشویش پیدا ہوئی کہ کہیں اس پر کوئی حادثہ نہ گزرا ہو، کیونکہ اُس دہشت ناک خواب کا منظر ابھی تک نظر سے دور نہ ہوا تھا۔ خواب گاہ سے نکل کر کتبخانے کے کمرے میں پہنچا تو دل کو اطمینان ہوا۔ یہ دیکھ کے کہ لیلی ایک صوفے پر بے ترتیبی سے سوئی ہوئی ہے ۔

سر کہیں، بال کہیں، ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں،
ان کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو؛

اس کے نیم برہنے جسم پر خوبصورتی تصدیق ہو رہی تھی نقاش جمال نے اُسے بالکل نئے سانچے میں ڈھالا تھا۔ باایں ہمہ چہرے پر خفیف سی اُداسی نمودار تھی جو اس کے دلی رنج کو ظاہر کر رہی تھی اُرخساروں پر آنسوؤں کے خشک دھبے دکھائی دیتے تھے۔ اس ہیئت کو دیکھ کے سلیم کا دل پاش پاش ہو گیا ضمیر کی

ملامت بڑھ گئی۔ چاہتا تھا کہ اس ملائک فریب کو دونوں ہاتھوں پر اٹھالے۔ اور بوسوں سے اس کے گالوں پر جمے ہوئے داغ اشک مٹادے، مگر وہ نہ چاہتا تھا کہ لیلی گھبرائی ہوئی نیند سے چونکے اس لئے اپنے چہرے کو .... اس کے چہرے کے قریب کرکے بہ نرمی و لطافت کہا۔

"جانمن! اس تکلیف زا نیند سے بیدار نہ ہوگی؟ پیاری! اٹھو بستر پر چل کے لیٹ رہو!"

سلیم کی آواز سنتے ہی لیلی نے بڑی بڑی خمار آلود آنکھیں کھول دیں اور شوہر کو قریب دیکھ کے ابتدا میں قدرے مسکرائی مگر فوراً ہی اُسے رات کا واقعہ یاد آگیا جس سے وہ تبسم خفگی اور چیں بر جبیں سے بدل گیا۔ غصے کی آواز میں بگڑ کے کہا۔

"پرے ہٹو، خبردار میرے جسم کو بس ہاتھ نہ لگانا جس میں نجس عورتوں کے بدن کی نجاست لگی ہوئی ہے۔"

سلیم "ابی! اس وقت اس گرداں و اشتقاق کی ضرورت کیا ہے، ہم تھوڑے ہی عربی لغت کا امتحان دینے بیٹھے ہیں!

ہا، ہا، ہا ——————

لیلی" پھٹکار ہے، ابھی تک تمہاری ہنسی نہیں جاتی؟ شرم ہو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرو —— یہ دیکھو (پہلو سے کاغذ کے پرزے اٹھاکے) تمہاری عصمت فروش محبوبہ کی تصویر جو تمہارے جیب سے برآمد ہوئی ہے، میں نے اُس کے پرزے اڑادیئے، واللہ میرا بس چلے تو اس تصویر کی خوبصورت بلا کی بوٹیاں نوچ ڈالوں کیوں نہ تم ایسے لوگوں کے ساتھ راتیں گزارنا، اور اپنی بیوی کو گھر کی چار دیواریوں میں مقید رکھنا تمہیں پسند ہے۔ جہاں وہ اپنی سیہ بختی پر آنسو بہاتی ہے، اور تم باہر عیاشی میں مشغول رہو، غیر سے تصویر پر لکھتی بھی ہیں کہ "پیارے سلیم کو شب ماہتاب کی یادگار"

اب بتاؤ، اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت تمہاری غداری اور خیانت کے لئے چاہئیے؟

سلیم کی آنکھیں نیچی ہوگئیں، کوئی جواب نہ پڑا، چہرے پر خجالت نے زردی پھیر دی۔ اُسے یاد نہ رہا کہ گزشتہ شب اس کی دلبر با نے اپنی تصویر اس کی شیروانی کے جیب میں ڈال دی تھی نشہ کی حالت میں اس تصویر کو چھپانے کا موقعہ نہ ملا، پھر بھی سلیم کو امید تھی کہ وہ اپنی بیوی کو خطا معاف کرنے پر مائل کرہی لے گا

سلیم" لیلی! ڈیر لیلی!! میں بےحد متاسف اور پشیمان ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ ....

لیلی" وعدہ کرتے ہو؟ کیا خوب، مجھے اس قدر بھولی سمجھ لیا ہے کہ میں ہر وقت تمہارے وعدے پر اعتبار کرتی رہوں"

توبہ سو مرتبہ کی پر نہ با صمی توبہ
توبہ پھر کرنے کا ہے مقصد الٰہی توبہ

مجھے تو یہ گمان تھا کہ شاید تم دوستوں میں رات کا بہت سا حصہ گزارتے ہوں گے لیکن تمہاری ان سیہ کاریوں کا بالکل گمان نہ تھا۔ جس کا یہ ثبوت مل گیا ہے اس کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت نہ رہی۔

سلیم" جانِ سلیم! اس تصویر میں تمہیں بدگمان ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

لیلی" اللہ ری ڈھٹائی، تمہارے حسابوں یہ کوئی چیز ہی نہیں ہے؟ لو سنو! اور اچھی طرح سن لو، اب میرا گزارا تمہارے ساتھ ہو نہیں سکتا، ہمیں ضرور ایک دوسرے سے الگ ہو جانا چاہئے، میں زیادہ بگڑتی نہیں، کہ تمہیں مجھے بنانے کی تکلیف اٹھانی پڑے صاف الفاظ میں کہے دیتی ہوں کہ مہربانی فرما کے مجھے طلاق دیدو مگر ایسا طلاق جس کے بعد پھر کبھی ملاپ نہ ہو، میں تم سے ہر از دامی

تعلقات کو قطع کر لینا چاہتی ہوں، سُنا ؟

سلیم (حیرت زدہ ہوکے) اے توبہ توبہ، تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟ ۔۔ ہوش کی باتیں کرو مجھے تو یقین تھا کہ تم مجھے دل سے چاہتی ہو اور میری پیاری بیوی ہو، یہ خبر ہی نہ تھی کہ تمہارا دل مجھ سے اس قدر برگشتہ اور ناراض ہے؛

لیلی" میرے ہرجائی شوہر! تم نے میری اُمیدوں کا خون کر دیا، میرے دل کو کچل ڈالا ہے، قسم اللہ کی، آئندہ میرا دل اگر تمہاری یاد میں ذرا بھی پھڑکے تو اس میں خنجر گھونپ دوں گی چلو، دیر کیا ہے ؟ دے دو طلاق، اور جلد دیدو ۔ میں طلاق کے سوا تمہاری کسی بات کو منظور کرنے والی نہیں ہوں۔

یہ کہتے ہی لیلی کا چہرہ تمتما گیا۔ جسم لرزنے لگا سلیم گھبرا گیا۔ اس خیال سے کہ کہیں لیلی عصبی ہیجان سے دیوانی نہ ہو جائے بہتری اسی میں ہے کہ خود نرمی اختیار کرے تاکہ اس کا جوشِ غضب ٹھنڈا پڑ جائے۔

سلیم" (بہ نرمی) خیر، اب اس مسئلے کو اُس وقت تک اُٹھا رکھو، جب تک کہ تمہارا غصہ فرو ہو جائے۔

لیلی" (اور بگڑکے) تم یہ چاہتے ہو کہ میں ٹیلیفون سے اپنے ابا کو بلالوں تاکہ وہ آکے مجھے لے جائیں یا سمجھائیں بجھائیں، مگر میں اس گھر سے بغیر طلاق لئے ہرگز قدم باہر نہ نکالوں گی۔

سلیم" (گڑگڑا کے) اچھی لیلی! اب خدا کے لئے اس جھگڑے کو چھوڑ دے، میرا کلیجہ منہ کو آرہا ہے، تم جانتی ہو کہ تم سے بڑھ کر دنیا میں مجھے کسی سے محبت نہیں ہے، میں تمہارا ہی عاشق ہوں، شیدا ہوں، پرستار ہوں، مجھے صرف اتنی مہلت دیدو کہ میں اپنی نیک چلنی اور وفاشعاری کا تمہیں یقین دلادوں۔

لیلی" میں نے کہہ دیا کہ مجھے طلاق چاہئے، اب تمہاری یہ خواہش ہے کہ میں چلاؤں، کہرام مچاؤں اور اڑوس پڑوس کو جمع کر لوں یا یہ چاہتے ہو کہ اپنے جسم پر تیل چھڑک کے خود کو جلا دوں۔

جلنے کا لفظ سُنتے ہی سلیم کے چھکے چھوٹ گئے رات کا خواب یاد آگیا، سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کرے؟ جب دیکھا کہ لیلی کا غصہ کسی طرح فرو نہیں ہوتا، تو دھیمی آواز سے کہا۔

"بتاؤ، اس وقت تمہاری کیا خواہش ہے، چاہتی ہو کہ میں تمہارے والد کو بلالاؤں ؟

لیلی" نہیں، پہلے قاضی صاحب کو بلالاؤ۔

سلیم" بہت اچھا، ایسا ہی کرتا ہوں کیونکہ تم نے ظاہر کر دیا کہ ہم میں دلی محبت و اتفاق نہیں ہے، تو پھر طلاق و افتراق ہی مناسب ہے، میں قاضی صاحب کو بلا لیتا ہوں اور ساتھ ہی تمہارے والد کو بھی لے آتا ہوں تاکہ ان کی دی ہوئی امانت انہیں واپس کر دوں۔ جس کے سنبھالنے کی مجھ میں قابلیت نہیں ہے۔ مگر لیلی! تم قسمیہ وعدہ کرو کہ میری واپسی تک خلاف عادت کوئی فعل نہ کر بیٹھو گی۔

لیلی" ہاں۔ ہاں۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ جاؤ، اور بغیر قاضی کو ساتھ لئے واپس نہ آنا اور آج ہی مجھے طلاق دینا

سلیم" اچھا، تو...... میں جاؤں، اور تمہارے حکم کی تعمیل کروں،

لیلی، بیشک، اور فوراً جاؤ ___

(۴)

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

سلیم کو گھر سے گئے ہوئے ایک گھنٹہ گذر گیا، اس اثنا میں لیلی کا جوشِ غضب ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب لگی دل میں سوچنے کہ

"کیوں وہ ابھی تک واپس نہیں لوٹے، کہیں قاضی کے یہاں جانے کے
بجائے کسی دوست کے گھر تو نہیں جا بیٹھے؟ اگر قاضی کے یہاں نہ جائیں
تو بہتر ہے، کیونکہ طلاق مانگنے میں میں نے ضرورت عجلت سے کام لیا ہے،
میں جانتی ہوں وہ آزاد طبع ہیں مگر اُن کا دل ایک طفل کے دل کی
طرح صاف اور بے لوث ہے، کیا یہ مناسب نہ تھا کہ میں ان کو
کچھ مہلت دیتی، ممکن ہے کہ نادم ہو کر اپنی عادتوں سے باز آجاتے
خدا کرے وہ قاضی کے گھر نہ جائیں بلکہ راستے ہی سے لوٹ آئیں
اور میرے آگے گڑگڑا کے اپنے گرم گرم شیریں بوسوں سے معافی
مانگیں، تو میں ضرور معاف کر دوں گی،

مگر نہیں نہیں وہ ایک خائن اور دھوکا باز شخص ہے، اب
میں اس کے پھندے میں نہ آؤں گی، مجھے اس سے الگ ہی ہو جانا چاہئے،
میں نے بہت صبر کیا، رات رات بھر میں، ان کے انتظار میں
آنسو بہاتی رہوں۔ اور وہ باہر مزے اڑاتے رہیں، صبح کے قریب
نشے میں چور گھر آئیں، ان ساری مصیبتوں پر میری امانت میں بھی
خیانت روا رکھیں۔ میں کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی، اب
تو طلاق لینا ہی مناسب ہے اور مجھے لازم ہے کہ انھیں یک لخت
بھول جاؤں۔ اور اپنے دل کو پیس کر بغیر دل کے زندگی گزاروں،
ایسا شوہر میری محبت کے لائق نہیں ہے، ان کی حرکتوں سے
ممکن ہے کسی دن دوسری عورت سے شادی کر بیٹھیں۔ اس
حالت میں انسان کیونکر دو عورتوں سے محبت کر سکتا ہے؟ ؏
سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے۔

اپنی افکار و خیالات میں غرق تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے
بجی رسیور اٹھا کے،

لیلیٰ" ہلو۔۔ آپ کون ہیں؟

" میں ڈاکٹر رشید ہوں، آپ بیگم سلیم ہیں۔

لیلیٰ" جی ہاں، ارشاد۔

رشید" میں ..... آپ سے .. بھائی سلیم کے متعلق،

لیلیٰ (گھبرا کے) فرمائیے انہیں کیا ہو گیا؟

رشید" بیگم صاحبہ! میں جانتا ہوں، آپ مضبوط دل خاتون ہیں"

لیلیٰ" (چلا کے) مگر بتلائیے تو وہ ہیں کہاں، کیا افتاد ہے؟
خدارا چھپائیے نہیں، صاف صاف بیان کیجئے۔

رشید" لو ۔ سلیم کا دلخراش واقعہ ..

لیلیٰ" (قطع کلام کر کے) دلخراش، یعنی؟

رشید" یعنی، وہی تو سناتا ہوں، سلیم میرے مطب میں کچھ
دیر پہلے تشریف لائے تھے، چہرے سے بے انتہا رنج و غم نمودار
تھا، مدت کے بیمار معلوم ہوتے تھے۔ میں نے حال دریافت کیا تو
صاف جواب نہ دیا۔ مگر ان کی گفتگو سے اتنا معلوم ہو گیا کہ آپ اُن سے
طلاق کی خواستگار ہیں، مگر وہ آپ کو طلاق دینے سے پہلے مرجانا بہتر
سمجھتے ہیں ---

لیلیٰ" (بے چین ہو کر) بیان تو کیجئے انہیں ہو کیا گیا
ہے، آپ بھی عجب آدمی ہیں، تمہید ہی تمہید میں میری جان نکال رہے
ہیں، اصلی واقعہ بیان نہیں کرتے،

رشید" سنئے، چند منٹ پیشتر وہ یہاں سے روانہ ہوئے
میں کواڑ لگا کے اپنی کرسی پر بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ سڑک پر شور و
غوغا سنائی دیا کھڑکی سے جھانک کے دیکھا، تو ایک ٹرام کھڑی ہے
اور اس کے گرد لوگوں کا اژدحام ہے۔

لیلیٰ" کہیں ٹرام کی زد میں تو نہیں آگئے؟

رشید" بیگم! آپ جانتی ہیں کہ میں ان کا ہم مکتب اور بچپنے کا دوست
ہوں۔ شاید آپ سے زیادہ مجھے غم لاحق ہوا ہے۔ میں آپ سے باتیں کر رہا
ہوں، مگر میرے آنسو نہیں تھمتے۔ سنئے! آپ کے شوہر ٹرام کی زد

یہاں آ گئے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ اس فدائی نوجوان نے خود کو ارادۃً
ٹرام کے آگے جھونک دیا۔

لیلی " (زور سے چلا کے) کیا انہوں نے خودکشی کرلی؟
ہائے ہائے سلیم تمہیں یہ کیا کرنا تھا، میں کمبخت کیوں ایسی خبر سننے
کے لئے زندہ رہی۔

ڈاکٹر رشید نے ٹیلیفون سے لیلی کی گریہ و زاری کی آواز
سنی تو گھبرائی ہوئی آواز سے کہا۔

"گھبرائیے نہیں، انہیں میرے دواخانے میں اٹھا لائے ہیں
اس وقت بیہوشی کی حالت میں ہیں، مگر دل میں خفیف سی حرکت ہے
امید ہے کہ بچ جائیں گے۔

لیلی" میں خود آپ کے مطب میں آجاتی ہوں۔

رشید" نہیں، نہیں، آپ کے آنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے
میں نے ان کو گھر پہنچا دینے کا کل انتظام کرلیا ہے تاکہ خدانخواستہ
اگر مریں تو خود کے گھر ہی میں مریں، ذرا ٹھہریئے۔ میں انہیں ایمبولنس
میں لئے ہوئے پانچ منٹ میں آپ کے دولت خانے پر پہنچ جاتا ہوں۔

لیلی" مگر یہ فرمائیے وہ ابھی تک زندہ ہیں نا، ان کے بچنے
کی امید ہے؟

رشید" جب تک دل متحرک ہے تو بچ جانے کی بہت کچھ
امید ہے، یوں تو موت و حیات اللہ کے ہاتھ ہے، میں ابھی
لے آتا ہوں۔

(۵)

تیمارداری

لیلی نے اپنے شوہر کو گھر سے صحیح و سالم جاتے، اور بحالت
کذائی پٹیوں اور بانڈیج میں بندھا ہوا، جنازہ نما کھٹولے پر لدا
ہوا آتے دیکھ کر منہ پیٹ لیا۔ اور زار و قطار رونے لگی۔ ایمبولنس
والوں نے سلیم کو اس کے خواب گاہ میں لاکے بستر پر لٹا دیا۔ لیلی،
ڈاکٹر سے بعاجزی کہنے لگی؛

"ڈاکٹر صاحب! میں قسمت کی جلی یہ منت التجا کرتی ہوں
کہ آپ اپنی پوری کوشش ان کے بچا لینے میں صرف کردیجئے میں
آپ کے ہاتھ چومتی ہوں، چرنوں پہ گرتی ہوں۔

رشید (لیلی کے الفاظ سے بے حد متاثر ہو کے) بیگم صاحبہ!
....آپ جانتی ہیں۔ سلیم میرے عزیز ترین دوست ہیں، بھلا
میں ان کے علاج میں کوتاہی کروں گا؟ معاذ اللہ، اب آپ مہربانی
فرما کے تھوڑی دیر کے لئے کمرے سے باہر تشریف لے جائیے،
اور مجھے اچھی طرح ان کے پورے جسم کا معائنہ کرلینے دیجئے
یہ کہہ کے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ اور زخموں سے چور مریض
کے ساتھ خلوت گزین ہوا۔

تقریباً پاؤ گھنٹے کے بعد، ڈاکٹر رشید کمرے سے باہر نکل آیا
کیا دیکھتا ہے کہ لیلی دروازے کے قریب دیوار کے سہارے کھڑی
ہے چہرہ آنسوؤں سے تر ہے اور سر سے پیر تک بید کی طرح لرز رہی
ہے۔

لیلی" (دیوانہ وار رشید کے کوٹ کا گریبان تھام کے)
"ڈاکٹر صاحب میرے دل کو تسکین بخشئے، کیا حال ہے، بچ جائینگے نا؟

رشید" میں نے ضروری علاج کردیا، جس سے ان کے دل
کی حرکت منتظم ہوگئی ہے یہی ان کے اچھے ہو جانے کی دلیل ہے، اطمینان
رکھئے۔ اور پورا اطمینان رکھئے، میں ایک ہزار روپے کی شرط
لگاتا ہوں کہ تمہارے شوہر خطرے سے بالکل نکل گئے۔ یہ سنتے ہی
لیلی مارے خوشی و غم کے بیہوش ہوگئی، کیونکہ اس کا نازک دل بہ یک
وقت رنج و مسرت کا متحمل نہ ہو سکا، ڈاکٹر رشید نے فوراً تھام
لیا۔ اور اٹھا کے بستر پر لٹا دیا۔ لخلخہ اور امونیا سنگھا کے ہوش میں لایا

مگر کمزور ہو گئی تھی، جب کچھ حواس درست ہوئے تو ڈاکٹر نے رخصت لی اور تھوڑی دیر بعد آنے کے وعدہ سے روانہ ہو گیا، جس کے جانے کے بعد لیلی اپنے فرش سے اٹھی اور آہستہ انگلیوں کے سروں پر چلتی ہوئی سلیم کے بستر کے قریب آئی اور اس کے سرہانے بیٹھ گئی، سلیم ابھی تک بیہوشی کی حالت میں تھا جس کو ہوشیار کرنا مناسب نہ جانا، مگر اس کے تمام جسم کو بندھا ہوا دیکھ کر خاموش نہ رہ سکی، آنسوؤں کے بند کھول دیئے اور زور سے رونے لگی، تھوڑی دیر کے بعد سلیم بخار کے ہذیان میں، لیلی لیلی کہنے لگا، جس سے لیلی اس کا بندھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کے نہایت گرم جوشی سے چومنے لگی۔ تو سلیم نے آنکھیں نیم باز کیں اور ٹوٹی آواز میں کہنے لگا:-

"لیہ... لی... ے... ری... پیا... ری لیلی

لیلی "(خوش ہو کر) حاضر ہوں، میری جان، فرمائیے کیا ارشاد ہے

سلیم "مجھے... معاف... کر... میرے... گنا... ہوں... کو بخش... دے ـــ یہ کہہ کے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

لیلی "(روتی ہوئی) جان لیلی! میں نے تمہاری ساری باتیں بھلا دیں، بخوشی معاف کر دیا۔ بخش دیا۔ تم مجھے معاف کرو، اور میرے لئے زندہ رہو ؎

تم جان ہو ہماری اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے، ایمان ہے تو سب کچھ

سلیم نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں، اور پلکوں سے خود کے منہ کے قریب آنے کا اشارہ کیا، جب لیلی جھکی تو آہستہ آہستہ دونوں ہاتھوں کو اٹھا کے اسے آغوش میں لے لیا اور اسکے لبوں کو زور سے چوما

لیلی "شکر ہے آپکے ہاتھوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچی۔

سلیم "سن لو، جو ہم، بیان کریں، پھر کہاں یہ بات چلتی ہوئی، ہمارے، دہن، میں، زبان ہے

پیاری! یہ جو کچھ ہوا... وہ سب... تمہارے لئے.. ہوا ہے... میں نے تمہیں... طلاق دینے... سے پہلے... اپنی زندگی کو... طلاق دینا... پسند کیا... اُف میرا... تمام جسم... زخموں سے... چور ہے... لیلی!... اب بھی تم... طلاق لینے پر اڑی ہوئی ہو، بولو؟

لیلی "نہیں پیارے، طلاق لینا تو کجا، میں تو لونڈی سے زیادہ ذلیل ہو کر تمہارے ساتھ رہنا پسند کرتی ہوں، بس تم میرے لئے زندہ رہو،

سلیم "قسم.. قسم کھاؤ... کہ دوبارہ... طلاق کا نام... زبان پر نہ لاؤ گی... اور مجھے... چھوڑنے کا... مطلق خیال... نہ کرو گی۔

لیلی "میں اللہ اور ہر عظیم الشان ہستی کی قسم کھا کے کہتی ہوں کہ میں ہرگز اور زنہار تم سے جدا ہونے کی خواہش نہ کروں گی۔

سلیم "ہر حالت میں؟

لیلی "بیشک ہر حالت میں، اور جس حالت میں مجھے رکھو گے اسے منظور کر لوں گی۔

یہ سنتے ہی سلیم دونوں ہاتھوں کو بڑھا کے جسم پر بندھے ہوئے پٹے کھولنے لگا، لیلی اس کی اس حرکت کو حیرت اور اچنبھے سے دیکھنے لگی، پھر یکایک بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"پیاری! میں بالکل اچھا ہوں، تم نے ہی مجھے یہ کھیل کھیلنے پر مجبور کیا تاکہ تمہیں بچا لوں اور طلاق کی لعنت سے باز رکھوں!

لیلی کا چہرہ متغیر ہو گیا، آنکھوں میں غم و غصے کے آثار نمایاں ہوئے، بگڑ کر کہنے لگی۔

"تمھیں یہ مناسب نہ تھا کہ میرے دل پر اس طرح چرکے لگاتے اور میرا تماشا دیکھتے ؟

سلیم" دل رُبا! حکیم بیمار کو اچھا کرنے کی غرض سے اسے درد اور تکلیف پہنچاتا ہے، کڑوی دوائیں پلاتا ہے، تمھارے مرض طلاق خواہی کا اس کے سوا کچھ علاج ہی نہ تھا کہ میں اس کا اسطرح آپریشن کروں۔ (لیلی کو زیادہ مکدر دیکھ کے) اب تم اس لئے رنجیدہ ہو کہ ٹرام نے مجھے روندا کیوں نہیں؟ اور میں مرا کیوں نہیں؟

لیلی (زبردستی مسکرا کے) تمھارے اُس دوست ڈاکٹر پر خدا کی مار۔

سلیم" اجی! وہ بیچارہ اس فعل پر راضی ہی کب تھا، میری منت والتجا پر بادلِ ناخواستہ آمادہ ہوگیا، جب کہ میں نے یہ کہہ دیا کہ ہمارے درمیان مفارقت سے بچنے کا یہی ایک علاج ہے۔

لیلی" سچ پوچھو تو مجھے اب تم سے نفرت ہے۔

سلیم" میں ہرگز نہ مانوں گا، کیونکہ میں نے تمھاری محبت کا اچھی طرح امتحان لے لیا ہے، جسکو میں مرتے دم تک نہ بھولوں گا۔

لیلی" مگر تم اُس محبت کے مستحق کب ہو؟ ؎

تم پارسا سہی مگر اتنا تو سوچ لو
کچھ دیکھ ہی لیا ہے کہ دل بدگماں ہوا

سلیم" لیلی! سنو، اور اچھی طرح سُن لو، میں کہتا ہوں، اور سچ کہتا ہوں" ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ آج سے میں خدائی خوار اور ناہنجار ہوں گا۔ اگر خود کو تمھاری محبت کا اہل اور مستحق ثابت نہ کردوں، اس تمھاری سچی محبت اور وفاداری کے بعد جن کو میں نے اچھی طرح جانچ لیا ہے۔

لیلی" (ناک بھوں چڑھا کے) دیکھیں گے۔

سلیم" آج ہی سے۔

یہ کہتے ہوئے لیلی سے لپٹ گیا۔ دونوں ایسے چمٹے گویا برسوں کے بچھڑے ہوئے تھے، اس لجاؤ کو، ڈاکٹر رشید کے قہقہے نے سلجھا دیا، شرما کے دونوں الگ ہوگئے۔

رشید" مسٹر سلیم اور مسز سلیم کے ملاپ پر صد ہا مبارکباد

انتہی

ہاں ہاں

از جناب سید طالب علی صاحب عابد ام۔اے الٰہ آبادی

وہ دیکھو وہ نکلا سحر کا ستارا
زمیں بھی ہماری فلک بھی ہمارا
وہ سمٹا شب دزد پرور کا دامن
وہ بہنے لگا سُرخ چاندی کا دھارا
نیا زلزلہ قصر دولت میں آیا
دیا بڑھ کے مزدور نے پھر سہارا
شکاری نے تھرا کے بندوق رکھ دی
کچھ اس ٹھاٹ سے شیر زخمی ڈکارا
رہا تک جو تھے ناخدا اپنے منہ سے
وہی ڈھونڈتے ہیں سہارا ہمارا
نئی اپنی بستی بساؤں گا اب میں
عدو کے لہو سے بناؤں گا گارا
میں پیاسا ہوں لہو کا ہوں دیوانہ ہوں میں
جہاں جس نے ٹوکا وہیں اس کو مارا

عراقی سٹیٹ ریلوے

عراقی اسٹیٹ ریلوے - نجف اشرف - کربلائے معلّی - کاظمین و بصرہ کے مقامات مقدسہ کے زائرین کے لئے تیز ترین آرام دہ ، ارزاں ترین ذریعہ سفر ہے - مشہد مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کو جاتے ہوئے یا واپسی پر عراق کے مقامات مقدسہ کی زیارت کیجئے - اس طرح آپ کو دو مختلف زیارتوں کے اخراجات میں کفایت ہو جائیگی -

خاص آسانیاں اور تخفیف شدہ کرائے

حجاج کو ۱۰۵ ایام کے لئے خاص کوپن ٹکٹ مل سکتے ہیں جنکی رو سے ۵۰ کلو سامان مفت لے جایا جاسکتا ہے تفصیل یہ ہے :-

دوسرا درجہ تیسرا درجہ بک "A" سے ماقل (بصرہ) سے کربلائے معلّی اور بہر لیند ادکاظمین (الجوادین سٹیشن) تک اور

۴۲ روپے ۱۴ روپے کاظمین سے سامرہ اور واپس براہ کاظمین ماقل (بصرہ) تک سفر ہو سکتا ہے -

۴۲ روپے ۱۲ روپے آٹھ آنے بک "B" سے ماقل (بصرہ) سے کربلائے معلّی اور بہر لیند ادیا کاظمین (الجوادین سٹیشن) اور واپس ماقل تک سفر ہو سکتا ہے -

تین برس سے کم عمر کے بچے مفت اور بارہ برس سے کم آدھے ٹکٹ پر

ماقل (بصرہ) ہمارا حج ایجنٹ حجاج کو ملتا ہے -

تمام اہم مقامات مقدسہ کے درمیان روزانہ ٹرینیں نجف اشرف سے براہ راست مدینہ منورہ کا ایک نیا خشکی کا راستہ جو صحرا میں سے ہو کر گزرتا ہے - کھولا گیا ہے) جاتی ہیں - یہ عراق گورنمنٹ کے زیر انتظام ہے - راستہ نجف اشرف سے براہ جمیمہ و حنیل کے کرائے یہ ہیں -

دوسرا درجہ ۲۰۰ روپے تیسرا درجہ ۱۳۴ روپے

مفصل معلومات ٹکٹ - حج - کوپن - بکیس وغیرہ مختلف سب ایجنٹوں سے بمبئی اور کراچی میں مل سکتے ہیں - جنکے پتے یہ ہیں -

(۱) مولوی محمد باقر حاجی ویرجی جمال کا مسافر خانہ، جیل روڈ عمر کھاڑی بمبئی

(۲) دی آنریری جائنٹ سکریٹری فیض پنجتنی - پالا گلی بمبئی -

(۳) مسٹر ای - ای لوٹیا مانڈوی کویلی واڑہ بمبئی ۳

(۴) حبیب جی رحمت کمار دار کراچی -

(۵) مسٹر عبد العلی شیخ عیسیٰ جی معرفت میسرز یوسف علی علی بھائی کریم جی اینڈ کو نیپر روڈ - کراچی

(۶) دی آنریری سکریٹری فیض پنجتنی معرفت حاجی جیٹھا بھائی گوکل کو دی گارڈنز - کراچی

چکوری مرحومہ اور اس کا کلام

از مسٹر شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایم۔اے۔ ایل۔ایل۔بی علیگ ایڈووکیٹ لکھنؤ

ہندی شاعری میں کیا جادو ہے؟ اس کو ذرا اپنے دل سے پوچھئے۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ دنیا کی زبانوں کا کوئی لٹریچر ہندی شاعری سے بہتر جذبات اور پھر سچے جذبات نہیں پیش کرسکتا۔

ہندی شاعر کا کام اردو شاعر سے زیادہ مشکل ہے۔ اردو نے فارسی کی [illegible] کی ہے۔ اور اس میں اظہار عشق مرد کی طرف سے ہے اور پھر معشوق بھی مجازاً "مرد" ہے۔ مگر حقیقتاً عورت، لہٰذا مرد اپنے مدعا کو عورت کے سامنے زیادہ بیباکی سے پیش کرسکتا ہے۔ لیکن ہندی شاعری عورت کی زبان اور عورت کا دل لے کر جذبات کی مصوری کرتا ہے۔ عورت کی فطرت میں شرم و حیا کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ لہٰذا اس کو ہر ہر قدم پر اپنی پوزیشن کی نزاکت کا احساس رہتا ہے۔ اگر جذبات ذرا بھی عریاں ہوجاویں یا سر مو جادہ حیا سے تجاوز کرجائیں، تو شعر میں اثر باقی نہیں رہتا۔ دوسرا خصوصیت ہندی شاعری کی یہ ہے کہ وہ مبالغہ سے زیادہ کام نہیں لیتی اور غلو کے پہلوؤں کو دبا تی جاتی ہے اور اپنی سحر طرازیوں کو صرف جذبات کی دنیا میں محدود رکھتی ہے۔ اور چونکہ ان جذبات [illegible] کا گہرا تعلق واردات [illegible] دل سے ہوتا ہے۔ [illegible] وہ سننے والے کے دل پر [illegible] کا کام کرجاتے ہیں۔

ہندی شاعری کا میدان بنسبت مرد کے عورت کے [illegible] زیادہ وسیع ہوتا ہے اور جہاں تک کہ جذبات کا تعلق ہے عورت مرد سے بہتر اور زیادہ صداقت کے ساتھ اس کا اظہار کرسکتی ہے۔ دور حاضر کی ہندی شاعرات میں چکوری مرحومہ نے اقلیم سخن پر جو کامرانی کی، اُس کا تذکرہ ہندی لٹریچر کی تاریخ جدید میں ایک باب ہے اور ایسا باب جو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خود چکوری کے تخلص میں جو سوز انگیز تغزل بھرا ہوا ہے وہ دلوں کو بے چین کرنے کیلئے کافی ہے۔ چکوری کا نام رامیشوری دیوی تھا اور اس کا سلسلہ نسب شمالی ہندوستان کے ایک نامور خاندان سے ملتا تھا۔ وہ انگریزی ادب میں ایم۔اے تھی اور ایل۔ٹی کی ڈگری رکھتی تھی اس نے زیادہ عمر نہیں پائی اور شباب کی آخری بہاریں بھی نہ دیکھ پائی تھی کہ ناپید ہوگئی۔ اس کی شادی پروفیسر گوئل آگرہ کے ساتھ ہوئی تھی مگر شادی کے تھوڑے ہی زمانہ بعد چل بسی۔ [illegible] ہے۔ جو خدا کے پیارے ہوتے ہیں وہ لہلہاتے ہی جاتے ہیں۔

اس کے کلام میں اگر سوز و درد تھا تو جذبات میں قوت و صداقت بھی۔ زبان میں لطافت تھی اور روانی۔ ہر آمد میں آورد اور [illegible] آورد میں آمد۔ اس کے ایک کہنہ مشق، اور خوش گو شاعرہ ہونے کا ثبوت ہے، تخیلات میں رفعت ہے تو عورت کے نازک پوزیشن کا لحاظ کرتے ہوئے، خودداری اور رکھ رکھاؤ بھی جو کچھ کہتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بیتی ہے جگ بیتی نہیں۔

دوشیزہ کا دل ایک عبادت گاہ ہے۔ جس میں وہ فطرت کی پرستش کرتی ہے۔ اس کے جذبات میں ... ٹھیس نہیں لگی ہو اس میں شک نہیں کہ اس میں اگر شرم وحیا ہے تو اس کے ساتھ شوخی بھی۔ وہ فطرت کی ہر چیز کو اس کی فطری جاذبیت کے تماشا دیکھتی ہے اور اس سے ایک معصومانہ لطف اٹھاتی ہے۔ محبت کیا ہے؟ وہ کیا جانے؟ پھر محبت اس کے ناآشنا دل کو اپنا احساس کیونکر کراتی ہے۔ ذرا چکوری کی زبان سے سنیئے۔

कुछ कहो कहाँ से पाये हो
मतवाली व्याकुलता ले कर।
मरकत के प्याले में भर दो
किस की मादकता ले कर।

مطلب: معشوق سے خطاب ہوتا ہے اور پوچھتی ہے کہ بتاؤ کہاں سے یہ متوالی آنکھیں کر کے آئے ہو؟ آنکھ ایک جام ہے جس میں محبت کی شراب بھر دی گئی ہے۔

शैशव के सुन्दर आँगन में
तुम चुपके से आये कहाँ?
भोले भाले चंचल मन में
लज्जा रस बरसा गये कहाँ?

مطلب: پوچھتی ہے آخر میرے خانہ دل کے صحن میں تم چپکے سے کیوں کر آ گئے۔ میرا دل تو بھولا بھالا اور ہاں چنچل تھا۔ اس میں (محبت) کی حیا؟ کا دریا کس نے بہایا؟ یوں تو عورت کی فطرت میں شرم وحیا ہے لیکن محبت بھی ایک شرم پیدا کرتی ہے۔

ले आए चुरा किस हेतु कहो
वह जीवन श्याम तपस्वी का!
निष्कपट अलौकिक निर्विकार

शुचि सुन्दर और मनभावन था

مطلب: اس کے بعد پوچھتی ہے کہ یہ بتاؤ کہ میں تپسیا کرنے والی تھی۔ میں تو پرستار فطرت تھی۔ میرا دل تم کیونکر چرا کر لے گئے؟

اب اپنے دلکو بتلاتی ہے کہ وہ سیدھا سادا پاکیزہ۔ گناہوں سے پاک صاف وحسین تھا۔ آہ ایسا دل تم نے کیونکر اتنی محکم ومستحکم گرفت میں لے لیا؟

उस ओर से नन्दन वन में
जिस में न पुष्प थे कलियाँ थीं
यह भाव नहीं प्रस्फुटित न थे
केवल प्रमोद रंग रलियाँ थीं

مطلب میرا دل ایک خوبصورت بن تھا جن میں کلیاں ہی کلیاں تھیں۔ ہنوز پھول نہ تھے۔

دل کو جنگل کہا کیوں؟ اس لئے کہ اس میں تمناؤں آرزوؤں کے جھنڈ تھے۔ یہ تمنائیں کلیاں تھیں جو نا ہنوز کھلی نہ تھی۔

یہ کہہ کر بعد اس کے برعکس خیال کو کس لطف کے ساتھ نظم کرتی ہے اور کہتی ہے کہ میرے دل میں ابھی تک کوئی آرزو نہ تھی بلکہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ سرور وشادمانی، سکون واطمینان کا دور دورہ تھا۔

ایک دوشیزہ کے دل کی اس سے بہتر اور کیا تصویر کھینچی جا سکتی ہے؟ سبحان اللہ!

یہ مد نظر رہے کہ اردو میں رنگ رلیوں کا محاورہ انتہائی تعیش میں جذبے کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ اور کسی قدر ذم کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ لیکن ہندی میں یہ اپنے فطری معنی میں استعمال ہوتا ہے رنگ رلیوں سے مراد ایک دور مسرت وشادمانی۔

लज्जा का अंजन लगा दिया
उन चंचल हठीली आँखों में।
ले गये लूट स्वातन्त्र्य संयम
हे हठी लुटेरे आँखों में।

مطلب: اب دیکھئے کہ احساس محبت کیونکر کرایا جاتا ہے ـــ
پہلے مری آنکھوں میں شرم کا سرمہ لگایا گیا۔ کیونکہ میری آنکھ شوخ چنچل اور ہٹیلی تھی۔ اس لئے محبت نے حیا پیدا کرکے خودداری کا احساس کرا دیا۔ اور آہ او غارتگر سکون، تو تو ہزاروں لاکھوں میں فرد تھا۔ تو میرا سکون و قرار لوٹ لے گیا۔

اب کیا تھا؟

مطلب:۔ میرے ننھے سے دل نے آخر پہچان ہی لیا کہ محبت کیا ہے ـــــــ

محبت کے بعد

محبت کے احساس کے بعد زندگی ایک معمہ ہو گئی اور معمہ جس کو حل کرنے سے نتیجۂ فکر قاصر ہے۔ پاکیزہ جذبہ دل میں کیونکر ترقی کرتا ہے اور اس ترقی کی انتہا کیا ہے؟ شاعر خود ہی نہیں جانتا۔

उस सरल हृदय में यह कैसा
अभिलाषाओं का द्वन्द्व हुआ!
उत्थान हुआ या पतन हुआ
दर्द हुआ कि आनन्द हुआ!

وہ متحیر ہے کہ اس سادے دل میں خواہشوں کا دریا کیوں کر اُمڈا؟ مگر یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ دریا بڑھا یا گھٹا اسکے بعد اس کا بھی

احساس نہیں ہوتا کہ مسرت ہوئی یا رنج۔ سکھ پہنچا یا ایذا۔
یہ بے حسی رفتہ رفتہ ترقی کرکے تخیلات و تصورات پر بھی تسلط کر لیتی ہے۔ لیکن اس کا احساس ضرور رہتا ہے کہ یہ دل، کسی کی لو ضرور لگائے ہوئے ہے اور اس کے لئے ایک طوفان خیز سمندر کی طرح متلاطم ہے۔
عشق عشق کی کیفیات کو کیا خوب نظم کیا ہے۔
مطلب۔ محبت جوانی کی امنگوں کے ساتھ ایک نرالی قسم کی خلش پیدا کر دیتی ہے جو انسان کے ساز دل کے تاروں کو چھیڑ کر اسکو بے کل کر دیتی ہے۔

آہ یہ وہی زمانہ ہے کہ:۔

यौवन हाथ पसार माँगता
यहाँ यौवन का दान?

جوانی ہاتھ پھیلا کر جوانی سے بھیک مانگتی ہے
محبت کیا ہے؟ سنئے!

इसी क्षणिक उन्माद रुदन की
परिभाषा है प्यार,
जिस में सीमित को उच्छ-
वास में छिपि सांस की बेला!

مفہوم:۔ وہ کہتی ہے کہ دنیا میں محبت سب کو عزیز ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس برباد کرنیوالی جذبہ کی تجارت کو کیوں فروغ دیا جاتا ہے اور کیوں انسان یہ جانتے ہوئے کہ یہ آگ ہے اور اس کا کام جلانا اس کے دہکتے ہوئے شعلوں میں پھاندتا ہے محبت کا انجام غم ہے۔ اور اس خواب کی تعبیر کچھ نہیں۔ اور اگر ہے تو یہ کہ محبت کی زندگی غم کی ایک تاریک چادر میں ملفوف ہے

لہٰذا انسان کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ جوانی جو اُمنگوں کی مسرت بخش صبح سے شروع ہوتی ہے ۔ غم کی شام میں ختم ہوجائیگی ۔

محبت میں یاس کی ایک تصویر کھینچی ہے

مطلب ، آہ ! آہ !! - یہ رشتۂ الفت کو کس نے توڑ دیا ؟ یہ محبت کی مالا کے موتی کس نے بکھرا دیئے ؟ یہ زندگی کی آگ کو شعلہ زن کس نے کر دیا ۔ میرے اشک خونیں آنسو نہیں بلکہ یہ اُمید کے دل کے ٹکڑے ہیں ۔

آہ ! یہ خواب میں (جوانی کا خواب) کس نے مجکو زہر کا پیالا پلایا ؟

زہر کا پیالا پلایا یعنی محبت کا احساس کرایا ۔ محبت گویا سم ہلاہل ہے جو انسان کی زندگی کو ختم کر دیتا ہے ۔ محبت کی تلخیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے زہر کی تشبیہ کس قدر لطیف ہے ۔

عنفوان شباب میں انسان خود کو بھولا ہوا ہوتا ہے اور اسی بھلاوے میں جوانی کے بیش بہا لمحات گزرتے جاتے ہیں لیکن جب محبت کا دست بیداد اس پر چل جاتا ہے اور اس کی اُمنگیں کُند چھری سے ذبح ہونے لگتی ہیں تو اس کو ہوش آتا ہے ، اس وقت اسکو کچھ تو اپنے بھولے پن پر ترس آتا ہے اور کچھ اپنے حال زار و نزار پر رونا لیکن اب کیا ہوتا ہے ؟ محبت اپنے شکنجہ میں اس کو لے چکتی ہے ۔

مطلب :- وہ کہتی ہے ۔ او ظالم تو میری تمناؤں کی ہری بھری کھیتی پر اپنی محبت کی بجلی نہ گرا ۔

میرا طائر دل تیرے دام میں پھنس چکا ۔ پھر خدارا تو قید نہ کر اپنی محبت کی آہنی زنجیروں میں کیوں جکڑ رہا ہے ؟

درد میں اک لذت ہے اور اُس لذت کا خوگر دل حریص نہیں چاہتا کہ وہ درد اسکے پہلو سے کبھی جدا ہو ۔ ملاحظہ ہو !

مطلب ، او بے رحم تو میری درد کی لذت کو مجھ سے نہ چھین ۔ میں اس زخم کے لئے کوئی مرہم نہیں چاہتی ۔

سچے عاشق کے لئے اس کی خانہ ویرانی اور بربادی بھی مسرت و سکون سے خالی نہیں ۔ عجب خیال ہے اللہ اکبر ، سنیئے

مطلب ! میں نہیں چاہتی کہ میری کوئی تمنا پوری ہو ، کوئی آرزو بر آئے ۔ اچھا تو پھر ان حسرتوں کے ویران چمن کو ویران ہی رہنے دے ۔ اور مجھ کو جھوٹی اُمید دلا کر میرے اُس سکون و قرار کو برباد نہ کر ، جو مجھ کو اس عالم یاس و ہراس سے حاصل ہے ۔

فراق کی رات بھی عجیب رات ہے ۔ دیکھئے چکوری اپنی رات کیوں کر کاٹتی ہے ؟

" اے صبح کے جھلملاتے ستارو ! ذرا ٹھہر جاؤ کہ میں شب فراق کی اس آخری گھڑی کو اپنے آنسوؤں کا تحفہ پیش کر دوں ۔

اور ہاں ذرا ایک بار پھر اپنے تمناؤں اور حسرتوں کے گراں بہا زیور سے اپنے دل کو سنوار لوں ۔

یہ چکوری کے کلام کا مختصر انتخاب ۔ میں نے جذبات کی ترجمانی کی انتہائی کوشش کی ہے مگر جو سوز اصل ہندی کلام میں ہے افسوس ہے کہ اس کی ترجمانی میرے امکان میں نہیں ۔ چکوری آج ہم میں نہیں لیکن اسکا کلام دور حاضر کی ہندی شاعرات کے تذکرہ میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا ۔

یہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں ؟
بن دیکھے جن کے آنکھیں اپنی ترستیاں ہیں ۔

ہندوستانیوں کا اسلام

از عزیزی جمیل الزماں خاں تقی آفریدی

اے او قومِ مسلم کے علم بردارِ آزادی / مٹا جاتا ہے تیری قوم کا پندارِ آزادی

ترا ہم قوم ڈٹ کر قوم کے خطرے مٹاتا ہے / مگر تو ہے کہ اپنی قوم کو بزدل بناتا ہے

غیورِ قومِ آفریدی کو جا کے دیکھ سرحد پر / کہ جس کا فرد مٹ جاتا ہے اپنی آن پر کٹ کر

فقط اپنے ہی بل بوتے پہ اُٹھ جاتے نہ عثمانی / تو اُن کی گرتا دھڑتا آج ہوتی قوم نصرانی

غیورِ قومِ مسلم ہر گھڑی اک رنگ لاتا ہے / ذرا سا ملکِ ایران روس کو آنکھیں دکھاتا ہے

دہل جاتا ہے یورپ آج بھی احرار ترکوں سے / ملا سکتا نہیں آنکھیں کوئی احرار ترکوں سے

گئے گزرے زمانے میں عرب کیسے سنبھلتے ہیں / عراقی کس طرح سے آج بھی تیور بدلتے ہیں

سبق آموز ہے دنیا کو اہلِ فلسطیں اسدم / یقیناً روحِ ایوبی اٹھی ہے بہرِ کیں اسدم

او ننگِ قوم! تجھ سے آج ہے اقوام کو خطرہ!

"مگر ہندوستاں میں ہی ترے اسلام کو خطرہ"!!

دیپک راگ

از دکھی پریم نگری

ٹپ! ٹپ ٹپ!!

کینہ کے درخت کی گلابی پنکھڑیوں نے حسین چشمہ میں ترنم پیدا کیا!!

اسی درخت کی جڑ سے ٹکی ہوئی سوبھا اپنی نازک انگلیوں سے پانی میں لہریں پیدا کر رہی تھی۔ کبھی کبھی خوش ہو کر تالی بجانے لگتی اور اپنی خوبصورت حنائی ہتھیلیوں سے فضا میں رنگینی پیدا کر دیتی۔ سوبھا اپنی زندگی کی پندرہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں مست ہرنی کی آنکھوں کی طرح بے باک تھیں۔ اس کے ریشم کی طرح ملائم بال اس کے گھٹنوں تک آتے تھے۔ اس کے رخساروں پر جوانی کھیل رہی تھی اور اس کے گداز سینے میں کافر شباب سانسیں لے رہا تھا۔

وہ اپنے باپ کی اکلوتی لڑکی تھی اس کا باپ بھیرو ایک متمول کسان تھا اسی لئے وہ آزاد تھی، اپنی طبیعت کی مالک۔ وہ جہاں چاہتی، جو چاہتی کرتی۔ کوئی روکتا ٹوکتا نہ تھا۔ اس کے ماں باپ کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ چلچلاتی دھوپ میں ان کے لئے بھوجن اور ٹھنڈا پانی لے آتی تھی۔ سوبھا کا ہنس مکھ چہرہ اس کے والدین کی تمام مشقت بھلا د۔۔ ۔ ان کے لئے سوبھا کا حسن اس کی مسکراہٹ، اس کا شباب ایک رنگین نغمہ تھا۔ جو ہمیشہ فضا میں پھیلا رہتا تھا۔ چشمہ کی خوشگوار آواز کی طرح جوان کے گھر کے پاس سے ہوتا۔ نرسیندر (جو گانوں کے زمیندار تھے) کے باغ میں گزرتا ہوا ندی میں جا ملتا تھا۔ نریندر بابو بڑے ہی متمول زمیندار تھے پورے قارونِ وقت انھوں سونا زمین تلے دبا رکھا تھا کیونکہ وہ اکیلے تھے۔ جوانی میں انھوں نے ایک تارا نامی بیسوا کو گھر میں ڈال رکھا تھا پھر نہ جانے کس بات پر نکال دیا تھا۔ انہوں نے یہ باغ بنوایا تھا اور اس کا نام سکھ مندر رکھا تھا۔ اس میں طرح طرح کے پرند جمع کئے تھے۔ انھیں نادر چیزیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا! ایک روز وہ اپنے محل نما گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے کانوں نے ایک درد بھری رسیلی اور مدھر تان سُنی۔ جس نے ان کے پُرانے جسم کو لرزا دیا۔ وہ باہر نکل آئے اور دیکھا کہ ایک گڈریا بانسری بجا رہا ہے۔ نغمے اس کی بانسری کو گھیرے ہوئے ہیں اور خود موسیقی بانسری کی لے پر رقص کر رہی ہے۔ نریندر بابو اس نوجوان گڈریے کے قریب آ گئے۔ اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "رشک نغمہ! تمھارا کیا نام ہے اور کہاں رہتے ہو۔ میرا نام بندو ہے مہاراج، اور میں پاس کے گانوں میں رہتا ہوں۔ نوجوان گڈریے نے جواب دیا۔

حسین نوجوان، تو نے یہ وجد آفریں تانیں کس سے سیکھیں! نریندر نے پوچھا۔

میں نے یہ تانیں کوئل کی کوک، پپیہے کی پی کہاں، کلیوں کی چٹک درختوں میں گذرتی ہوئی نسیم کی سرسراہٹ، دکھی دلوں کی دھڑکن، اور بہتے ہوئے ندی کے پانی کے راگ سے حاصل کی ہیں" بندو بولا۔

نریندر نے حیران ہو کر پوچھا "کیا تم گا بھی سکتے ہو؟" جواب
میں بندو کی آواز راگ کے روپ میں نکلنے لگی۔ اور مست نریندر
اپنی بوڑھی رگوں میں جوان خون کی حرکت محسوس کرنے لگا۔ بندو
کی قسمت نے اس کی کتاب زندگی کا پہلا ورق اُلٹا۔ یہ معلوم کر کے
کہ بندو کا کوئی ماں باپ نہیں ہے۔ اُس کو بھی اپنے ملازمانِ
خاص میں رکھ لیا۔ بندو کے ذمہ فرصت کے وقت نریندر کا دل
بہلانا اور بانسری بجانے کا کام تھا۔ غریب گڈریا ایک نئی دنیا
میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں ریشمی لباس، لذیذ غذائیں اور ہر طرف
آرام ہی آرام تھا۔ جہاں تکلیف اور محنت نے کبھی جھانک کر
بھی نہ دیکھا تھا۔ کچھ دن بعد نریندر نے گڈریے کو ایک سونے
کی بانسری دی۔ جس پر چاندی کا ایک مور رقص کر رہا تھا۔ یہ
بانسری اُس نے کسی چینی سوداگر سے خریدی تھی۔

بندو نے سلام کر کے اُس سے بانسری لے لی اور
بجانا چاہی، لیکن اس میں سے کچھ عجیب بے تکے راگ نکلنے لگے
پہلے تو نریندر کچھ حیران سا ہوا۔ پھر غصہ میں کہنے لگا کیوں کیا
تم یہ بانسری نہیں بجا سکتے؟ بندو نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ ابھی
امیرانہ زندگی سے مانوس نہیں ہوا ہے۔ دوسرے وہ بے دل
ہے۔ کیونکہ اس کو یہ زندگی بھاتی نہیں۔ اُسے تو وہی آم کے درخت
پھٹا کمبل اور بہتے بانس کی نلی چاہئے اور کھلی ہوا۔ ہاں ٹھیک ہے،
نریندر نے کہا۔ دیکھو یہاں سے تھوڑی دور پر ہمارا باغ "سکھ مندر"
ہے۔ وہاں چلے جاؤ۔ وہاں کی ہر چیز تمہیں راس آئے گی۔ میں تمہاری
وہی تانیں ایک دفعہ پھر سننا چاہتا ہوں۔ جب مجھے ضرورت ہوگی
تم کو بلا لیا کروں گا۔ اس طرح نریندر بابو کا "سکھ مندر" صرف
اس شاعر دل اور طلسم ربا انگلیوں والے گڈریے کے لئے مخصوص ہو گیا۔

ـــــــــــــ

البیلی سوہا آخر ایک روز اپنے باغ کے پیڑے اور کنیر کے
پھولوں سے اُکتا گئی۔ اس کی ہر لحظہ بدلنے والی طبیعت اس یکرنگی کو
کب تک برداشت کرتی؟ کنیر کے پھولوں میں اس کے لیے کوئی جاذبیت
نہ رہ گئی تھی۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ اس کے لیے ایک شور بے معنی تھا
اسی سمے چشمہ نے آہستہ سے اس کے سیپ جیسے کانوں میں کہا
"آ۔ چل میرے ساتھ!" اور وہ بے اختیارانہ چشمے کے شفاف
پانی کی طرح رقص کرتی نریندر بابو کے "سکھ مندر" میں پہنچ گئی
وہ باغ اُسے بہت بھایا! اور وہ گھومنے لگی!

بندو چشمہ کے کنارے بیری کے درخت کے نیچے افسردہ
بیٹھا تھا کیونکہ اتنے دن کی رہائش نے اس سے بانسری کے
الاپ بھلا دیئے تھے۔ راگ تھے۔ سب تھے لیکن اب ان میں
وہ کیف نہ تھا۔ وہ بہت مضطرب تھا۔ نہایت بے چین! کبھی کبھی
اُس کے دل میں آتا کہ وہ یہاں سے بھی نکل بھاگے کیونکہ اس کی
تانیں "سکھ مندر" میں گونج نہ سکتی تھیں! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ
بانسری بجانا ہی بھول گیا تھا۔ اُس نے بانسری پر نظر کی وہی
بانسری تھی۔ اس نے بجانے کی کوشش کی لیکن تانوں نے کیفیت
پیدا نہیں کی جو بندو چاہتا تھا آخر اس نے جھنجھلا کر بانسری کو
چشمہ کی چمکیلی لہروں میں پھینک دی۔ سوہا یہ سب ماجرا شہتوت
کے درخت کی آڑ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ نہ معلوم کس جذبہ کے زیر اثر
بڑھی اور ساڑھی چڑھا کر پانی میں اتر پڑی۔ اس کی مرمریں
پنڈلیاں پانی کے اندر بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس نے
جھک کر بانسری اٹھالی اور آہستہ آہستہ بندو کی طرف بڑھی
اور بانسری واپس کر دی۔ ساتھ ہی وہ چیز بھی جو بندو کھو چکا
تھا۔ بندو مدہوشی کے عالم میں کھڑا سوہا کو دیکھ رہا تھا۔ سوہا
کو اس کے شباب کی تپش سے تمتمائے ہوئے گلابی رخساروں

کو اس کی سیمیں کلائیوں کو اس کے بلوریں سینہ کے زیر و بم کو ایسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے سارے باغ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہو وہ بمشکل کہہ سکا "کون ہو تم ؟"

"میں سوہا ہوں! پچھیرو کسان کی لڑکی! میں اکیلے کھیلتے کھیلتے تھک گئی تھی اس لئے چشمہ کی روانی کے ساتھ چلی آئی۔ کیوں آپ ایسے کیوں نظر آرہے ہیں۔ لیجئے میں ابھی چلی جاتی ہوں" شوخ سوہا نے سادگی سے کہا۔

"بندو کی آواز گلے میں اٹک گئی! اس کا دل جلنے لگا لیکن جب سوہا جانے لگی تو وہ اپنے آپے میں آیا اور آہستہ ۔۔۔ سوہا کی انگلی پکڑ کر کہا "سندری! مت جاؤ یہ باغ میرا ہی ہے کیوں تمہیں یہ باغ پسند ہے نا۔ آؤ چلو وہاں جامن کے درخت کے نیچے بیٹھیں چلو نا! سوہا! دیکھو ہم تمہیں ایک سُندر گیت سنائیں جو ابھی ابھی ہمارے ہونٹوں تک آکر رک گیا ہے۔ جامن کے سائے تلے سبزہ پر بیٹھ کر بندو نے گانا شروع کیا وہ گیت جس میں اس کا دل اس کی روح سب مخلول تھے۔ سوہا اس گیت میں کھو گئی۔ اُس نے ایسا سُندر گیت اور ایسی مدھر آواز کبھی نہ سُنی تھی۔ گیت ختم ہو گیا۔ لیکن گیت کے اثر سے دونوں کے دماغ بہت دیر تک زائل رہے مینا کی آواز سے جو سوہا چونکی تو خود کو بندو کی آغوش تمنا میں پایا۔ گیت نے دونوں کو بہت قریب کر دیا تھا اس نے جان بوجھ کر اپنی پلکیں پھر گرا دیں اس نے سُنا کوئی کہہ رہا تھا "سوہا میں تم سے پریم کرنے لگا ہوں" اس نے خوش کیفی کے عالم میں بغیر الفاظ کا مطلب سمجھے ہوئے انہی الفاظ کو دہرایا۔ لیکن جب اپنے ہونٹوں پر سانس کی گرمی محسوس کی اور دل کی دھڑکن سنائی دی تو خود بخود "میں تم سے پریم کرنے لگا ہوں" کے معنی سمجھ میں آگئے۔ سوہا کے سینے سے بھی ایک نغمہ اٹھا بہت ہی شیریں اس سے بھی شیریں تر جو ابھی بندو نے گایا تھا۔!!!

سوہا کا ہر فرداب امروز کا مصداق بنگیا لیکن یہ یکرنگی یسی اکتا دینے والی نہ تھی۔ سوہا کے سینہ کے زیر و بم سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی بندو کی موسیقی بھی رشک موسیقی بن گئی ادھر نرنیدر بابو بھی بہت خوش تھے بڑے فخر سے وہ اپنے دوستوں میں کہا کرتے کہ میرے پاس جو تامرادر مغنی ہے۔ شاید ہی کسی کے دربار میں ہو۔ بندو میرا ہے اور اُس کی موسیقی صرف میرے لئے ہے اور جب کسی دعوت میں بندو اپنی بانسری بجاتا یا کوئی گیت گاتا تو ہوا تھم جاتی چشمہ کا پانی ٹھہر جاتا چڑیاں خاموش ہو جاتیں اور لوگ مست ہو کر کپڑے پھاڑنے لگتے۔ وہ ان سب کو بدمستی کے عالم میں چھوڑ کر بندو "سکھ مندر" کی طرف چلدیتا۔ نرنیدر بابو گو ایک عیاش طبع بوڑھے زمیندار تھے لیکن چونکہ تعلیم یافتہ تھے اس لئے عقلمند بھی کافی تھے ایک روز انھوں نے بندو کو بلایا اور پوچھا "کیوں بندو یہ دلکش گیت اور یہ مدھر تانیں جو تم گاتے بجاتے ہو کیا یہ سب میرے باغ کی خوبصورتی دیکھ کر وجود میں آتی ہیں ؟

بندو بولا ہاں مہاراج جب میں آپکے باغ میں جاتا ہوں تو مجھ پر عجب کیفیت طاری ہو جاتی ہے آپ کا باغ کتنا سندر ہے طرح طرح کے پھول اور موسیقار پرند، فوارے غرض وہاں ہر چیز میں موسیقی اور شاعری پنہاں ہے گویا وہاں کی فضا سے گیت رستے اور تانیں ٹپکتی ہیں،! یہ جواب سُنکر نرنیدر بابو کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی لیکن دل میں کچھ کھٹک ضرور باقی رہتی کیونکہ وہ سوچتا تھا کہ اس کا باغ "سکھ مندر" ہزار اچھا سہی۔ لیکن پہلے کچھ دنوں تک تو اسی باغ میں رہ کر بھی بندو ایسے دل سوز گیت نہ بنا سکا تھا پھر یکایک یہ کایا پلٹ کیسے ہو گئی۔ وہ کونسی چیز ہے جو موسیقی کو رتیق بنا کر چشمہ کے ترنم اور فضا کی گہرائیوں میں ملا دیتی ہے جہاں بندو پانی پیتا اور سانس لیتا ہے۔ نرنیدر بابو اپنی ہٹ کے پکے تھے وہ یہ تمام باتیں بہت جلد معلوم کرنے کے لئے بیتاب تھے اور تاک میں رہنے لگے

ایک روز شام کو جب دن رات کی سانولی باہوں میں جانے کے لئے بیتاب تھا۔ نریندر بابو اپنے سکھ مندر کی طرف چلے۔ سکھ مندر کی طرف چلے۔ سکھ مندر پہنچ کر وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوگئے چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں۔ اور عجب شور برپا تھا۔ سکھ مندر پھولوں میں! ہوا بو خوشبو سے بھیگ گئی تھی اور شراب کی طرح مست کر دیتی تھی۔ یکایک نریندر بابو نے بانسری کی دلکش آواز سنی ساتھ ہی کوئی گا بھی رہا تھا۔

"گیندے کی نازک ڈالی نسیم سے ایسی نہیں لچکتی۔
جیسا کہ تو میری باہوں کے گول دائرے میں!
تیرا شکیں تبسم میری پتلیوں میں اس طرح رقص کرتا ہے۔
جیسے کوئی بھونرا کسی کلی کے گرد چکر کاٹ رہا ہو!
تیرے دل کی آواز ایسی معلوم ہوتی ہے
جیسے شام کی خموشی اداسی کا راگ الاپ رہی ہو!
تیرے فردوسی شبنم سے تر لبوں کی شیرینی کے سامنے۔
شہد سے بھری ہوئی گلاب کی پنکھڑیوں کی حقیقت معلوم!

وہ ایک پالتو کتے کی طرح آواز پر بڑھتا چلا گیا۔ یکایک وہ ٹھٹک گیا۔ اس کی ایک تجسسانہ نظر نے سارا معاملہ سمجھا دیا۔ تازہ وارد ماہتاب کی شرمیلی کرنوں میں نریندر بابو نے دیکھا پھول پھول کو چوم رہا تھا۔ کلی کلی کو چوس رہی تھی۔ جیسے جیسے موسیقی اور محبت خواب میں گلے مل رہی ہو۔ بندو کی بانسری سبزہ پر پڑی ہوئی تھی اور اسکی پُر شوق باہوں میں سکھ مندر کی بہترین کلی۔ "سوما!"

نریندر کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ اس نے پھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اس کے ہونٹ کپکپائے۔ تالو خشک ہوگیا۔ سر چکرایا اور وہ دل پکڑے ہوئے واپس چلا آیا۔ اپنے فربہ ہاتھوں سے تالی بجائی اور نوکر کو سوما کے باپ بھیرو کسان کو بلانے کے لئے بھیجا۔ بھیرو آیا اور زمیندار سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا——!

اب اکثر نوجوان بندو سے نریندر بابو کر پوچھتا۔ کیوں بندو اب تم کو کیا ہوگیا۔ میرے باغ کا وہ حسن وہ کیفیت کیا ہوگئی جو تمہاری موسیقانہ امنگ کو ابھارا کرتی تھی۔ اب تمہاری بانسری سے شاما کی شیریں آواز کی بجائے کوے کی مکروہ آواز کیوں نکلتی ہے اب تمہاری بانسری کو کیا ہوگیا کیوں بولو نا!

دل شکستہ بندو میں جواب دینے کی سکت باقی نہ تھی۔ اب اس کے پاس وہ ولولہ نہ تھا وہ جوش نہ تھا۔ وہ جذباتی ہیجان نہ تھا اس کی بانسری واقعی کھوکلی تھی۔ بانسری کیا اس کا سینہ کھوکلا ہوگیا تھا۔ اب وہ اپنے سینے سے وہ گرم سانسیں نہ نکال سکتا تھا۔ وہ کسی غم میں کھو گیا تھا۔ سب کچھ بھول گیا تھا۔ اب اس کی انگلیاں بانسری کے سوراخ پر نہ پڑتی تھیں۔ یہ سب اس لئے تھا کہ سوما تا ہوی دموسیقی کی دیوی اب کئی دن سے باغ میں نہ آتی تھی۔ نہ جانے کیوں؟؟!!؟

دن ڈھلتے گئے! بندو سے ایک روز نریندر بابو نے کہا "بندو بھئی اب تمہاری بانسری وانسری تو بیکار رہوگی تمہارے راگ ہی مجھے سکون بخشتے تھے۔ اب میرا دل گھبراتا ہے اس لئے میں نے شادی کرنے کا بندوبست کر لیا ہے شاید نئی بیوی کا حسن اور دلآویزی مجھے راحت پہنچا سکے۔ تمہاری کیا رائے ہے ٹھیک ہے نا!

ان جگر خراش الفاظ نے بندو کی دنیائے دل میں زلزلہ سا ڈال دیا اس کی آنکھوں سے سفید خون کے دو قطرے ٹپک پڑے۔ وہ کہنے لگا۔ مہاراج میں کیا بتاؤں۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ میں اپنی آواز اور بانسری سے آپ کا دل خوش نہیں کر سکتا۔ معلوم نہیں کیوں کر اب مجھ پر اور میری بانسری پر پڑ گیا۔ آپ نے اچھا کیا جو شادی کا انتظام کر لیا۔ اب ضرور آپ کا دل بہل جائے گا۔ لیکن مہاراج اب مجھے اجازت دیجئے میں جانا چاہتا ہوں۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا وہ عجب

وہ عجب [illegible] پیچ میں تھا کیونکہ وہ اپنی موسیقی کی تباہی کا راز نہ بتا سکتا تھا۔ سوہا اس کے [illegible] کی ہمراہی میں اس کی جیون نیا سے اُتر چکی تھی پھر بھلا وہ کہاں [illegible] پرانی تانیں اور گیت پیدا کر سکتا تھا۔

مشرقی رقابت کے ساتھ نرنیدر بابو نے حکم دیا کہ نہیں بندو ہم تمھیں جانے دیں گے۔ تمھیں ہماری شادی میں شرکت کرنا پڑے گی۔ اس فولادی حکم کے آگے بندو کو سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ آخر شادی کا دن بھی آ پہنچا۔ گاؤں بھر میں عجب دھوم دھام تھی۔ نرنیدر بابو کی کوٹھی ایک خوش گلی سجائی دُلہن بن گئی تھی مگر نرنیدر بابو نے نئی دُلہن کے اُتارنے کے لئے "سکھ مندر" کا ایک کمرہ پسند کیا تھا۔ بڑے باجے گاجے اور ہجوم کے ساتھ بارات آئی۔ زر و جواہر سے گندھی ہوئی سوہا کا حسن فضا میں غمگین نقوش اُبھار رہا تھا۔ بندو بھی بارات کے ساتھ تھا۔ بھیڑ میں آدمی باتیں کر رہے تھے کیوں جی یہ کس کی لڑکی ہے۔ ایک نے پوچھا۔

ارے تمھیں نہیں معلوم یہ پھیرو کسان کی لڑکی سوہا ہے بیچاری کے بھاگ کھل گئے جو زمیندار کے یہاں بیاہ کر جا رہی ہے۔

ارے جوان نہیں تو کیا ہوا مالدار تو ہیں۔" ان دونوں کی گفتگو نے بندو کے کانوں میں جیسے گرم سیسہ پگھلا کر ڈال دیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کا دماغ سُن ہو گیا۔ دل بیٹھ گیا۔ اور بینائی نے جواب دے دیا وہ ایک خارشی کتے کی طرح مجمع سے نکل آیا اور بھاگنا شروع کیا وہ بھاگتا چلا گیا نہ جانے کدھر؟ جب وہ تھما تو خود کو "سکھ مندر" میں بیری کے درخت کے قریب پایا جہاں اس نے "عشق بیک نظر" کے معنی سمجھے تھے۔ جہاں سوہا نے اس کو بانسری واپس کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لہریں لینے لگے۔ اُس نے بانسری نکالی اور آخری دفعہ بجائی اور ذرا سی دیر میں اپنی جان و روح دل و جگر کو آنسوؤں اور بانسری کی تانوں کے سیلاب میں غرق کر دیا۔

اسی رات کو جب نرنیدر بابو اپنی بیوی کے پاس جو گلشن عیش عرف سکھ مندر کے ایک آراستہ کمرے میں اُتاری گئی تھی۔ جانے کی تیاری میں مصروف تھے کہ اتنے میں لوگ دوڑے ہوئے آئے اور گھبرا کر کہنے لگے حضور آپ کا لڑکا۔ پیارا لڑکا چل بسا... آہ!

میرا لڑکا۔ نرنیدر بابو نے حیران ہو کر پوچھا ان کی نظر میں سب لوگ پاگل ہو گئے تھے۔

ہاں حضور آپ کا پُتر! وہی کوری، وہی مغنی وہی آپکا پیارا "بندو" ابھی تک "سکھ مندر" میں چشمے کے قریب پڑا ہوا موت کا کبھی نہ ختم ہونے والا خواب دیکھ رہا ہے۔ بوڑھے نوکر نے کہا۔

نرنیدر بابو سٹ پٹا گئے۔ انھوں نے ترش رو ہو کر کہا خوشی کے سمے یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے میرے کوئی لڑکا ورکا نہیں

نہیں حضور آپ غلطی پر ہیں نوکر بولا۔ آج اٹھارہ برس کی بات ہے جب آپ نے اپنی داشتہ تارا کو گھر سے کسی بات پر خفا ہو کر نکال دیا تھا اس وقت وہ حاملہ تھی اور دو ماہ بعد اس کے بطن سے یہ لڑکا پیدا ہوا۔ ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ سب آپ جانتے ہیں جبھی آپ نے بندو کی اتنی خاطر مدارات کی اور اس کو رہنے کے لئے "سکھ مندر" عطا کیا ہے۔ اس وجہ سے ہم سب خاموش رہے۔

تارا کہاں ہے۔ نرنیدر بابو نے پوچھا۔

حضور وہ تو مر گئی اس کے مرنے کے بعد ہی بندو یہاں آیا تھا۔

میرا بندو نرنیدر بابو نے کہا۔ ان کی آواز میں اسقدر رنج خوشی تمنا اور حسرت بھری تھی کہ سب کی آنکھیں پُر نم ہو گئیں۔

اچھا تم لوگ جاؤ۔ میں سب انتظام کر لوں گا۔

جب سب لوگ چلے گئے تو نرنیدر کرسی پر بیٹھ گیا اور گھنٹوں تنہا بیٹھا رہا آج تارا کی یاد اس کے دل سے نشتروں سے کھیل رہی تھی۔ آخر پھر بہیمت بسی عقل نے اس کی مدد کی اس نے

اپنے دل میں سوچا کا لیشور کی مرضی میں کسی کو کیا چارہ ہے تارا اور بندو چلے گئے تو کیا ہوا ابھی سوہا باقی ہے وہ اٹھا اور سکھ مندر میں جانے کے لئے چلا۔ زرد ماہتاب اور بجھے ستارے ان کے ہمرکاب تھے اب پَو پھٹنا ہی چاہتی تھی۔ اس نے سکھ مندر کا دروازہ کھولا۔ اور اپنے کمرہ عروسی کی طرف قدم بڑھائے۔ صبح کاذب کی بے نور روشنی میں باغ اُداس نظر آرہا تھا چشمہ اب تک بندو کی نوحہ زنی میں مصروف تھا۔ پھولوں میں شگفتگی معدوم ہو چکی تھی ہوا درد کی کسک سے کراہ رہی تھی نریندر نے دل میں سوچا لاؤ بندر کو دیکھتا چلوں۔ پھر اس نے خیال کیا کہ اس کی لاش دیکھ کر طبیعت خراب ہو جائیگی۔ اس لئے وہ سیدھا اپنے عروسی کمرہ کی طرف بڑھا اور دروازہ کھولا۔ پھولوں بھری سیج تنہائی کا افسانہ پڑھ رہی تھی نریندر لڈ گیا اس نے تمام کمرے دیکھ ڈالے لیکن سوہا کا پتہ نہ تھا۔ آخر وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے چشمے کے کنارے جا نکلا۔ .... بیری کے درخت کے نیچے دو معصوم روحیں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ سوہا کی لاش کا سر بندو کی لاش کے سینے پر رکھا ہوا تھا پاس ہی بانسری پڑی ہوئی تھی نریندر نے گویا موت کا راگ سُن لیا۔ اس کا خون منجمد ہو گیا اس نے سوچا دنیا میں کچھ ایسی بھی چیزیں ہیں جنھیں سونا نہیں خرید سکتا۔ بیلے کے درخت سے پھولوں کا ایک گچھا توڑا اور دونوں لاشوں پر الوداعی پھول چھڑک دیئے۔ دُور سے آواز آئی ٭ پریم نگر کی ریت نرالی جو مر جائے امر ہو جائے ٭ اسکے بعد طویل خاموشی ٭

محبّت

از (بنتِ حسین) بیگم فرحت آفریدی (دکن)

ملائک پر بشر کو ہے شرف بارِ محبت سے
مگر انساں بھی ناواقف ہے اسرارِ محبت سے

سمجھ میں آ نہیں سکتی محبت کی ہمہ گیری
یہ پوچھیں آپ ہم سے واقفِ کارِ محبت سے

عزازیلی تنگ ظرفی نے واضح کر دیا ہم پر
کہ اسرارِ دروں کھلتے ہیں اسرارِ محبت سے

قتیلِ خنجرِ تسلیم ہو کر سرخرو ہونا
خدا کو بھی تعلق ہے گنہ گارِ محبت سے

محبت کی حقیقت کو وہی کچھ جان سکتا ہے
کہ جس کا رشتہ وابستہ ہو سرکارِ محبت سے

محبّت کی نزاکت غور کے قابل ہے اے مدنی
بندھا ہے عرش کا دامن بھی اک تارِ محبت سے

ریویو

"ڈی اور سے" کی فرم ۱۸۵۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ خوشبو کی تجارت میں یہ فرم سب سے پرانی ہے۔ ریویرا کے ساحلوں پر "ڈی اور سے" فرم کے اپنے باغات ہیں جن سے اعلیٰ قسم کی خوشبو والے پھول انھیں بآسانی مل سکتے ہیں۔

بیلاڈی جور۔ میلارڈ۔ لی ڈینڈی۔ اور ٹرانی اس فرم کے اعلیٰ ترین سینٹ ہیں۔ یہ سینٹ فرانس، انگلینڈ، اور امریکہ میں تمام اعلیٰ معمول خاندانوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ خصوصاً تمام پیرس اپنی خوشبوؤں کا انتخاب کرتا ہے۔

یہ خوشبوئیں اتنی بھینی اور دلکش ہوتی ہیں کہ ہر ایک کا دل قبضے میں کرلیتی ہیں ان خوشبوؤں کے لئے تمام ہندوستان کے واحد ایجنٹ میسرز سپلکر برادرز ہیں۔ آپ مندرجہ ذیل پتے پر تشریف لاکر خوشبوؤں کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

سپلکر برادرز۔ ونچسٹر ہاؤس۔ بالمقابل نیو ریزرو بنک بلڈنگ فورٹ بمبئی

ماہنامہ تنویر احمد آباد میں

کامریڈ مسٹر جمیل قریشی کلیم بلڈنگ خاص بازار احمد آباد سے مل سکتا ہے۔



آج شب کو

رنجیت فلم کمپنی کا بہترین سوشل شاہکار



ماڈرن فیشن کی دلدادہ ولایت سے آئی ہوئی لڑکی
کی دلچسپ کہانی جس میں سبق آموز نظارے
جس میں بتایا گیا ہے کہ رسم و رواج چھوڑ دینے کا
کیا انجام ہوتا ہے

خاص اداکار
خوبصورت ماہ وصفوی
ترلوک کپور، بیگ
خوش آواز کلیانی، وحیدن
راجکماری۔ اور مشہور کامیڈین
چارلی
وغیرہ

ویسٹ اینڈ ٹاکیز

آرہا ہے

ڈائرکٹر: منی لال ویاس



جس میں
مظہر خان
ای بلیموریا
شارہ دیوی

اور
پشپا دیوی
نے
اسمیں
اداکاری
کمال دکھائے ہیں





سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا!

نرالا ہندوستان

جنرل فلمز کا

بہترین سبق آموز اور
نتیجہ خیز
فلم!

جنرل فلمز لمیٹڈ بمبئی

اداکار
شوبھنا سامرتھ
پریم ادیب، ہنگل
آر۔ واسطی، مرزا مشرف
بیبی اندرا وغیرہ



"باغبان"
کی عظیم الشان کامیابی
انڈسٹریل انڈیا
کے بہترین ہونے
کا ثبوت ہے

فلمی خبریں

پربھات فلم کمپنی کا تازہ ترین شاہکار

میرا لڑکا:- سنٹرل ٹاکیز میں بڑی شان و شوکت سے چل رہا ہے۔ اس فلم کے ڈائرکٹر مسٹر کے نارائن کالے ہیں۔ شانتا بائی ہبلیکر کا کام بہت پسند کیا جا رہا ہے "پربھات" کا نام ہی فلم کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

* * * * * *

رنجیت مووی ٹون:- کا "سکریٹری" بہت کامیاب رہا۔ اب اسی کمپنی کا تازہ ترین درد انگیز فلم "پروفیسر وامن ایم ایس سی" نمائش کے لئے بالکل طیار ہے۔ جو عنقریب ویسٹ اینڈ ٹاکیز میں پیش کیا جائے گا۔

* * * * * *

نیو تھیٹرز کا "اسٹریٹ سنگر" عید کے دن سے منروا ٹاکیز بمبئی میں دکھایا جا رہا ہے۔ شائقین موسیقی اس فلم پر ٹوٹ پڑے ہیں سینما کے باہر ہزاروں کا ہجوم رہتا ہے۔ ٹکٹ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ فلم قابل دید ہے۔ نیو تھیٹرز کے آنے والے فلم حسب ذیل ہیں۔
(۱) "ساتھی" (بنگالی زبان میں) (۲) "آدھیکار" (بنگالی زبان میں) (۳) "دشمن" (ہندی میں) (۴) "بڑی دیدی" (ہندی میں) (۵) "سٹریٹ سنگر" (ہندی میں)

* * * * * *

بمبئی ٹاکیز کی نئی فلم "بھابھی" اپنی نوعیت کی ایک خاص فلم ہوگی "بھابھی" کی کہانی بنگال کے مشہور و معروف مسٹر شرت اندو بنرجی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس پکچر میں دیویکا رانی ...

اشوک کمار نہیں ہوں گے بلکہ نئے چہرے ہونگے۔ رینو کا دیوی اس فلم میں ہیروئن کا کام کرتی ہیں کہ جو سوسائٹی لیڈی ہیں مشہور و معروف ایکٹر مسٹر جیراج ہیرو کا کام کرتے ہیں۔

"میرا" اور "مایا" کو تو آپ نہ بھولے ہوں گے۔ وہ بھی اس فلم میں موجود ہوں گی۔

* * * * * * *

سرسوتی سینے ٹون پونا کا "بیچ سے" بالکل طیار ہے جو عنقریب نمائش کے لئے پیش کیا جائیگا اس فلم کو مسٹر موہڑی نے ڈائرکٹ کیا ہے اور مشہور و معروف اداکار مسٹر موتی نے اس میں ہیرو کا کام کیا ہے۔ مس لدز ہیروئن ہیں۔ کہانی کا پلاٹ نہایت زبردست اور انقلاب آفریں ہے۔

* * * * * * *

ساگر مووی ٹون:- کا فلم "پوسٹ مین" عرف ابھلاشا امپیریل سینما میں بڑی شان و شوکت سے چل رہا ہے یہ فلم اپنی نوعیت کا بالکل اچھوتا فلم ہے اور بڑی قابلیت سے طیار کیا گیا ہے۔ فلم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ساگر کا آنے والا عجیب و غریب سوشل پکچر "سرویس لمیٹڈ" قریب قریب طیار ہے۔ مسٹر لوہار نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ اس کمپنی کی یکے بعد دیگرے پیش ہونے والی فلمیں یہ ہیں۔

(۱) "ایک ہی راستہ" — ڈائرکٹر مسٹر محبوب

(۲) "لیڈیز اونلی" — ڈائرکٹر مسٹر بادامی

یعقوب بھی ایک پکچر ڈائرکٹ کرنے والے ہیں۔ مسٹر نندلال بھی ایک سوشل اسٹوری کو طیار کرنے کی فکر میں ہیں۔ ساگر کی

یو ہتہ لیگ نامی ایک فلم جو تامل زبان میں ہے۔ اس کی نمائش ماہ دسمبر میں مدراس میں کی جائے گی۔

واڈیا موودی ٹون:۔ کا زبردست سفر یلر "جنگل کنگ" عنقریب آنے والا ہے۔ اس کے ڈائرکٹر مسٹر ناریمین گھڑیالی ہیں۔

واڈیا موودی ٹون نے اس فلم کی طیاری میں پانی کی طرح روپیہ بہا دیا ہے۔

منروا موودی ٹون:۔ کا تازہ پکچر "پکار" قریب قریب طیار ہے اس فلم کے ڈائرکٹر و ہیرو مسٹر مودی ہیں۔

اس فلم کی نمائش دسمبر کے آخری ہفتے میں کرشنا سینما میں کی جائے گی۔ اس کے بعد کمپنی کا سوشل پکچر "طلاق" پیش کیا جائے گا۔

اس فلم کو بھی مسٹر مودی نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ مسٹر مودی کی اعلیٰ ڈائرکشن اور بہترین اداکاری کا ثبوت جیلر، اور وسنتی، میٹھا زہر، خان بہادر، فلمیں ہیں۔ جنھیں ہر لحاظ سے پبلک نے پسند کیا ہے۔

۳
تیسرا ہفتہ

ہندوستان کی مایۂ ناز
پربھات
فلم کمپنی کا آنے والا
بہترین
"شاہکار!"

ڈائرکٹر:-
کے۔ نارائن کالے



ملک کی خدمت
کرنا
ہمارا فرض
اولین ہے

نوجوانی
کے
خون کے
جوش کا
تقاضہ!
ملک کو آزاد
کرانا نوجوانوں
کا سب سے پہلا کام ہے

اداکاران
شانتا بائی ہبلیکر۔ ما ما بھٹ
وسنت ٹھنگڈی۔ آٹھاس۔ چھوٹو۔
شانتا۔ موزمدار۔ بوا صاحب۔ وتسلا جوشی
بالک رام وغیرہ





KANAN



SHANTA HUBLIKER



Se her n Prat ha s la est social My Son at
[illegible]

MAYA BANNERJEE



See her in Sagar's latest at Imperial Cinema, Bombay

Only Cover Printed at the Lakshmi Art Printing Works, Sankli Street, Byculla, Bombay, 8